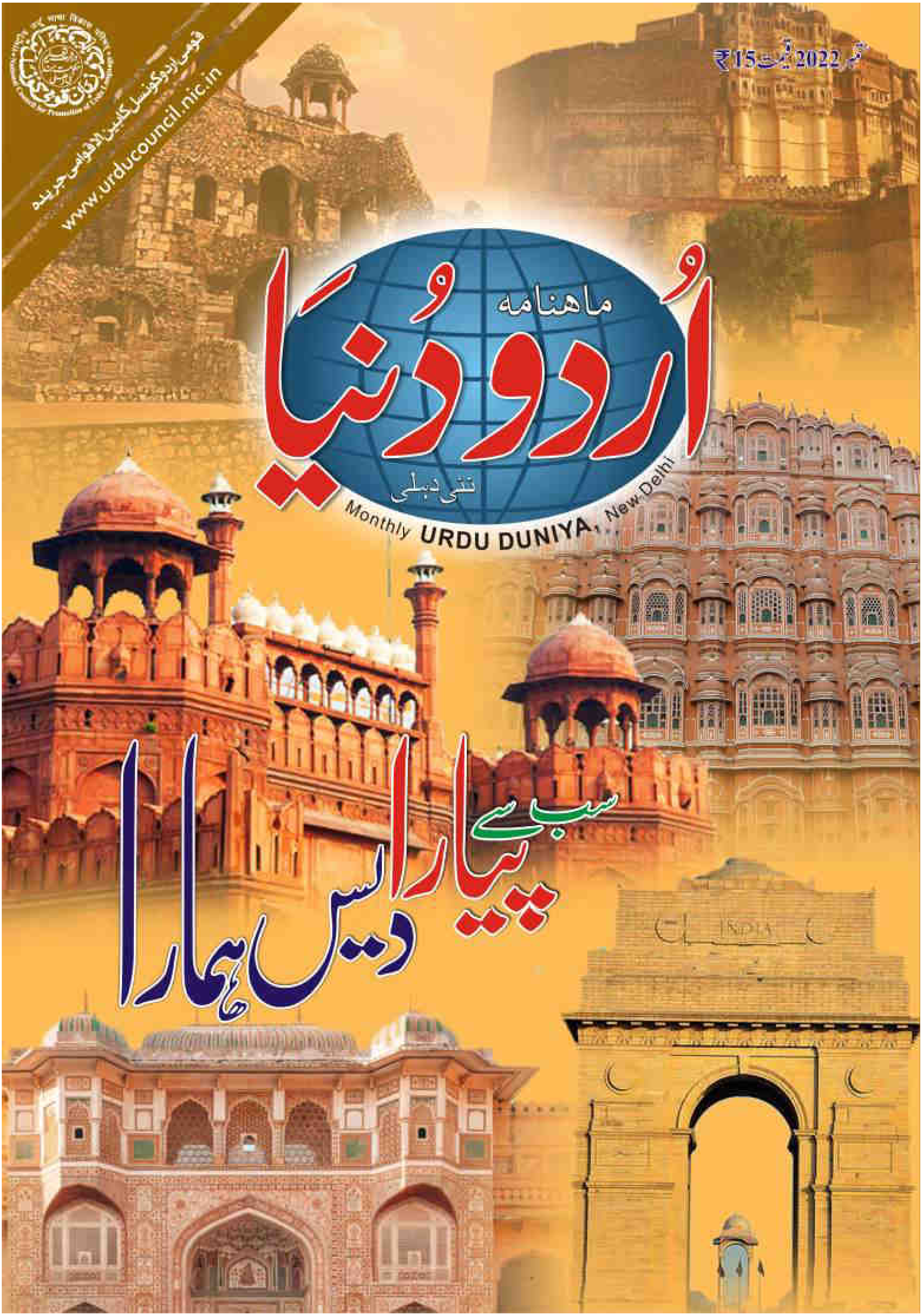

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in
اگست 2022 قیمت ₹15
ماہنامہ
اردو دنیا
نئی دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
سب سے پیارا دیس ہمارا
INDIA

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ **بچوں کی دنیا** دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 A/C: ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 040 - 24415194

ماہنامہ
اردو دنیا
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد: 24، شمارہ: 09، ستمبر 2022

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین : عبدالرشید اعظمی، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زبیر

قیمت -/15 روپے   سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL یا اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000   شعبہ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، چھتہ بازار، ساجدیار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
ربط و انسلاک — قارئین کے خطوط 5

ادب: زاویے اور جہات
قیصر شمیم کی شاعری کی مخصوص لفظیات — مشتاق اعظمی 9
رنگا رنگ کہانیوں کے خالق — اختر کاظمی 11
اختر الایمان کی شاعری کا موضوعاتی مطالعہ — یوسف رامپوری 14

داستان کی اسطوری فضا اور تخلیقی عمل — زاہد ندیم احسن 17
ماہیا، خلاقی اور ترویج — شیخ اسرار احمد 20
اردو میں سائنسی ادب اور عصری تقاضے — محمد افروز عالم 24
نواب یوسف علی خاں ناظم کے شعری کمالات — رضیہ پروین 27
مارکنڈے کی کہانیوں کی تفہیم — شیو پرکاش 29
چکبست کے شخصی مرثیے — اسمٰعیل خان 31
فکر تونسوی کی نظم نگاری — محمد تنویر 33

یادیں باتیں
عربی زبان کے مایہ ناز استاذ پروفیسر محمد راشد ندوی — عبدالماجد قاضی 36

لعل و گہر
ادب کے سفیر: مدن لال منچندہ — سی موہن 40
اقبال مجید کا تخلیقی سرمایہ — جگدمبا دوبے 42

آشفتہ چنگیزی کی غزلیہ شاعری — فرقان احمد سردھنوی 46
ندرت خیال کا شاعر شمیم گورکھپوری — عبدالرحمٰن 49

سلسلہ صحافت
ندوۃ المصنفین اور اس کا مشہور رسالہ 'برہان' — محمد سراج الدین 52
سب رس — ناظم علی 54

زبان و تعلیم
اساتذہ کی تعلیم — احمد حسین 56

دوسری زبانوں سے
آخری دن — احسان عبدالقدوس، مترجم: محمد قطب الدین 59
میزان — ارمیلا شریش، مترجم: خورشید عالم 63

خصوصی گفتگو
اردو میں انگریزی کی آمیزش سے گھبرانے کی ضرورت نہیں: شہباز حسین — خان محمد رضوان 66

فلم
تحریک آزادی اور ہماری فلمیں — انیس امروہوی 69
خواجہ احمد عباس اور عورت کی تصویر کشی — معراج احمد 71

نیا آسماں نئے ستارے
محمد علوی کی شاعری کی مخصوص لفظیات — شفا مریم 74
نیاز فتح پوری کی رومانی افسانہ نگاری — عامر اقبال 77

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ — ادارہ 79

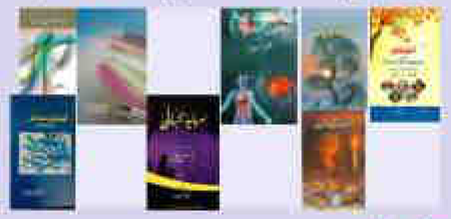

خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 87

ہماری بات

اس بار جشن آزادی کا انداز ذرا مختلف تھا۔'ہر گھر ترنگا مہم' کے تحت بلا تفریق مذہب وملت ہندوستان کے تمام طبقات نے اپنے گھروں، دکانوں اور گاڑیوں پر ترنگے لگائے۔ اسکولوں، مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا/ طالبات، اساتذہ اور عوام نے بہت ہی جوش وخروش کے ساتھ ترنگا یاترا نکالی۔ پورا ملک حب الوطنی کے جذبے سے سرشار تھا کیونکہ ترنگا صرف ایک جھنڈا نہیں بلکہ ہماری قومی عظمت کا ایک نشان بھی ہے۔ ترنگا ہماری آن بان اور شان ہے۔ یہ وہی ترنگا ہے جس میں ملک اور مٹی سے محبت اور عقیدت کے رنگ ہیں۔ ترنگا کی عظمت کو سلام کرتے ہوئے شمیم کرہانی نے اپنی ایک نظم میں لکھا تھا۔

جاں بازوں کے پاک لہو کی یاد دلانے والی/ جنگل کی آنکھوں کی صورت سبز ہے تیری دھاری/ جیسے دھان کی پہلی کونپل سندر کومل پیاری

تو وقار خلیل نے آکاش پر لہراتے ترنگے کو دیکھ کر اپنے جذبہ محبت وعقیدت کا یوں اظہار کیا تھا۔

لہرا رہا ہے دیکھو آکاش پر ترنگا/ امن واماں کا پیکر جھنڈا وہ رنگ برنگا/ اسکول جگمگایا ہر کھیت لہلہایا/ کلیاں بھی مسکرائیں پھولوں نے گیت گایا/ گنگا نے راگ چھیڑا جمنا نے گنگنایا/ اونچا جو ہے ہمالہ وہ بھی تو سر جھکایا/ لہرا رہا ہے دیکھو آکاش پر ترنگا/ امن واماں کا پیکر جھنڈا وہ رنگ برنگا

بچوں کے شاعر شفیع الدین نیر نے بھی اس ترنگے کو یوں سلام کیا تھا۔

سب سے اچھا سب سے نیارا/ رنگ ترنگا پیارا پیارا/ قوم کی امیدوں کا سہارا/ دیس دلارا جگ اُجیارا/ دل کی ٹھنڈک آنکھ کا تارا

پورے ملک میں جشن آزادی کا نظارہ واقعی قابل رشک تھا۔ ہمارے ملک کے وزیر اعظم عزت مآب نریندر مودی نے 'ہر گھر ترنگا' کی جو مہم چلائی وہ ہر اعتبار سے کامیاب رہی۔ آزادی کا امرت مہوتسو کے تحت پورے ملک میں جشن آزادی کی تقریبات منعقد کی گئیں مگر یہ صرف 2022 تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ امرت مہوتسو کا یہ سلسلہ اگلے سال تک جاری رہے گا کیونکہ اس کا مقصد صرف حب الوطنی کے جذبات بیدار کرنا نہیں بلکہ آزادی کی تحریک سے عوام کو روشناس کرانا بھی ہے۔ ملک کے تمام طبقات اور مذاہب سے تعلق رکھنے والے ان مجاہدین آزادی کو تاریخ میں محفوظ رکھنے کی منصوبہ بندی بھی ہے جو کسی وجہ سے تحریک آزادی پر لکھی گئی کتابوں میں شامل ہونے سے رہ گئے۔ آزادی کے امرت مہوتسو کے تحت حکومت ہند نے تمام اصحابِ رائے سے ملک کی فلاح وترقی میں راست کردار ادا کرنے پر بھی زور دیا ہے۔ اس کے علاوہ 75 سال میں ملک کو حاصل ہونے والی کامیابیوں کی تفصیلات سے اپنے ملک اور دنیا کے لوگوں کو باخبر کرنا اور نئی کامرانیوں کی راہیں ہموار کرنا بھی اس میں شامل ہے۔ ملک کی ہمہ گیر ترقی کے لیے کیے جانے والے اقدامات کو نمایاں کرنا اور ملک کی ترقی کے لیے تمام شہریوں کو حصے دار بنانا بھی اس کا ایک قابل ذکر حصہ ہے۔ دراصل آزادی کا امرت مہوتسو منانے کا مقصد یہ ہے کہ عالمی سطح پر ہندوستان کی ثروت مند تہذیبی، ثقافتی روایت کو فروغ دیا جائے اور تمام شعبوں میں ہندوستان کو حاصل ہونے والی ترقیات کو نمایاں کیا جائے۔ اسی وجہ سے اس مہوتسو میں 'وشو گرو بھارت'، 'آتم نربھر بھارت'، 'ہندوستان کا ثروت مند ثقافتی ورثہ'، 'گمنام مجاہدین آزادی'، اور 'آزادی 2.0' جیسے بنیادی تھیم کو شامل کیا گیا ہے، تاکہ ان کے ذریعے ہندوستان کی ہمہ جہت ترقی وحصولیابی کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا جائے۔

وشو گرو بھارت کا تھیم دراصل قدیم ہندوستانی تہذیب کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنایا گیا ہے، جب پوری دنیا پر ہندوستان کی علمی بالادستی قائم تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستانی کلچر نے ہمیشہ عالمی امن، محبت، اور سب کے لیے ہمدردی کی وکالت کی ہے۔ پوری دنیا کے ایک کنبہ ہونے کا نظریہ ایسا ہے، جو ہندوستان کو وشو گرو بننے کے لائق بناتا ہے۔

'آتم نربھر بھارت' کا زور اس پر ہے کہ زراعت اور سائنس وٹیکنالوجی جیسے مختلف شعبوں میں ملک کی کامیابیوں کو اجاگر کیا جائے۔ اسی طرح 'آزادی 2.0' بھی آزادی کا امرت مہوتسو کا ایک اہم تھیم ہے، جو میک ان انڈیا اور ووکل فار لوکل کے ساتھ منسلک ہے۔ اس کے تحت حکومت ملک میں سرمایہ کاری کو فروغ دینے اور قومی معیشت کی ترقی واستحکام کے لیے عالمی معیار کی مصنوعات بنانے پر توجہ مرکوز کر رہی ہے۔ اس سے اپنے ملک کے کاریگروں اور صنعتوں کو عالمی سطح پر مقبولیت حاصل ہوگی اور اس طرح ہندوستانی مصنوعات عالمی بازار میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوں گی۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

ربط والتفات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گذارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنہیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

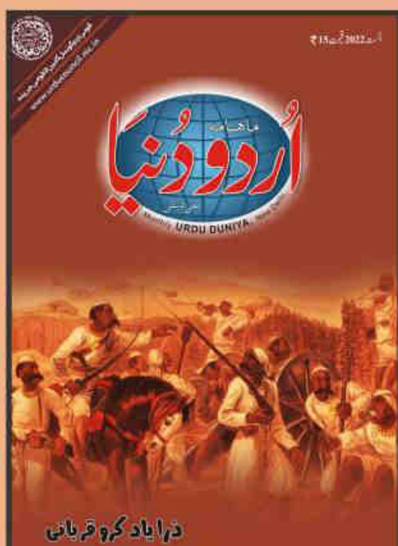

اگست ماہ کا شمارہ محفوظ رکھنے کے لائق ہے، کیونکہ اس میں تحریکِ آزادی سے متعلق مضامین نایاب اور لاجواب ہیں۔

اس شمارے میں بلا تفریق ذات، نسل، مذہب، رنگ وغیرہ کے ضمن میں بے شمار اشعار کا اثاثہ ہے۔

اسدرضا نے اپنے مضمون میں حسرت موہانی کے جنگِ آزادی میں جیل کے صحیح واقعے کا ذکر کیا ہے اور اسی ضمن میں ان کا یہ شعر درج کیا ہے۔

ہے مشقِ سخن جاری، چکّی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی ادارت میں شائع ہفت روزہ اخبار کا نام رکھا تھا۔'الہلال' اور مولانا امیر حسن کے روزنامہ اخبار کا بھی نام یہی تھا۔'الہلال'۔

جناب امیر حمزہ نے اپنے مضمون میں سنہ 1857 کی بغاوت کے ضمن میں اردو اخبارات کے اہم کردار کو ثابت کیا ہے۔ انہی دنوں بہادر شاہ ظفر کے نواسے بیدار بخت کی ادارت میں دہلی سے نکلنے والے اخبار'پیامِ آزادی' کا ذکر رہ گیا ہے۔ جو لوگ بادشاہ پر غدار ہونے کا الزام عائد کرتے تھے، ان کو اس اخبار کے باغیانہ مضامین اور شاعری وغیرہ پر غور و خوض ضرور کرنا چاہیے۔ انگریزی حکومت نے بیدار بخت کو پھانسی دے ڈالی تھی اور اخبار کی تمام تر کاپیاں بھی ضبط کر لی تھیں، تاہم ایک کاپی آج بھی لندن کی مشہور لائبریری میں بطور ریکارڈ محفوظ ہے۔ اسی اخبار میں جھانسی کی رانی لکشمی بائی کے ایک خاص وزیر عظیم اللہ خان کی جو نظم شائع ہوئی تھی، اُس نظم کے مطلع کے اس مصرعے ''ہم ہیں اس کے مالک، یہ ہندوستاں ہمارا' کو علامہ اقبال کے 'ترانۂ ہندی' 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' کا محرک مانا گیا تھا۔

شمارے کی زینت ہندی زبان میں غزل کی صنف کو اردو بحروں کی بنیاد پر مقبولِ عام کرنے والے جناب دُشینت کمار پر مبنی مقالہ خاص اہمیت کا ضامن ہے۔ جناب ایم اے کنول جعفری کے اسی مقالے میں درج ہے کہ ان کے فرزند آلوک تیاگی نے انہیں بتایا تھا کہ ''مہینے کی 27 تاریخ آتے آتے تنخواہ ختم ہو جاتی تھی، اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے یومِ پیدائش پر فراخ دلی سے خرچ نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے کنجوسی کے ساتھ جنم دن منانے کی بجائے اپنی پیدائش کی تاریخ یکم ستمبر کر لی تھی۔'' (ص 65)

ڈاکٹر کرشن بھاؤک: کوٹھی نمبر 201-A، گورونانک نگر، گلی نمبر 18-K، 201-A، پٹیالہ (پنجاب)

اردو دنیا، جون 2022 کے 'ربط والتفات' کالم کو مدیرِ اعلیٰ جناب ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے فیضانِ قلم سے گویا روشن کر دیا۔ واقعی اس خاکداں کی ساری چکاچوندھ، اور زندگی کی ساری بہاریں اسی روزنِ علم کے دم سے ہیں۔ جس طرح کائنات میں روزنِ خورشید کا فیضان جاری و ساری ہے اسی طرح روزنِ علم انسانی شعور کو بیدار اور بصیرت کے دروازے وا کرتا چلا آیا ہے۔ شاید اسی لیے غالب کہتا ہے کہ

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو ۔۔۔ کہ شاید آنکھ تیری کثرتِ نظارہ سے وا ہو

عبدالودود انصاری نے اپنے مضمون 'ہندوستان میں بچوں کا سائنسی ادب' میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ اس عنوان سے متعلق کسی کا اہم نام اور اہم کام چھوٹ نہ جائے۔ کسی شاعر کی ماحولیاتی تحفظ پر ایک کتاب ہو یا ایک سائنسی نظم، موصوف اس شاعر کا تذکرہ کرنے سے نہیں چوکے ہیں۔ مجھے اس بات پر بڑی حیرت ہے کہ ماحولیات پر میری چھ کتابیں ہیں۔ دو کتابیں بعنوان 'ماحول نامہ' اور ہوا اور پانی کے ترانے' تو کونسل نے شائع کی ہیں، دو کتب 'ہم ماحول کے رکھوالے' اور 'ماحول کی خوشبو' کونسل ہی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہیں اور دیگر دو کتب رحمانی پبلی کیشنز، مالیگاؤں نے شائع کی ہیں۔ علاوہ ازیں میری سائنسی نظمیں اور سائنسی کہانیاں ماہنامہ بچوں کی دنیا، امنگ، باغیچہ وغیرہ میں برسوں سے شائع ہوتی رہی ہیں، لیکن صاحبِ مضمون نے ادب اطفال پر وسیع مطالعہ اور گہری نظر رکھنے کے باوجود مجھ خاکسار کا کہیں تذکرہ نہیں کیا ہے۔

متین اچل پوری: مقابل مسجد، اکبری چوک، بیابانی، اچل پور، مہاراشٹر

ﷺ 'اُردو دنیا' جون 2022 موصول ہوا۔ سرورق پر ادب اطفال میں سائنس اور شاعری سے متعلق کوئی آٹھ کتب کے سرورق ایسے دیے گئے ہیں کہ جنھیں دیکھ کر بچے انھیں دیکھنے اور پڑھنے پر مائل ہوجائیں۔ درون مجلّہ مشمولات میں چودہ اصناف سخن کے تیئں موٹے موٹے طور پر کوئی انتیس ذیلی سرخیاں شامل ہیں اور یہ مواد 98 صفحات تک اپنی وسعت رکھتا ہے۔ اداریے میں ادبی جرائد کو ایک دریچہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ ایسے تحقیقات وانکشافات کی سی حیثیت رکھتے ہیں جو قاری کے ادراک کے لیے مہیج کا کام کرتے ہیں۔ دنیا بھر کی زبانوں میں جاری ہونے والے جرائد کے منتخب مواد کا باہم ادل بدل اور اس کے بعد ردّ و بدل سے انسانی اذہان کے افق کی وسعتوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ان وسعتوں میں آج کے موضوعات، ترجیحات اور رجحانات بھی سما گئے ہیں کیونکہ عصر حاضر کی فنیات (ٹکنالوجی) نے ان وسعتوں کو وسیع تر کردیا۔ دور حاضر کے اردو ادبا و قارئین میں معدودے چند کی بجائے اکثریت ایسے ادیبوں اور قارئین کی ہے جن کا کلاسیکی زبانوں سے ربط ضبط قائم نہ رہ سکا، جس کی وجہ سے حالیہ زبان کا لب ولہجہ ہی واجبی سا ہوگیا ہے۔ نیز نثر و نظم کی کئی اصناف سخن کی جانب اب تو کوئی توجہ برقرار نہ رہی۔ اسی لیے وہ معدوم سے ہوتے جارہے ہیں۔ متعدد جرائد کا حال بھی اب عاجلانہ ادب کے مانند ہوگیا ہے۔ کسی جریدے پر اپنے تاثر قلمبند کرنا کوئی منہ کا کھیل نہیں۔ اس کے کسی یا تمام مشمولات کا گہرائی و گیرائی سے مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ مصنف کے منشا اور اپنی سوچ کی معروضیت سے جانچ کے بعد ہی اپنی رائے کا معروضی اظہار کیا جاسکتا ہے یعنی یہ تاثر جریدے کے تمام مصنفین کی کُلی کاوش کے مماثل ہوا۔ اوّلاً تو یہ مبحث کی کیفیت اور بعد میں معرکہ آرائی کا پیش خیمہ ہوا کرتے تھے، مگر اب بیشتر جرائد ان سے گریز کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔

'زبان اور زمینی صورت حال' (ص 7 تا 9) کے ذیل میں ایک اچھا مضمون 'زبان کو زندہ رکھنے کے لیے جدید ٹکنالوجی سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے' دیا گیا ہے اس میں یہ حقیقت بھی مضمر ہے کہ ''زبان کو زندہ رکھنے کے ساتھ ساتھ کنبے کو زندہ رکھنے کے لیے....'' لیکن سبھی جانتے ہیں کہ مزاج تمام تر اب ایسے بدل چکا ہے کہ بس زبان ہی کے متعلق چرب زبانی کی جائے۔ زیرنظر جریدے کے سابقہ شماروں میں ٹکنالوجی سے متعلق ایسے مواد کو ترجیح دی جاتی تھی جس کا روزگار سے ربط استوار ہو۔ بہرحال زیرنظر مضمون کی ہیئت سوالنامہ کے دروبست میں افادیت کا غماز یوں ہے کہ یہ درکار معلومات اور مفید مشورے فراہم کرتا ہے۔ 'ادب: زاویے اور جہات' (ص 10 تا 25) میں چھ مقالے دیے گئے ہیں۔ ان میں تحقیق کے اعتبار سے مقالہ بعنوان '1857 کے چند اُردو ماخذ' قابل قدر ہے۔ اس میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ ہم اس سنگین واقعے کو صحیح نام بھی نہ دے سکے۔ اس تحقیق میں محقق نے درجن بھر سے زائد ماخذوں کا ذکر کیا ہے اور مقالے کے آخر میں معروضیت سے منطقی تنقید بھی کی ہے۔ بہرحال تحقیق وتنقید کا یہ عمدہ میل ہے۔ 'پروفیسر لطف الرحمٰن مشرقی اقدار سے آشنا تنقید نگار' (ص 12) میں مصنف رواروی میں تذبذب کا شکار ہے۔ مقالہ پڑھ کر دیکھیے۔ 'زبان وتعلیم' (ص 26 تا 31) میں دو مقالے ہیں ان میں 'اردو زبان کی صوتی وسعت' (ص 26) قواعد ولسانیات کے اعتبار سے قابل قدر ہے۔ گریجویشن کے طلبہ کے لیے یہ نہایت فائدہ مند ثابت ہوسکتا ہے بلکہ اساتذہ کے لیے بھی اس میں کافی افادیت ہے۔ 'ادب اطفال: سائنس اور شاعری' (ص 32 تا 47) میں پانچ مضامین شامل ہیں۔ پہلے مضمون (ص 32) میں بچوں کی چھوٹی چھوٹی نظمیں بھلی لگتی ہیں لیکن دو سخنے اور کہہ مکرنیاں میں جب امیر خسرؔو کا نام لیا جارہا ہو تو ذرا سی تحقیق نہ سہی ذرا سی جستجو ضروری تھی جیسے دو سخنے میں سموسہ کیوں نہ کھایا، جوتا کیوں نہ پہنا (تلا نہ تھا) یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ سموسے کا ذکر ہو تو 'تلا' صحیح ہے لیکن جوتے میں 'تلّا' (مشدد) ہونا چاہیے۔ اس لیے اسے امیر خسروؔ کی تخلیقات سے خارج ہی سمجھیے۔ اسی تسلسل میں دوسرے مضامین بھی مناسب ہیں۔ 'خصوصی گفتگو' (ص 48، 49) کے تحت سوال وجواب کے چوکھٹے میں ایک واجبی سا انٹرویو سپرد قلم کیا گیا ہے۔ پڑھ لیجیے، پڑھنے میں کیا مضائقہ ہے۔ 'لعل وگہر' (ص 50 تا 57) میں تین مقالے دیے گئے ہیں۔ ان میں معروف مزاح نگار 'یوسف ناظم .....' (ص 53) پر مضمون پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مضمون بعنوان 'افسانہ نگار ناقد اختر اورینوی' میں عنوان کے اعتبار سے محض ان کے افسانوں کا ہی تذکرہ چھایا رہا جبکہ ان کی تحقیق وتنقید پر بھی قلم اٹھایا جاسکتا تھا۔ 'تہذیبی لسانی رشتے' (ص 58 تا 59) کے ذیل میں 'مراٹھی زبان پر اردو کے اثرات' کی ابتدا افسانوی انداز میں ہوئی اور پھر جغرافیہ وتاریخ کی تفصیلات بطور پس منظر دی گئی ہیں پر اخیر میں اردو اثرات سے متعلق سیر حاصل تبصرہ درج ہے جس میں دونوں زبان کی تصویر کھینچ گئی ہے۔ 'خراج عقیدت' (ص 60 تا 62) میں سالک دھامپوری پر تعزیتی نوٹ دیا گیا ہے۔ 'نجوم وجواہر' (ص 63 تا 67) میں 'طارق جمیلی.....' اور 'ضیا احمد بدایونی' کے حالاتِ حیات کو پیش کیا گیا ہے۔ انھیں نجوم وجواہر باور کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ 'نیا آسمان نئے ستارے' (ص 68 تا 73) میں 'انگریزی شاعری کے منظوم اردو تراجم' کے نام سے ایک اچھوتا مضمون دیا گیا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ 1857 کا زمانہ اردو زبان و ادب کے لیے بڑی خوشحالی اور ترقی کا زمانہ تھا۔ غالبًا اسی وجہ سے اور اس کے بعد اردو ادب میں انگریزی کے منظوم تراجم کی روایت نہایت مضبوط ودلچسپ رہی ہے۔ طویل مضمون ہے جس میں انگریزی شاعروں اور نظموں کو ہندوستانی ادیبوں نے کس طور اردو میں منتقل کیا ہے مفصل بیان ہے۔ 'کتابوں کی دنیا' (ص 74 تا 84) میں کوئی بارہ مطبوعات پر تبصرے درج ہیں تاکہ آپ کو اپنی پسند کے عنوانات منتخب کرنے میں سہولت رہے۔ 'خبرنامہ' (ص 85 تا 98) میں اردو کی پُرمسرت اور پُرملال خبروں سے آپ کو واقف کرایا گیا ہے۔ تمام تر رسالہ پڑھیے اور سر دُھنیے۔

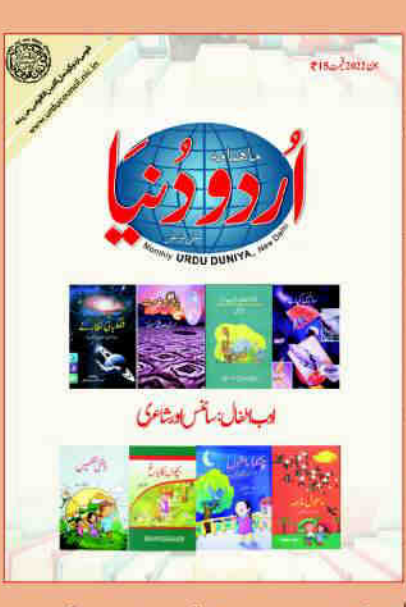

✍ **مصطفیٰ ندیم خاں غوری**: بی 11، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

ﷺ سہرسہ صوبہ بہار کے 38 اضلاع میں ایک معروف ضلع ہے، اسی ضلع سہرسہ کا ایک قصبہ اور سب ڈویژن سمری بختیار پور ہے، جس میں تین بلاک ہیں اور مجموعی طور پر یہ علاقہ 42 پنچایتوں پر مشتمل ضلع سہرسہ کا سب سے بڑا رقبہ ہے، ایک زمانے میں سمری بختیار پور کا یہ علاقہ بجائے سہرسہ کے ضلع مونگیر کا حصہ ہوا کرتا تھا۔ سمری بختیار پور اور اس کے نواح میں مختلف قومیں اور ذاتیں آباد ہیں۔ علاقے میں آباد خاندان سادات میں متعدد نابغۂ روزگار ہستیاں پیدا ہوئیں، جن کے علم وفضل سے پورا ملک واقف ہے

اورتصوف وسلوک کے باب میں بھی جن کی شخصیات مسلم ہیں ،جیسے مولانا سید شاہ غنیمت حسین صاحب قاسمی جوعربی زبان وادب کے بڑے ماہر تھے۔ان کے علاوہ مرشد زمانہ حضرت سید شاہ ابو القاسم اشرف صاحب اور مولانا سید ابولہاشم اشرف صاحب قاسمی وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں اورابھی بھی اس خانوادے کا فیض جاری ہے اور حضرت پروفیسر سید قسیم اشرف صاحب سے پورا علاقہ مستفید ہورہا ہے۔

سمری بختیار پوراوراس کے اطراف وجوانب میں مسلمانوں کی جواچھی خاصی تعداد آباد ہے، ان آبادی میں اکثریت ان مسلمانوں کی ہے جو'جونپوری' کہلاتے ہیں، وہ اس وجہ سے کہ آج سے بہت زمانے پہلے جونپور کے'صدیقی شیوخ' برادری کا ایک خاندان یہاں آکرآباد ہوا تھا، پھراللہ نے اس خاندان میں بڑی برکت دی اورخوب پھلا پھولا، جوسمری بختیار پوراوراس کے اطراف وجوانب کی مختلف بستیوں میں آباد ہے اور اس کے علاوہ بھاگلپور، کھگڑیا اورمونگیر کے بعض حصوں میں بھی جونپوری شیوخ خاندان کی ایک بڑی تعداد قیام پذیر ہے۔

اس خاندان کواللہ نے بہت ساری خصوصیات سے نوازا ہے، یہ خاندان مشائخ، علما، مصنفین، مصلحین اور روحانی طبیبوں کا خاندان ہے،منفرد طرز زندگی کے علاوہ اللہ نے ظاہری اور باطنی دونوں طرح کے حسن و جمال سے بھی اس خاندان کو مالا مال کیا ہے، الگ تہذیب، الگ تمدن اورایک منفرد رکھ رکھاؤ اس خاندان کا خاصہ ہے، کھان پان، پہناوا اوڑھاوا اور بود و باش میں بڑی نفاست ہے اور سب سے اہم یہ کہ تصوف و سلوک اور علم وفضل تو اس خاندان کو ورثے میں ملا ہے یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ سے اس خاندان میں بلند پایے کے علما، فضلا،صوفی اور اصحاب قرطاس وقلم موجود رہے ہیں اوراب بھی ہیں؛ چونکہ جونپور کا ماضی بڑا ہی علمی، ادبی اورروحانی رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی اس خاندان کامزاج خالص علمی ہے، چونکہ تعلیم وتعلم سے کافی گہرا اور قدیم رشتہ ہے، اکثر افراد کا شغل پڑھنا اور پڑھانا ہی ہے، چنانچہ ملک کی بیشتر دینی وعصری دانش گاہوں، جامعات اور یونیورسٹیز میں اس خاندان کے افراد تدریسی خدمات کی انجام دہی کے علاوہ دیگر شعبوں میں بھی کلیدی کردار ادا کررہے ہیں۔

ہمارا یہ خاندان مسلک ومشرب کے اعتبار سے دوحصوں میں منقسم ہوگیا ہے، دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے جہاں کافی بڑی تعداد میں ہیں تو وہیں بریلوی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے؛لیکن جوسب سے اہم بات ہے وہ یہ ہے کہ دونوں جانب میں سے کسی جانب بھی مسلکی تشدد پسندی کبھی نہیں رہی ہے اورآج بھی جانبین مسلکی تشدد سے بالکل پاک ہیں، آپس میں شیر وشکر ہوکر رہتے ہیں، ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں برابر شریک رہتے ہیں اور مل جل کر زندگی بسر کرتے ہیں، آپسی بھائی چارگی اتنی مضبوط ہے کہ مسلکی تفاوت کے باوجود آپس میں رشتے داریاں بھی ہوتی ہیں، دونوں مکتب فکر کی مسجدیں بھی ہیں اور مدرسے بھی؛لیکن ان مسجدوں اور مدرسوں میں بھی کسی طرح کا مسلکی اختلاف نظر نہیں آتا ہے، نہ ہی کسی طرح کا کوئی تنازع اور جھگڑا ہوتا ہے، شادی بیاہ کی تقریب وغیرہ میں بھی سب مل جل کر شریک ہوتے ہیں۔

اس خاندان میں پڑھے لکھے سنجیدہ افراد ہمیشہ سے موجود رہے، جنھیں تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی ،جیسے مولانا ومفتی حبیر الدین صاحب قاسمی، مولانا محمد نسیم صاحب قاسمی مبارکپوری، مجاہد آزادی مولانا عبد الوحید صاحب رحمانی، مولانا منظور الحسن مکھیا صاحب ندوی، مولانا محمد یونس صاحب قاسمی ندوی، نامور مفتی حضرت مولانا ومفتی حسیب الدین صاحب قادری مصباحی، مدرسہ انوار العلوم قادریہ سربیلہ کے عالی مرتبت

پرنسپل مولانا عبدالرشید صاحب قادری، فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم کے استاذ خاص مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمانی ، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن مولانا عبدالمتین صاحب نعمانی، جمعیۃ علمائے ہند ضلع سہرسہ کے صدر مولانا عبد الاحد صاحب قاسمی، دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کے مؤقر استاذ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ندوی، مولانا عبد القادر صاحب رحمانی، جناب ماسٹر مرحوم عبد المتین صاحب حمید پور، جناب ڈاکٹر مرحوم جنید احمد صاحب ہریوا، وغیرہ، اللہ ان سبھوں کی مغفرت فرمائے اور فردوس بریں میں جگہ عنایت کرے، آمین!

اسی طرح موجودہ وقت میں علمی وروحانی پیشوا حضرت مولانا محمد اشتیاق احمد صاحب قاسمی، مولانا ومفتی عبدالقدوس صاحب ہتھمنڈل، مولانا اقبال احمد صاحب قاسمی، روحانی شخصیت پروفیسر سید قسیم اشرف صاحب، مولانا مظاہر الحق صاحب قاسمی، مولانا و مفتی محمد نوشاد نوری صاحب قاسمی، مولانا نثار احمد حصیر القاسمی، مولانا انظر علی صاحب مفتاحی، مولانا ومفتی سعید الرحمٰن صاحب قاسمی، مولانا داؤد حسین صاحب اشرفی مصباحی، مولانا عبد المصور صاحب مصباحی، مولانا قمر عارف صاحب ازہری، ماہر فلکیات حافظ کوثر امام صاحب، مولانا محبوب الرحمٰن صاحب قاسمی، مولانا ومفتی محمد شاہد صاحب قاسمی بھٹونی، مفتی محمد نعمان صاحب قاسمی پورینی، مفتی محمد نصر اللہ صاحب قاسمی پھنسایا، پروفیسر ابوالفضل صاحب حمید پور، ڈاکٹر موصوف احمد اشرفی صاحب گھوڑ دوڑ، پروفیسر ممتاز احمد صاحب بھٹونی، پروفیسر واسم صاحب پھنسایا، ڈاکٹر عبد السلام صاحب ہتھمنڈل، پروفیسر عبد الباسط حمیدی صاحب سمتی پور، وغیرہ۔

ماہنامہ اردو دنیا مئی 2022 کے شمارے میں محمد خوشتر صاحب کا مضمون بعنوان 'سمری بختیار پور کا علمی وادبی منظر نامہ' پڑھنے کو ملا، پڑھ کر بہت حیران ہوا، حیرانی کی وجہ یہ تھی کہ موصوف نے جس علاقہ'سمری بختیار پور کو محدود کرکے پیش کیا ہے اوراپنے مضمون میں واضح طور پر تنگ نظری اور علاقہ سمری بختیار پور سے اپنی ناواقفیت کا ثبوت دیا ہے۔

قارئین کرام! اطلاعاً عرض ہے کہ سمری بختیار پور کا ہمارا یہ علاقہ تاریخ کے ہر دور میں علم وفن کی ترقی کا جلی عنوان رہا ہے، ہرمیدان کے ماہرین یہاں پیدا ہوتے رہے ہیں اورامت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں، لہٰذا یہاں کا علمی وادبی منظر نامہ جو پیش کیا گیا ہے وہ نہایت ہی ادھورا ہے۔

سمری بختیار پور اتنا محدود نہیں ہے جتنا انھوں نے پیش کیا ہے، یہاں کے علماء کرام ودانشوران عظام نے ملک وقوم کی ترقی کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، دینی، علمی، ادبی، سیاسی، سماجی اور روحانی ہر میدان میں گہرے نقوش چھوڑے ہیں، تاریخ ان چیزوں کی گواہ ہے، جس کا تحفظ ہم سب کی ذمے داری ہے۔

☜ **مفتی سیف الرحمن ندوی**: استاذ جامعہ رحمانی، مونگیر، بہار

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم 'زبان اور زمینی صورت حال' کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کردی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کررہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کررہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

قیصر شمیم کی شاعری کی مخصوص لفظیات

مشتاق اعظمی

بنگال کی دنیائے شعروادب میں قیصر شمیم کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ قیصر شمیم کا شمار بنگال کی ان اعلیٰ ہستیوں میں ہوتا ہے، جن کی بے لوث کوششوں نے اردو زبان وادب کو اس خطے میں ایک بلند مقام عطا کیا۔ انھیں نہ صرف شاعری میں بلکہ نثری ادب میں بھی ید طولیٰ حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے فنی محاسن اور شعری تجربات کے ذریعے بنگال کی اردو شاعری کو ایک نئی راہ پر گامزن کیا۔ انھوں نے انسانی جذبات، احساسات اور کیفیات کی ترجمانی بہت ہی سہج طریقے سے کی ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کے شب و روز اپنے تمام رنگوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔

قیصر شمیم کی شاعری اُن کی شخصیت اور مزاج کے ساتھ پوری مناسبت رکھتی ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر فنکار خود دار اور صالح اقدار کا پاس دار ہو تو اسے دشوار گزار مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔ اس کا جذبہ خودداری ہمیشہ دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے میں مانع ہوتا ہے۔ وہ نہ تو اپنی انا کا سودا کرتا ہے اور نہ ہی اسے مجروح ہونے دیتا ہے۔ نتیجتاً اسے ہر قدم پر حسرت و یاس کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر وہ اس وطیرۂ خاص سے دست بردار نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اس کا ضمیر ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ قیصر شمیم کی شاعری میں یہ تاثرات جا بہ جا ملتے ہیں۔ ذیل کے اشعار ان کی خوددارانہ طبیعت کا انعکاس ہیں ۔

چلوں زمانے کے ہمراہ کس طرح قیصر
ہمیشہ رہتا ہے میرا ضمیر میرے ساتھ
چھینٹے مرے دامن پہ خوشامد کے نہ آئے
رکھا مجھے بے داغ مری بے طلبی نے
بیزار ہوں میں اپنے دل زار سے قیصر
برباد کیا ہے مجھے کمبخت اسی نے

قیصر شمیم ایک صاحبِ طرز شاعر ہیں۔ بہت سنبھل کر شعر کہتے ہیں۔ اسپ تخیل کو بے لگام نہیں چھوڑتے۔ معقولیت و معنویت ان کے کلام کے اصل جوہر ہیں۔ انھوں نے غزلوں کی تہذیبی اقدار کو جمالیاتی و ایمائی انداز میں نکھار اور سنوار کر پیش کیا ہے۔ ان کا متوازن لب و لہجہ دراصل ان کی مثبت سوچ کا ہی نتیجہ ہے، ورنہ وہ آلام و مصائب اور روح فرسا واقعات سے مسلسل گزرے ہیں۔ بعید نہیں تھا کہ بعض شاعروں کی طرح ان کا تخلیقی مزاج مردم بیزار بن جاتا۔ ان کے ذہنی رویے کا اثر ہی ہے کہ ان کے کلام میں صرف حزنیہ لے اور طبعی غمزدگی ہی نہیں مسرت و بصیرت کی آمیزش بھی ہے۔

ہمیں ملا تھا جو اک ڈھیر خشک پتوں کا
وہی تھا تکیہ ہمارا، وہی بچھونا تھا
زندگی نے آزمانے کے لیے
آگ میں ہر بار ڈالا ہے مجھے
ناؤ ٹوٹی ہے تو تختہ لے لے
راہ میں پھر کوئی دریا ہوگا
دوب ہو جیسی بھی، پامال ہوا کرتی ہے
نرم رکھو گے طبیعت تو سزا پاؤگے
کیا ان دنوں سورج کا کنبہ بھی ہراساں ہے
کیوں دل کی طرح آخر سیارے لرزتے ہیں
غسل دے پھر ہماری دنیا کو
نوح کے عہد کا سمندر لا

قیصر شمیم ایسے شعرا کی صف سے تعلق رکھتے ہیں جن کے علم و آگہی کا دائرہ معتبر اور مبسوط ہے، جو ایک طرف ان کی تخئیلی اڑانوں پر قابو رکھتا ہے تو دوسری طرف انھیں موضوع اور تخلیقی اظہار کے نت نئے تجربے کرنے پر اکساتا ہے۔ یہ محض روایت سے گہرے شغف کی بنا پر پیدا نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے لیے غیر معمولی استعداد اور فنی دسترس کا ہونا بھی ضروری ہے اور یہ چیزیں قیصر شمیم کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ سطح عام سے اٹھ کر شعر کہنا اور اپنے کلام میں امتیازی شان پیدا کرنا آسان کام نہیں۔ قیصر شمیم نے موضوعات کی پیش کش میں انوکھا انداز بیان اختیار کیا ہے۔ انھوں نے سیاسی و سماجی جبر و تشدد، فرقہ وارانہ فسادات، طبقاتی امتیازات وغیرہ کو اپنے کلام کا موضوع بنایا ہے۔ جرأت، بے باکی، راست گوئی نے قیصر شمیم کو معاصرین میں ایک امتیازی مقام بخشا ہے۔

میرے عہد کے انسانوں کا پڑھ لینا کوئی کھیل نہیں
اوپر سے ہے میل محبت، اندر سے ہے کھینچاؤ بہت
ابھی تو کاٹ رہی ہے ہر ایک سانس کی دھار
اجل جب آئے تو دیکھوں کہ انتہا کیا ہے

مذکورہ اشعار میں جو لطیف اشاراتی فضا اور استعاراتی اظہار سے وہ شاعر کی فکری جہتوں کو اجاگر کرنے میں معاون ہے۔

ایک بڑے فنکار کے لیے دنیا میں کوئی بھی شے حقیر یا معمولی نہیں ہوتی۔ ہر شے بذاتِ خود معمولی ہو یا غیر معمولی اپنے اندر ایک جہاں معنی آباد رکھتی ہے۔ یہ تو فنکار پر منحصر ہے کہ وہ اپنے دستِ معجزہ طراز کے لمس سے معمولی شے کو غیر معمولی بنا کر پیش کردے۔ یہ کام محض حقیقت بیں نگاہ ہی کرسکتی ہے۔ وہ شے میں پوشیدہ جہانِ معنی کا ادراک کرتی ہے۔ نیست کو ہست میں بدل دیتی ہے۔ قطرے کو دریا اور ذرے کو آفتاب بنا دیتی ہے۔

قیصر شمیم کی غزل کے چند اشعار دیکھیے جن میں انھوں نے 'پتھر' کو اپنی تخلیقی قوت کے سہارے نئے معنیاتی

اوراستعاراتی نظام سے ہمکنار کیا ہے۔

نہ جانے کتنے یگوں سے ہے پتھروں میں قید
وہ ایک شخص جو شکلاً مجھی سے ملتا ہے
کیا کروں احساس کے ہاتھوں بہت مجبور ہوں
میں بھی چپ ہوجاؤں گا تو پتھر بنا تو دے مجھے
آئینہ لے کے میں تو نکلا ہوں
ہاتھ میں اپنے تو بھی پتھر لا
تیرے بڑھتے ہوئے قدموں کو دعائیں دے دوں
میں تری راہ کا پتھر ہوں تو ٹھوکر ہی لگا
جلتے ہوئے دل کی آہیں بھی ٹکرا کے رہ جاتی ہیں
پتھر تو پتھر ہے آخر جلتا ہے نہ پگھلتا ہے
تمام عمر رہے زد میں پتھروں کی مگر
تمہاری کوئے ملامت سے دور جا نہ سکے

قیصر شمیم ستم ہائے روزگار کے اسیر رہے ہیں۔ وہ اس بات کے معترف بھی ہیں۔ ایک جگہ وہ خود رقم طراز ہیں کہ ''میں نے اپنی زندگی میں مسرت انگیز لہریں بہت کم دیکھی ہیں''۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں قلندرانہ شان پیدا ہوگئی ہے۔ ان کی خودداری کا عالم یہ ہے کہ وہ بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوتے بلکہ اس کے سامنے اپنے خیالات کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں فقر واستغنا کی جو خصوصیت ہے اس کے زیر اثر قیصر شمیم کے یہاں بقول علیم اللہ حالی 'میر کی ہم سفری کا شائبہ' ہوتا ہے' اور ڈاکٹر ارتضیٰ کریم کے مطابق:

''کہیں کہیں اس میں اضطراب کی کیفیت شامل ہوتی ہے تو وہ دور جدید کے میر تقی میر نظر آتے ہیں۔''

قیصر شمیم کہتے ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ ان کا مزاج کیا ہے، مگر
کبھی کبھی نظر آتے ہیں میر، میرے ساتھ

قیصر شمیم کا ایک امتیازی وصف اظہار کی سادگی ہے۔ غزل کے بہترین اشعار کی خوبی اظہار و بیان کی سادگی اور بے ساختگی ہے۔ سہل کہنا بہت آسان ہے مگر اس میں تخلیقی شان پیدا کرنا انتہائی مشکل امر ہے۔ میر کی زبان، میر کی سادگی، میر کے تیور، میر کی کاٹ اور سرعت آگیں نشتریت سے بہتوں کی طرح قیصر شمیم بھی متاثر ہوئے ہیں اور بہتوں کو میر کی سادگی نے فریب میں بھی ڈال دیا ہے۔ قیصر شمیم کو میر سے طبعی مناسبت ہے۔ میر کی غزلیں ان کے درد جگر کا مداوا کرتی ہیں۔ کہتے ہیں۔

بڑھتا ہے جب درد جگر
میر کی غزلیں پڑھتا ہوں

وہ اس ڈگر پر چل کر میر تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں اس لیے انھیں میر کے ساتھ ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ ان کے اس عمل میں خلوص وصداقت ہے، تصنع اور بناوٹ نہیں اور یہ بڑی بات ہے۔

جیسا بھی ہے اس میں نقلی پن تو نہیں
یہ میرا چہرہ ہے بابا تیرا کیا

اس کے ساتھ ہی ذیل کے اشعار بھی دیکھتے جائیے جو میری مذکورہ باتوں کے اثبات کے لیے کافی ہیں۔

رہے گی دھوپ مرے سر پہ آخری دن تک
جواں ہے پیڑ مگر اس کا آسرا کیا ہے
چھوٹا سا گھر اور بڑی سی تنہائی
یہ میری دنیا ہے بابا تیرا کیا
میں نے کوشش تو کی بہت لیکن
دل سے اٹھتا ہوا دھواں نہ رکا
تیرے وحشی کو جنونِ دشت پیمائی نہیں
یوں تو ہے دیوانہ لیکن اب وہ صحرائی نہیں

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ آج غزل کا دامن انتہائی وسیع ہے۔ اس میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔ حسن و عشق، احساس ذات اور تصور ذات سے لے کر انتشار ذات تک بے شمار مراحل ہیں جن سے ایک کامیاب شاعر کو گزرنا پڑتا ہے۔ یہاں ہمارا مقصود قیصر شمیم کی غزلوں کو میر کی کسوٹی پر پرکھنا نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ قیصر شمیم میر سے ایسا گہرا روحانی رشتہ قائم کر چکے ہیں کہ اس کے اثرات ان کی شاعری میں بہت نمایاں ہیں مگر یہ غزلیں آج کی ہیں تو اس تناظر میں یہ ضروری ہے کہ یہ عصری جہت کی حامل ہوں اور اپنی پائندگی کے لیے اپنے اصول و ضوابط خود مرتب کرتی ہوں۔ اس کسوٹی پر قیصر شمیم کی غزلیں پوری اترتی ہیں۔ ذیل کے اشعار دیکھیے جن سے ان کے شیوۂ گفتار کا اندازہ لگانا آسان ہوجاتا ہے۔

قیصر شمیم کی شاعری زندگی سے براہ راست مکالمہ ھے۔ یہ نئے عھد کا بیانیہ ھے اور پورے و ثوق کے ساتھ یہ بات کھی جاسکتی ھے کہ قیصر شمیم کی شاعری میں تخیل کی بلند پروازی، فکر کی جامعیت، زبان کی سحر طرازی، ترکیبوں کی چستی، محاوروں کی بندش، الفاظ کی سادگی، تشبیہ و استعارے کا برمحل استعمال، یوں کھیے سھل ممتنع کی شاعری کی بھترین مثال ھے۔ یھی وہ خصوصیات ھیں جن میں قیصر شمیم کی شاعرانہ عظمت کا راز مضمر ھے اور وہ اپنے کلام میں استادانہ رنگ اور تخلیقی مزاج کی بدولت ھمیشہ افق شاعری پر تابندہ و درخشاں رھیں گے۔

پشت پر تھا وار کس کا یہ بتاؤں کس طرح
دوست ہی پیچھے تھے میرے اور تو کوئی نہ تھا
میرے پاس نہ بیٹھ تو اپنا رستہ لے
دل تو مرا ٹوٹا ہے بابا تیرا کیا
تو سہی شمع، مگر دسترس غیر میں ہے
تجھ سے پرنور شب غم زدگاں کیوں کر ہو

قیصر شمیم نے اپنی شعری کہکشاں گردوپیش میں نظر آنے والی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو چن کر سجائی ہے۔ اس عمل میں انہوں نے رسمی و روایتی زبان کو خیر باد کہا ہے۔ عام فہم زبان اور سیدھے سادے انداز بیان کو اپنا وسیلہ اظہار بنایا ہے اور ایسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے جسے ہم شاعری کے لیے لائق اعتنا نہیں سمجھتے ہیں۔ یہ کمال صرف قیصر شمیم کو حاصل ہے کہ انہوں نے اس طرح کے الفاظ کو اشعار میں اس طرح سمو دیا ہے جیسے کوئی جوہری نہایت خوبصورتی اور کمال کے ساتھ زیور پر نگینے جڑ دیتا ہے۔

شہر میں پایا گیا یخ بستہ ہاتھوں کا تپاک
گرم جوشی گاؤں کی چوپال میں پائی گئی
نظر ہر سمت رکھنا تیرنے میں
نئے موسم کے جل کمبھی سے بچنا
ہونے لگے ہیں رستے رستے آپس میں ٹکراؤ بہت
ایک ساتھ کے چلنے والوں میں بھی ہے الگاؤ بہت
شکستہ خواب کے ملبے میں ڈھونڈتا کیا ہے
کھنڈر کھنڈر ہے، یہاں دھول کے سوا کیا ہے
وہ جلائے گا چوکھٹ پر چراغ
روشنی گھر میں نہ آنے دے گا
آنکھوں میں کسی کی بھی اب نیند نہیں آتی
یہ کون سی لوری ہے، گہوارے لرزتے ہیں

دراصل قیصر شمیم کی شاعری زندگی سے براہِ راست مکالمہ ہے۔ یہ نئے عہد کا بیانیہ ہے اور پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ قیصر شمیم کی شاعری میں تخیل کی بلند پروازی، فکر کی جامعیت، زبان کی سحر طرازی، ترکیبوں کی چستی، محاوروں کی بندش، الفاظ کی سادگی، تشبیہ واستعارے کا برمحل استعمال، یوں کہیے سہل ممتنع کی شاعری کی بہترین مثال ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جن میں قیصر شمیم کی شاعرانہ عظمت کا راز مضمر ہے اور وہ اپنے کلام میں استادانہ رنگ اور تخلیقی مزاج کی بدولت ہمیشہ افق شاعری پر تابندہ و درخشاں رہیں گے۔

■

Dr. Mushtaque Azmi
Former Reader & Head :
Deptt. of Urdu T.D.B. College, Raniganj
Resi. : Azmi Mansion, 25 G.C. Mitra Road,
Kishori Gali, Asansol-713301 (W.B.)
Mobile: 9002140625

اختر کاظمی

رنگارنگ کہانیوں کے خالق: شبیر احمد

عالم انسانیت کے وجود میں آنے کے بعد جب لوگوں نے کھانے کا مسئلہ حل کر لیا تو زندگی کے دوسرے مسائل نے تیزی سے سر ابھارنا شروع کیا اور بنی نوع انسان نے اپنے اپنے طور پر اپنے مسائل کی کہانیاں بیان کرنی شروع کر دیں۔ ابتدائی عہد میں چونکہ وقت کی قلت نہیں تھی اس لیے لوگوں کے درمیان داستان گوئی نے اپنی جگہ بنالی اور یہ سلسلہ برسوں چلتا رہا لیکن جیسے جیسے لوگوں کے مسائل بڑھتے گئے وقت کی قلت کا احساس شدت سے ہونے لگا اور اسی قلت کے پیش نظر داستان کی مختصر صورت کو ناول کے طور پر لکھنے پڑھنے کا آغاز کر دیا جو داستان سے قدرے مختلف تھا لیکن عام کہانیوں اور افسانہ گوئی سے بڑا فن اظہار بنا اور اس فن نے برسوں تک اپنے وجود کا دبدبہ قائم رکھا اس درمیان بطور خاص اردو میں ناول نویسوں نے سیکڑوں ناول لکھے کسی نے ضخیم تو کسی نے مختصر ناول تحریر کیا یہاں تک کہ یہ سلسلہ ناولٹ تک آ پہنچا جواب بھی جاری ہے اسی کے ساتھ افسانہ نویسی اور کہانی نویسی کے فن نے عروج پایا اور عالمی ادب میں اپنی انفرادیت کا سکہ قائم کیا۔ طویل افسانے اور کہانیوں کا سلسلہ جب وقت طلب ثابت ہونے لگا تو قارئین کی پسند اور ضرورت کے پیش نظر مختصر افسانے اور مختصر کہانیاں لکھتے لکھتے صرف مختصر افسانے اور مختصر کہانیاں ہی نہیں لکھی بلکہ منی افسانے اور منی کہانیاں لکھنے پر آمادہ ہو گئے اور اسے افسانچے کا نام دیا گیا۔

یہ حقیقت ہے کہ کہانی لکھنے پڑھنے اور سننے سنانے کا فن برسوں پر محیط ہے۔ 1960 کی دہائی سے کہانی لکھنے کی ایک نئی روایت نے جنم لیا جسے جدیدیت کا نام دیا گیا۔ یہ سلسلہ 1980 کی دہائی تک قائم رہا۔ اس درمیان جدیدیت اور ترقی پسند ادیبوں کے مابین کسی نہ کسی سطح پر اعتراضات واختلافات کا سلسلہ جاری رہا اور قاری ان دونوں کے درمیان سینڈوچ بنتا رہا۔ اور اب جس دور میں ہم لوگ جی رہے ہیں، اسے ایک اور نیا نام مابعد جدیدیت دے دیا گیا ہے اور کتابت وطباعت کی جملہ سہولیات کے ساتھ آج بھی بڑی تعداد میں کہانیاں لکھی اور پڑھی جا رہی ہیں گذشتہ دو برسوں میں سیکڑوں افسانہ نویسوں اور کہانی نویسوں نے اپنے ذہن و قلم کی جولانی کے خوب جلوے بکھیرے۔ کسی نے کم تو کسی نے زیادہ لیکن بہرصورت کہانی نویسوں نے اپنے قلم اور اپنے نام کا دبدبہ قائم رکھا ان میں کئی نام ایسے ہیں جنہیں بھلایا نہیں جا سکتا کسی ترتیب کے بغیر ایسے افسانہ نویسوں کا نام لیا جائے تو بلاشبہ مرد افسانہ نویسوں کے ساتھ ساتھ خواتین افسانہ نگاروں کے نام بھی سامنے آئیں گے جیسے قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، ذکیہ مشہدی، شکیلہ اختر، ممتاز شیریں، واجدہ تبسم، شہیرہ مسرور، شائستہ فاخری، جیلانی بانو، صغریٰ سبزواری، صبوحی طارق، اشرف جہاں، تسنیم کوثر، نزہت طارق ظہیری، عنبری رحمٰن اور قمر جہاں وغیرہ جبکہ مرد افسانہ نگاروں میں ترقی پسند تحریک کے ابتدائی ایام میں منشی پریم چند، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک، کرشن چندر، ممتاز مفتی، ابوالفضل صدیقی، خواجہ احمد عباس، سہیل عظیم آبادی، سید رفیق حسین، کرتار سنگھ دگل، مانک ٹالہ، نور شاہ، جوگندر پال، بلونت سنگھ اور 60 کی دہائی سے اقبال متین، عابد سہیل، شبیر احمد، منظر کاظمی سے لے کر انور خان، اختر آزاد، انور قمر، ساجد رشید، سلام بن رزاق، علی امام نقوی، اسلم جمشید پوری، مجیر احمد آزاد، مشتاق مومن سے لے کر ایم۔ مبین اور معین الدین عثمانی تک کے افسانوں نے اردو کے افسانوی ادب میں ایک مقام پیدا کیا۔

اپنے عہد کے انھیں مقبول و معروف افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام شبیر احمد کا ہے جنھوں نے اخباری صحافت میں اپنی پوری زندگی گزارنے کے باوجود خود کو ہمیشہ تشہیری دنیا سے دور رکھا۔ وہ آخر دم تک بہار کی راجدھانی پٹنہ میں مقیم رہے، درس و تدریس اور صحافتی ذمے داریوں نے کبھی ان کو آزادانہ زندگی گزارنے کی مہلت نہیں دی۔ باوجود اس کے کہ وہ کبھی بھی اپنے ذاتی مسائل و معاملات اور فرائض سے غافل نہیں ہوئے انھوں نے پچاس سال کے عرصے میں بے شمار افسانے لکھے جو نہ صرف اندرون ملک ادبی رسالوں میں شائع ہوئے بلکہ پاکستان سے

شائع ہونے والے رسالے ماہنامہ 'سیپ' میں بھی جگہ پائی۔ لیکن اس طویل عرصے میں ان کے افسانوں کے صرف دو مجموعے ہی منظر عام پر آ سکے۔ پہلا مجموعہ 'اعتراف' کے نام سے جولائی 1976 میں شائع ہوا جس میں کل 19 افسانے ہیں جبکہ دوسرا افسانوی مجموعہ ہو بہو کے نام سے ستمبر 1986 میں شائع ہو کر بے حد مقبول ہوا اس میں اٹھارہ افسانے ہیں۔ان دونوں افسانوی مجموعے میں شامل افسانے کسی بھی بندھے ٹکے اصولوں سے الگ تھلگ ہیں اور ہر ایک افسانے کا اپنا منفرد اور رنگارنگ پہلو ہے جو شبیر احمد کو دیگر افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔

شبیر احمد کا آبائی وطن بہار کے موضع اسلامپور پری پوسٹ گسوتھر لہریا سرائے دربھنگہ ہے۔ لیکن ان کے سنہ ولادت میں میں تضاد موجود ہے۔ اپنی کہانیوں کے پہلے مجموعے 'اعتراف' میں انھوں نے اپنی تاریخ پیدائش 16 جولائی 1946 تحریر کیا ہے جب کہ کہانیوں کا دوسرا مجموعہ 'ہو بہو' جو 1986 میں شائع ہوا اس میں انھوں نے اپنی تاریخ پیدائش 30 مارچ 1938 درج کی ہے۔ پٹنہ میں مقیم رہتے ہوئے تین جون 2005 کو شبیر احمد نے اس دار فانی سے کوچ کیا۔ان کی تاریخ پیدائش کی دونوں تاریخوں کا اگر

اپنے عهد کے انهیں مقبول و معروف افسانه نگاروں میں ایک اهم نام شبیر احمد کا هے جنهوں نے اخباری صحافت میں اپنی پوری زندگی گزارنے کے باوجود خود کو همیشه تشهیری دنیا سے دور رکھا. وہ آخر دم تک بهار کی راجدهانی پٹنه میں مقیم رهے، درس و تدریس اور صحافتی ذمے داریوں نے کبھی ان کو آزادانه زندگی گزارنے کی مهلت نهیں دی. باوجود اس کے که وہ کبھی بھی اپنے ذاتی مسائل و معاملات اور فرائض سے غافل نهیں هوئے انهوں نے پچاس سال کے عرصے میں بے شمار افسانے لکھے جو نه صرف اندرون ملک ادبی رسالوں میں شائع هوئے بلکه پاکستان سے شائع هونے والے رسالے ماهنامه 'سیپ' میں بھی جگه پائی. لیکن اس طویل عرصے میں ان کے افسانوں کے صرف دو مجموعے هی منظرعام پر آ سکے. پهلا مجموعه 'اعتراف' کے نام سے جولائی 1976 میں شائع هوا جس میں کل 19 افسانے هیں جبکه دوسرا افسانوی مجموعه هو بهو کے نام سے ستمبر 1986 میں شائع هو کر بے حد مقبول هوا اس میں اٹھارہ افسانے هیں.

فرق دیکھا جائے تو اس میں کل آٹھ سال کا فرق ہے گویا وفات کے وقت ان کی عمر 59 سال یا پھر 67 سال تھی۔

شبیر احمد کی کہانیوں کے مجموعے اعتراف جو 1976 میں شائع ہوا اس میں انیس کہانیاں ہیں اور بیشتر کہانیاں اسلامی تاریخی پس منظر میں تحریر کی گئی ہیں جب کہ دوسری کہانیاں بھی حقائق پر مبنی ہیں جو شہری زندگی سے لے کر گاؤں کے بدلتے منظر نامے کی عکاسی کرتی ہیں۔ گویا تمام کہانیاں ہمہ جہت اور ہمہ رنگ ہیں جسے پڑھنے اور سمجھنے میں عام قاری کو بھی بہت زیادہ دقت پیش نہیں آتی۔ اعتراف میں شامل چوتھی کہانی 'نکیل آقا کے ہاتھ میں تھی' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"...یہ واقعہ نہ جانے کتنی بار دہرایا جا چکا ہے کہ غلام ناقہ نشین تھا اور نکیل آقا کے ہاتھ میں تھی۔ قاصد نے یہ بھی دیکھا کہ وہ جس کے ہاتھ میں نکیل تھی اور جس کے

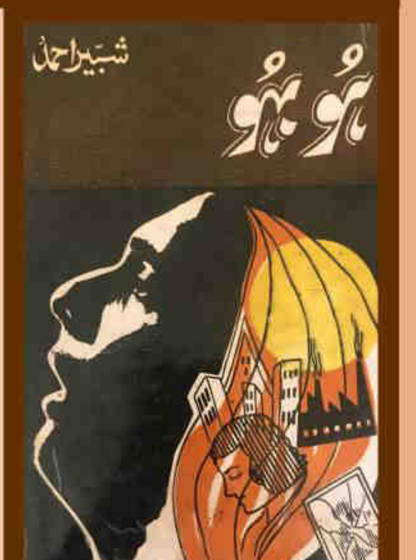

جسم کے کپڑوں پر کئی پیوند تھے اس کی پیشانی دمک رہی تھی اور چہرے پر عجب سکون و جلال تھا۔ ایسا سکون جس میں ساری کائنات سمٹی ہوئی تھی۔ ایسا جلال جس میں ساری کائنات پھیلی ہوئی تھی۔ قاصد نے جب اپنے آقا کو تفصیل بتائی تو وہ بول پڑا۔تم جو کچھ کہہ رہے ہو اگر یہ سچ ہے تو پھر یہ وہی شخص ہے جس کا تذکرہ کتاب مقدس میں ہوا ہے۔ پھر جب اس شخص نے دیکھا تو بے ساختہ چیخ پڑا، بخدا یہ وہی ہے، بخدا یہ وہی ہے۔

اسی طرح ایک اور کہانی 'خیر من النوم' بھی اسلامی تاریخ کے پس منظر میں تحریر کی گئی ہے، لکھتے ہیں۔

"... میں تمھیں اپنا مدمقابل نہیں سمجھتا کہ تم اندھیرے میں بھٹکنے والے ایک حقیر کیڑا ہو، میں نے تو اس سے مقابلہ کیا ہے جو عصا بدست تھا۔ ایک روشنی کا مرکز تھا اور ایک ہجوم تھا جو پانی پانی کہہ رہا تھا۔ اور میں تھا اور میں نے بادلوں کو حکم دیا اور زمین سیراب ہوگئی۔ میں نے اس سے مقابلہ کیا جو اپنے جسم سے نکل کر بھاگنے والے کیڑوں کو پکڑ پکڑ کر اپنے ہی جسم میں رکھ دیا کرتا تھا۔ اس سے بھی دست گریباں رہا جس نے اپنی آنکھوں میں پٹی باندھ لی تھی اور ہاتھوں میں ایک تیز اور چمکدار شے پکڑ رکھی تھی وہ میرے مدمقابل تھے اور تم ایک حقیر کیڑا ہو میری بات مان لو گھر لوٹ جاؤ پہلے اپنے اندر اور باہر کی تاریکی کو دور کرو۔"

شبیر احمد کی افسانہ نگاری کے تعلق سے ایک تاریخی واقعہ مجھے یاد آتا ہے جسے کہانی پسند اور حق پسند قارئین کے گوش گزار کرانا، میں اپنی ذمے داری سمجھتا ہوں۔

70 کی دہائی میں جب واجدہ تبسم کی افسانہ نگاری عروج پر تھی اور بڑے نیم ادبی رسائل کے مالکان بطور معاوضہ ایڈوانس رقم بھیج کر واجدہ تبسم سے فرمائشی افسانے لکھوایا کرتے تھے۔ انہی دنوں واجدہ تبسم نے نوابین حیدرآباد کو نہ صرف اپنا نشانہ بنایا بلکہ نوابین کی جتنی تضحیک اور کردار کشی ہو سکتی تھی انھوں نے کی اور کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی، لیکن حالات نے کروٹ لی اور واجدہ تبسم نے اس خاص نوعیت کی کہانیاں لکھنی بند کر دی۔ تاہم ایک دن اچانک کسی انتہائی غیر معروف شہوار گل نامی افسانہ نگار کے نام سے ماہنامہ 'روبی' دہلی میں 'ٹیٹنک پنجہ' نامی افسانہ شائع ہوا اور نتیجہ یہ ہوا کہ واجدہ تبسم نے نوابین حیدرآباد کی کردار کشی میں جو بھی کسر چھوڑی تھی وہ ساری کسر شہوار گل نے پوری کر دی۔ اس کے بعد شہوار گل کا کوئی افسانہ کسی بھی ادبی یا نیم ادبی رسالے میں آج تک نظر نہیں آیا۔

شبیر احمد ایک دردمند دل رکھنے والے افسانہ نگار تھے۔ حقائق کی قبولیت ان کی فطرت تھی اور عادت بھی۔

شہوار گل کی ریشہ دوانیوں سے جھنجھلا کر نوابین حیدرآباد کے اعلی کردار کی عکاسی کرتے ہوئے انھوں نے ایک کہانی 'شاہ بلوط' کے عنوان سے لکھی جو ماہنامہ 'روبی' دہلی کے کسی شمارے میں شائع ہوئی۔ اسی کہانی کے ایک حصے میں شبیر احمد لکھتے ہیں:

''..... نہال! دیکھو اس شاہ بلوط کو کتنا سر بلند تھا، کتنی گھنیری شاخیں تھیں، اس کے چاروں طرف پھولوں کی رنگ برنگی اور خوبصورت باڑھیں تھیں۔ چھوٹے چھوٹے سرسبز پیڑ پودے بھی تھے، کبھی ایسا بھی ہوا ہوگا کہ کسی پھول کو چوم لینے کی تمنا نے شاہ بلوط کے دل میں کروٹ لی ہوگی مگر چاہنے کے باوجود وہ جھک نہیں سکا ہوگا، اپنی پسند کے پھول کو چوم نہ سکا ہوگا۔''

شبیر احمد کی اس کہانی کی اشاعت کے بعد سے آج تک کسی نے بھی نوابین حیدرآباد کی تضحیک اور کردارکشی کی جرأت نہیں کی۔ شاہ بلوط میں وہ ساری خوبیاں تھیں جو نوابین حیدرآباد کے بلند کردار کی عکاس تھیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کی کہانیوں کے مجموعے 'اعتراف' میں شامل 'ایک دریا پیاس کے صحرا میں'، کالا سمندر، روشنی کے شہر میں، اپنی جنت کا خیال، سوکھی ٹھٹھری ندی، ایک دوانی اور چھوٹی بیگم وغیرہ ایسی کہانیاں ہیں جو شہر گاؤں اور سماجی رشتوں کو استوار کرتی ہیں۔ پٹنہ جیسے شہر میں اپنی عمر کے آخری ایام تک وہ اس شہر کا اٹوٹ حصہ رہے لیکن انھوں نے کبھی بھی اپنے گاؤں سے رشتہ نہیں توڑا، گاؤں کی باتیں، گاؤں کی یادیں اور گاؤں کے لوگوں کو شبیر احمد نے ہمیشہ اپنی کہانیوں میں زندہ رکھا، حتی کہ گاؤں کی ندی، گاؤں کے تالاب اور اونچے اونچے درختوں کے درمیان کوکو کرتی کوئل کو بھی وہ کبھی نہیں بھولے۔

شبیر احمد کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ 'ہو بہو' بھی 1986 میں شائع ہوکر بے حد مقبول ہوا۔ اس کے ابتدائی صفحات پر وہ اپنی بات میں اپنی کہانیوں کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''..... فریاد کی کوئی لے نہیں ہوتی' سو اسی کا تجربہ مجھے بھی ہو رہا ہے۔ میں آج تک بہت سی چیزوں کے رمز کو جاننے کی کوشش میں ناکام رہا ہوں۔ لہریں کیوں بنتی ہیں، کیوں بگڑتی ہیں اور کیوں ٹوٹ جاتی ہیں میں تو آج تک یہ بھی نہیں جان سکا۔ مجھے خبر نہیں کہ لوگ کس طرح اسرار ناپید سے واقف ہو جاتے ہیں۔ اپنا حال تو یہ ہے کہ نہ دیکھی ہوئی چیز پر اعتبار ہوتا ہے اور نہ سنی ہوئی باتوں پر اختیار۔ سماعت سے بصارت تک بہت فاصلہ نہ سہی لیکن میرے لیے ان دونوں کے درمیان ہمیشہ ایک سفید گہری کہرآلود فضا حائل رہی ہے۔ میں نہ جانے کہاں سے بسا اوقات مستعار شہہ پاروں کے ذریعے پرواز کرتا ہوا انجانی وادیوں میں بھٹکتا رہا ہوں اور کبھی کبھی تو بڑی سے بڑی بلندیاں بھی چوم آیا ہوں، مگر چشم و گوش کے درمیان جو فاصلہ ہے وہ اب تک طے نہیں ہوا، آنکھیں جو دیکھنا چاہتی تھیں وہ نہ دیکھ سکیں اور قابل سماعت ہر بات محروم گوش نظر آئی۔ ان تضادات کے درمیان ہم آہنگی کی ساری کوششیں مجھے پچھلے پہر کے تھکے ہوئے چراغ کے پگھلتے ہوئے آنسوؤں کی یاد دلا رہی ہیں اور جب یہ کھوئی یادیں کسی بے قرار لمحے کی آنکھوں سے ٹپک گئی ہیں تو ان لفظوں نے جنم لیا ہے جو میری روح کا احاطہ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ میں سیپ چنتا رہا ہوں اور درد کے موتیوں کے اظہار میں ناکامیِ مسلسل کا المیہ بنتا رہا ہوں۔''

افسانوی مجموعے 'ہو بہو' میں شامل پہلی کہانی 'اپنا گاؤں' میں شبیر احمد نے جہاں اپنے گاؤں کے ماضی، حال اور مستقبل کا بڑی خوبصورتی سے تذکرہ کیا ہے وہیں وہ گاؤں کے موجودہ حالات سے بے حد فکرمند نظر آتے ہیں اور باضابطہ اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

''..... ہمارے گاؤں کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ یہاں کوئی چودھری نہیں تھا اور نہ ہی کسی نے چودھری بننے کے لیے گاؤں کے لوگوں پر جور و ظلم کیا۔ ذی حیثیت اور خوشحال لوگ تو کئی تھے جن کی حیثیت چودھری سے کم نہیں تھی لیکن ان لوگوں نے بھی چودھری بننے کی کوشش نہیں کی۔ اور چونکہ گاؤں میں کوئی چودھری نہیں تھا اس لیے سب لوگ بھائی بھائی کی طرح رہتے تھے۔

وہیں آگے لکھتے ہیں:

''..... مگر اب وہ گاؤں نہیں رہا۔ ظاہری طور پر گاؤں میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی تھی۔ نہ بجلی آئی تھی اور نہ آٹا چکی۔ البتہ دھول اڑاتی ہوئی کچی سڑک کول تار کی پختہ سڑک میں تبدیل ہو رہی تھی اور کئی چائے خانے کھل گئے تھے۔ اس کے باوجود اب یہ پہلے جیسا گاؤں نہیں تھا۔ وہ لوگ رہے اور نہ ایثار و قربانی کا وہ جذبہ ہے کہ وقت کے بے رحم اور ان دیکھے ہاتھوں نے سب کچھ چھین لیا تھا، گاؤں کی معصومیت، پاکیزگی اور تقدس.....!''

شبیر احمد کی کہانیوں کے تعلق سے ڈاکٹر لطف الرحمٰن لکھتے ہیں:

''..... میں جب شبیر کی کہانیاں پڑھتا ہوں تو اس کی فکری اور فنی کوتاہیوں سے قطع نظر اس کی بے ساختگی احساس اور سادہ لوح معصومیت پر تڑپ اٹھتا ہوں کہ یہ وہ سرمایۂ ہنر ہے جو اس نے عہد حاضر کی کمینگیوں میں بچا رکھا ہے، اس کی تقریباً ہر کہانی میں فطرت کے حسن کی طرف معصومانہ انداز فکر کی بے کلی کا احساس موجزن ہے۔ قرۃ العین حیدر یا قاضی عبدالستار کی طرح شبیر احمد جاگیردارانہ تہذیب کے زوال کا نوحہ گر نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جاگیردارانہ تہذیب، بہت سی انسانی قدروں کا مجموعہ بھی تھی لیکن یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ وہ ہمارا پرانا استحصال پسند معاشرہ تھا۔ ہندوستان کے پرانے قلعے ہمارے ماضی کے استحصال کی علامتیں ہیں جس میں مظلوموں اور مجبوروں کی نہ جانے کتنی آہیں اور کراہیں دفن ہیں.....''

شبیر احمد کے افسانوی مجموعے 'اعتراف' یا پھر ''ہو بہو'' میں شامل افسانے جیسے 'ایک دریا پیاس کے صحرا میں'، نکیل آقا کے ہاتھ میں تھی، خیر من النوم، شاہ بلوط، چور دروازہ، کالا سمندر، سوکھے پتے کی لاش، اپنا گاؤں، شانتی، قوس قزح کے رنگوں والی گاڑی، ڈھلان سے اترتے ہوئے لوگ، کاندھے پہ ڈول ڈالے، سرخ مٹی، ہو بہو، حصارا اور دارا دا اور وغیرہ ایسے افسانے ہیں کہ انھیں پڑھیے تو پڑھتے ہی چلے جائیے۔ آپ کو کہیں اکتاہٹ محسوس نہیں ہوگی۔ آپ افسانے کے ہر پیراگراف میں گم ہوتے چلے جائیں گے۔ وہ اپنے گاؤں، اس کی پرانی تہذیب اور دیرینہ طرز زندگی کی حسرت بھری یادوں سے اپنے دامن کو مالا مال رکھنے کی کوشش میں مگن رہے ہیں۔

ڈاکٹر لطف الرحمٰن ایک جگہ شبیر احمد کے افسانوں کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''..... قرۃ العین حیدر کے مقابلے شبیر احمد خود کو ایک کمتر افسانہ نگار سمجھتا ہے اور یہ اچھی بات ہے کہ وہ خود کو کسی خوش فہمی کا شکار نہیں بناتا اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں لمحہ بہ لمحہ فکر و فن کی راہوں پر رواں دواں ہے.....''

شبیر احمد نے بلاشبہ بہت سارے افسانے لکھے جو اکثر و بیشتر ادبی رسالوں کی زینت بنتے رہے لیکن وہ کبھی بھی شہرت طلبی کا شکار نہیں ہوئے۔ پٹنہ جیسے بڑے شہر میں انھوں نے ایک طرف جہاں پیشہ، درس و تدریس کی ذمے داری نبھائی وہیں دوسری جانب اپنی پوری زندگی ادب و صحافت سے وابستہ کر رکھی تھی۔ محنت سے کبھی جی نہیں چرایا۔ صبح سے لے کر رات بارہ بجے تک کام کام اور صرف کام۔ یہی ان کی محنت کش زندگی کا مول تھا۔ 3 جون 2005 کو انھوں نے پٹنہ میں وفات پائی۔ وہ اپنی رنگارنگ کہانیوں کے حوالے سے ہمیشہ اردو ادب میں زندہ رہیں گے اور یاد کیے جائیں گے۔

■

Akhtar Kazmi
12/14, Sai Nagar
Gaibi Nagar
Bhiwandi - 421302 (MS)
Mob.: 9326356942

اختر الایمان
کی شاعری کا موضوعاتی مطالعہ

یوسف رامپوری

اخترالایمان فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے، معروف ومشہور ہستیوں سے ان کا واسطہ رہا، صاحب ثروت اشخاص کی زندگی کے طورانھوں نے دیکھے، غریبوں کا استحصال کرکے مالداروں کو اپنی تجوریاں بھرتے ہوئے دیکھا ،تو انھیں سخت تکلیف پھنچی، شاعر تھے تو یہ تکلیف ان کی شاعری میں شامل ہو گئی۔

اختر الایمان اردو کا وہ شاعر ہے جس نے انسانی زندگی سے جڑے ان تمام مسائل کو اپنی شاعری میں اٹھایا، جن سے حیاتِ انسانی متاثر ہورہی ہے اور انسان لحظہ بہ لحظہ تیزی کے ساتھ روبہ زوال ہے۔اختر الایمان کو اس بات کی کڑھن ہے کہ انسان ایک عظیم مخلوق ہونے کے باوجود مسائل کے بھنور میں گرفتار کیوں ہے؟ آخر وہ ایسے راستوں کو اپنے لیے کیوں منتخب کررہا ہے جو اس کو اس کی منزل سے بھٹکا کر ایسے مقام تک لے جارہے ہیں جہاں بربادی وتباہی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔انسانی زندگی کی اس درگت اور تباہی پر اختر الایمان تلملا اٹھتے ہیں اور انسانی مسائل کو اشعار کی زبان دے کر لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

اختر الایمان کی شاعری کو موضوعاتی تناظر میں دیکھنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے چن چن کر اہم موضوعات کو اٹھایا ہے اور شاعری میں برتا ہے ،لیکن اشعار میں جو نیچرلٹی ہے وہ مذکورہ مفروضے کو مسترد کردیتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اختر الایمان صرف انسانیت کی تباہی کا نوحہ بیان کررہا ہے اور درد میں ڈوب کر شعر کہتا چلا جاتا ہے۔اب یہ الگ بات ہے کہ وہ اس دوران کبھی جذباتی ہوجاتا ہے، کبھی سراپا غم کی تصویر بن جاتا ہے، تو کبھی زمانے سے ٹکرانے کا حوصلہ دکھاتا ہے، کبھی یاسیت وقنوطیت کے بحر میں ہچکولے کھانے لگتا ہے، کبھی وہ اخلاقی قدروں کے زوال پر رنج وغم کا اظہار کرتا ہے تو کبھی گم ہوتی ہوئی تہذیب کا رونا روتا ہے۔کبھی اقدارِ رفتہ کی بازیافت کے لیے صدائے بازگشت بلند کرتا ہے تو کبھی اقدارِ جدیدہ سے بچنے کی تلقین کرنے لگتا ہے۔اس کی شاعری کا بہاؤ خود بخود ایسے تمام موضوعات کو اپنی آغوش میں لیتا چلا جاتا ہے جو انسانی زندگی کا المیہ ہیں۔ اس طرح بہت سے موضوعات خواہی نہ خواہی اختر الایمان کی شاعری کا حصہ بن جاتے ہیں۔آل احمد سرور لکھتے ہیں:

’’اختر الایمان کی نظموں میں زندگی کے سبھی رنگ ملتے ہیں۔اختر الایمان نے خود بھی زندگی سے آنکھیں چار کی ہیں اور اپنے پڑھنے والوں کو بھی یہ حوصلہ دیا ہے۔‘‘(اختر الایمان عکس اور جہتیں،ص 65)

اختر الایمان کی شاعری میں مختلف موضوعات اس لیے بھی مجتمع ہوگئے ہیں کہ اختر الایمان حساس شاعر ہیں۔اگر چہ ہر شاعر اور فنکار بلکہ ہر انسان اور انسان ہی کیا، ہر جاندار حساس ہوتا ہے،لیکن اختر الایمان ان شعرا میں سے ہیں جن کے یہاں حسیت زیادہ بیدار ہے، جو سماج میں آئے دن رونما ہونے والے ان معمولی واقعات سے بھی ملول ومغموم ہوجاتے ہیں جو اور لوگوں کے نزدیک محض روزمرہ کے عام واقعات کی حیثیت رکھتے ہیں۔جن شعرا کے یہاں احساس کی تپش اتنی تیز ہو، ان کے نزدیک ہر واقعہ چاہے وہ معمولی ہو یا غیر معمولی ،ایک موضوع بن کر ابھرتا ہے۔ اختر الایمان نے ایسے بہت سے واقعات کو شاعری میں بیان کیا یا ان پر شعر کہے تو ان کی شاعری کے موضوعات کا دائرہ دور تک پھیلتا چلا گیا۔

اختر الایمان کے یہاں انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں۔ایک ان کی داخلی زندگی سے ہم آہنگ اور دوسرا ان کی خارجی زندگی سے متعلق۔ دونوں ہی پہلوان کے احساس کی گرفت میں جکڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کے بھی مختلف نشیب وفراز دیکھے ہیں اور دوسروں کی زندگیوں کے بھی۔ اختر الایمان کا بچپن جن حالات میں گزرا، وہ ان کے ذہن وقلب پر ایسے انمٹ اثرات چھوڑ گیا جو تادمِ آخر ان کی یادداشتوں میں شامل رہے۔گھر میں غربت کا بسیرا تھا، اس پر طرہ یہ کہ والد غیر ذمے دار اور لاپرواہ ثابت ہوئے تھے ،جس کے باعث ماں باپ کے درمیان ٹکراؤ کا ماحول بنا رہتا تھا۔اختر الایمان اگر چہ کم سن تھے، مگر ان کی کمسن نگاہوں میں وہ تمام منظر اس طرح جذب ہوگئے تھے کہ کبھی اوجھل نہ ہوئے ۔ گھر سے دور اور بہت دور جاکر غربت وافلاس اور عائلی تنازعات کی زندگی تو پیچھے چھوٹ گئی، مگر حقیقت یہ ہے کہ یادہائے رفتہ اور مناظرِ گزشتہ ان کا پوری زندگی تعاقب کرتے رہے ۔نئی زندگی میں انھیں اگر چہ مفلوک الحالی کا سامنا نہ تھا اور نہ اس سے پنپنے والے مسائل کا ، لیکن یہاں کے پُرفریب مناظر فی الواقع جس قدر مہیب تھے، وہ اختر الایمان جیسے حساس شخص اور شاعر کو کیسے چین سے بیٹھنے دے سکتے تھے۔ یہاں بیرون کچھ اور، اندرون کچھ تھا۔ یہاں نئی تہذیب کے ہنگامے تھے لیکن مروت وانسانیت جس طرح اس تہذیب کے پیروں تلے روندی جارہی تھی اور اخلاقی قدریں اور روایتیں مادیت کے چنگلوں میں کراہ رہی تھیں، انھوں نے اختر الایمان کو اور زیادہ مضطرب کردیا۔اختر الایمان فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے،معروف ومشہور ہستیوں سے ان کا واسطہ رہا، صاحب ثروت اشخاص کی زندگی کے طور انھوں نے دیکھے، غریبوں کا استحصال کرکے مالداروں کو اپنی تجوریاں بھرتے ہوئے دیکھا ،تو انھیں سخت تکلیف پہنچی، شاعر تھے تو یہ تکلیف ان کی شاعری میں شامل ہوگئی۔زندگی کے نئے زاویوں نے انسان کو کس قدر مصائب دیے ہیں اور کس طرح اس کی زندگی کا رخ موڑ کر رکھ دیا ہے۔اختر الایمان کہتے ہیں۔

صبح اٹھ جاتا ہوں جب مرغ اذاں دیتے ہیں
اور روٹی کے تعاقب میں نکل جاتا ہوں
شام کو ڈھور پلٹتے ہیں چراگاہوں سے جب
شب گزاری کے لیے میں بھی پلٹ آتا ہوں

’’صبح اٹھ جاتا ہوں جب مرغ اذاں دیتے ہیں‘‘ یہ مصرع ان انسانوں کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے جو رات کی نیند سے بیدار ہوکر دووقت کی روٹی کے حصول کے لیے جہاں تہاں سرگرداں ہوجاتے ہیں۔ان کی یہ تگ ودو شام ڈھلے تک جاری رہتی ہے۔ گویا کہ صبح تا شام سارا وقت زندگی کے محض ایک شعبے (معیشت) کی نذر ہوجاتا ہے۔سوال

یہ ہے کہ کیا معیشت کے علاوہ انسانی زندگی کا کوئی اور شعبہ یا پہلو لائق اعتنا نہیں۔ اگر زندگی صرف کھانے اور کمانے کا نام ہے تو پھر جانوروں اور انسانوں کے مابین فرق کیا ہے؟ انسان کی یہ حالت اس نئی تہذیب نے کی ہے جس میں مادّیت ہی سب کچھ ہے۔ اس نئی تہذیب نے انسانی زندگی کے سامنے اس قدر مسائل کھڑے کردیے ہیں کہ وہ ان کے سدِ باب کے لیے ایک مشین کی طرح کام کرنے پر مجبور ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ اپنے گاؤں، کھیت کھلیانوں، دوستوں، رشتے داروں کو چھوڑ کر دور اجنبی شہروں کا رُخ کر رہا ہے جہاں ہر طرف غبار ہی غبار ہے، جہاں چمنیوں سے نکلنے والے دھوئیں نے پوری فضا کو کثیف اور پراگندہ کیا ہوا ہے۔ ایسے گھٹتے ہوئے ماحول میں دنوں اور راتوں کو محنت ومزدوری کرنے اور اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ غیر فطری اجنبی ماحول میں گزارنے کے بعد بھی انسان کو حاصل کیا ہوتا ہے؟ کیا اسے راحت وسکون سے زندگی بسر کرنے کے لیے وسائل فراہم ہوجاتے ہیں؟ کیا وہ اپنے ان مسائل کا تدارک کرلیتا ہے، جن کے لیے اس نے اپنی اس بستی کو خیر باد کہا تھا، جہاں سب کچھ اپنا تھا، جہاں کی فضا مانوس تھی، جہاں کی صبحیں نہایت خوشنما منظر پیش کرتی تھیں اور شامیں بڑی خوشگوار ہوتی تھیں، جہاں سانس لینے میں بھی تازگی کا احساس ہوتا تھا ۔حقیقت یہ ہے کہ اپنے گھروں کو پیچھے چھوڑ کر آنے والے کچھ فیصد لوگوں کو چھوڑ کر زیادہ تر بس اپنی پوری عمر اجنبی جگہوں پر ضائع کردیتے ہیں اور انھیں کچھ میسر نہیں آتا۔ اخترالایمان نے اپنی آنکھوں سے نہ جانے کتنی زندگیوں کو اس طرح برباد ہوتے ہوئے دیکھا، اس لیے وہ بے چین ہوگئے اور صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے یوں گویا ہوئے

یوں نہ ہو مجھ سے گریزاں مرا سرمایہ ابھی
خواب ہی خواب ہیں خوابوں کے سوا کچھ بھی نہیں
ملتوی کرتا رہا کل پہ تری دید کو میں
اور کرتا رہا اپنے لیے ہموار زمیں
آج لیتا ہوں جواں سوختہ راتوں کا حساب
جن کو چھوڑ آیا ہوں ماضی کے دھندلکوں میں کہیں

مادیت پرستی یا موجودہ صنعتی انقلاب کے خلاف احتجاج اخترالایمان کی شاعری میں ایک مستقل موضوع کی حیثیت اختیار کرگیا ہے۔ انھوں نے اس تناظر میں کئی نظمیں کہی ہیں اور بہت سے اشعار۔ ان کی نظم 'عہد وفا' مادیت پرستی کے اندوہناک نتائج کا پورا چربہ اتار کر رکھ دیتی ہے۔ ''جدھر اونچے محلوں کے گنبد، ملوں کی سیہ چمنیاں آسماں کی طرف سر اٹھائے کھڑی ہیں'' سے اخترالایمان نے نئی دنیا کا منظر کھینچا ہے جو اگرچہ بظاہر خوشنما محسوس ہوتا ہے۔ اونچے محل اور ان کے گنبد نظر آتے ہیں، مگر ان پر سیاہ چمنیوں کے دھوئیں کے بادل منڈلا رہے ہیں اور محلوں کی فضا کو مکدر کر رہے ہیں۔ نظم 'عہد وفا' کے یہ الفاظ ''یہ کہہ کر گیا ہے کہ میں سونے چاندی کے گہنے ترے واسطے لینے جاتا ہوں رامی'' ان خواہشوں اور خوابوں کا علامتی بیان ہیں جن کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے انسان اپنے آپ کو پُرشور بھیڑ میں گم کردیتا ہے اور اپنے پیچھے ان منتظر نگاہوں کو چھوڑ جاتا ہے جو بس انتظار ہی کرتی رہتی ہیں۔

اخترالایمان موجودہ مادی نظام سے بیزار اس لیے ہیں کہ اس نے اچھے خاصے انسان کو مفاد پرست، لالچی اور چاپلوس بنادیا ہے، اچھی خصلتوں پر بری عادتوں کو غالب کردیا ہے۔ اس نے حیاتِ انسانی سے متعلقہ فطری نظام کو بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ اخترالایمان کی نظم 'ایک لڑکا' میں فطری اور غیر فطری، خودداری اور چاپلوسی، ایثار وقربانی اور مفاد پرستی دونوں پہلو سامنے آتے ہیں۔ یہ نظم نہ صرف کسی ایک شخص کی زندگی کا بلکہ پوری بنی نوعِ انساں کی زندگی کا المیہ معلوم ہوتی ہے۔ عصرِ حاضر میں انسان کس طرح اپنی فطری زندگی سے بچھڑ کر ہنگامہ آرائی اور استحصالی بھول بھلیوں میں گم ہوگیا ہے۔ نظم کے چند مندرجہ ذیل اشعار میں پہلے معصوم بچے کی فطری زندگی کو دیکھیں، اس کے بعد اس بچے کے بدلے ہوئے پہلو کا بھی مشاہدہ کریں۔ اخترالایمان کہتے ہیں

کبھی جھیلوں کے پانی میں، کبھی بستی کی گلیوں میں
کبھی کچھ نیم عریاں کمسنوں کی رنگ رلیوں میں
تعاقب میں کبھی گم، تتلیوں کے سونی راہوں میں
کبھی ننھے پرندوں کی نہفتہ خواب گاہوں میں

....

یہ لڑکا پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو
یہ لڑکا پوچھتا ہے جب تو میں جھلا کے کہتا ہوں
وہ آشفتہ مزاج اندوہ پرور اضطراب آسا
جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مرچکا ظالم
اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اسی کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں

مٹتی ہوئی تہذیبی اور اخلاقی قدریں بھی اخترالایمان کی شاعری کا اہم موضوع ہیں۔ انھوں نے اس موضوع کے حوالے سے خاصی شاعری کی ہے اور ڈوب کر کی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انھیں قدیم تہذیب سے بے انتہا محبت ہے۔ وہ اسے انسانیت کے لیے اہم سمجھتے ہیں، وہ نہیں چاہتے کہ وہ تہذیب جو اب آہستہ آہستہ ہمارے ماضی کا حصہ بنتی جارہی ہے، معدوم ہوجائے۔ کیونکہ اگر وہ تہذیب ختم ہوگئی تو نہ صرف پورے ایک عہد کا خاتمہ ہوگا بلکہ انسانیت ہی مرجائے گی۔ نئی تہذیب انسانیت کو آگے نہیں بڑھا سکتی، اس کے اندر تصنع اور بناوٹ ہے، وہ فطرت اور فطری حسن وغنائیت سے عاری ہے، وہ انسان کے جذبات کی ترجمانی نہیں کرتی بلکہ اسے ایک مشین بنادیتی ہے جس میں ضمیر واحساس نہیں ہوتا۔ اخترالایمان چاہتے ہیں کہ ایسی تہذیب رواج نہ پائے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ ہمارا تہذیبی اثاثہ نہ صرف محفوظ رہے بلکہ وہ ہماری زندگی میں گھلا ملا ہو یا ہماری زندگی اس تہذیب کے سائے میں آگے بڑھے۔ اسی لیے وہ معدوم ہوتی ہوئی پرانی تہذیب کے تحفظ کی بات کرتے ہیں اور اس کے باقیات کو دیکھ کر غمزدہ ہوجاتے ہیں۔ ان کی نظم 'مسجد' اسی تہذیب کا علامیہ ہے۔ اس نظم میں اخترالایمان نے تہذیبی اور انسانی اقدار کی بربادی کا مرقع کھینچا ہے۔ اخترالایمان کو ڈر ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ موجودہ نسلوں کے جمود وغفلت کے نتیجے میں بقیہ تہذیبی آثار بھی ختم ہوجائیں۔ چند اشعار دیکھیے

تیز ندی کی ہر اک موج تلاطم بردوش
چیخ اٹھتی ہے وہیں دور سے فانی فانی
کل بہالوں گی تجھے توڑ کے ساحل کے قیود
اور پھر گنبد و مینار بھی پانی پانی

اخترالایمان کی شاعری میں غربت وافلاس کا مسئلہ بھی بار بار آیا ہے۔ اس لیے کہ اخترالایمان غربت کی کوکھ سے پیدا ہونے والے مسائل سے واقف ہیں۔ ان کی اپنی زندگی کا اچھا خاصا حصہ اسی غربت کے عالم میں گزرا تھا اور انھوں نے دوسرے بہت سے ایسے لوگ بھی دیکھے جن پر غربت نے بڑے ستم ڈھائے تھے۔ غربت کے موضوع کو دوسرے شعرانے بھی اپنی شاعری میں برتا ہے لیکن اخترالایمان کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے غربت کی تصویریں کچھ اس انداز سے کھینچی ہیں کہ غربت کے نتائج وعواقب ان تصویروں کے بیک گراؤنڈ میں اس طرح نمایاں ہوجاتے ہیں کہ دیکھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

تقسیم وطن اور سلسلۂ فسادات جیسے موضوعات بھی اخترالایمان کی شاعری میں موجود ہیں۔ تقسیم وطن اور وقتاً فوقتاً پھوٹ پڑنے والے فرقہ وارانہ فسادات نے انسانیت کو جو نقصان پہنچایا، جس طرح عورتیں، بچے، جوان اور بوڑھے قتل کیے گئے، گھر اجڑے، آبائی گاؤں اور مکانات چھوٹے، انھوں نے حساس اور دردمند انسانوں بالخصوص ادیبوں، فنکاروں اور شاعروں کی آنکھوں کو اشک بار کیا ہے۔ اخترالایمان جو انسانیت کا درد اپنے دل میں رکھتے تھے، کہتے ہیں

فسادات دیکھے تھے تقسیم کے وقت تم نے
ہوا میں اچھلتے ہوئے ڈنٹھلوں کی طرح

شیرخواروں کو دیکھا تھا کٹتے
اور پستاں بریدہ جواں لڑکیاں تم نے
دیکھی تھیں کیا بین کرتے

(راہِ فرار)

اختر الایمان نے اپنی نظم 'پندرہ اگست' میں آزادی کی چھاؤں میں ہونے والی تباہی و بربادی کا منظر پیش کیا ہے، ایسے انداز میں کہ گویا حسین دوشیزہ سے وابستہ گہری یادوں کا کوئی گیت چھیڑ دیا ہو، لیکن اس کی آڑ میں انھوں نے جو طنز کیا ہے وہ واقعی دلوں کو چیرتا چلا جاتا ہے۔ انسانیت کی بربادی ہندوستان میں ہو یا ہندوستان سے باہر، اختر الایمان اس پر ماتم کناں نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے دوسری جنگ عظیم کے خطرناک نتائج اور ہولناکی کو بھی اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ اس تناظر میں ان کی نظم 'تاریک سیارہ' بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس نظم میں انھوں نے تمثیلی اور ڈرامائی انداز اختیار کیا ہے۔ نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

جانِ من حجلۂ تاریک سے نکلو دیکھو
کتنا دلکش ہے یہ رات میں تاروں کا سماں

اختر الایمان کی شاعری میں فنا و بقا، یقینیت و غیر یقینیت، تہذیب و معاشرت، سماج کی ناانصافی، جبر و استحصال اور عدمِ مساوات، حال و استقبال اور فکر و فلسفے جیسے موضوعات بھی شامل ہیں جو ان کی شاعری کے کینوس کو وسیع کر دیتے ہیں۔ اس نوع کے مضامین اختر الایمان نے مسجد، پرانی فصیل، ایک لڑکا، نقش پا، میرا نام، ناصر حسین جیسی نظموں میں شامل کیے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اختر الایمان کی شاعری زندگی کے بہت سے پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے اور زندگی کے سفر کی روداد بن جاتی ہے۔ کبھی ایسا لگتا ہے کہ وہ شاعری نہیں کر رہے ہیں، زندگی کو بیان کر رہے ہیں ایسی زندگی کو جس میں نشیب و فراز اور اتار چڑھاؤ ہیں، ان کی نظم 'پگڈنڈی' اسی قبیل کی نظم ہے۔ نظم میں زندگی کے کئی پہلو اجاگر ہوئے ہیں۔ زندگی بل کھاتی ہوئی، کبھی خوشی کے شادیانوں کی آوازوں اور مسرت کے قہقہوں کی روشنیوں سے گزرتی ہے، تو کبھی مایوسی اور شکست خوردگی کے گہرے احساسات سے دوچار ہو جاتی ہے۔ یہ نظم نہ صرف حقیقت کے مظہر ہے بلکہ تاثیر و غنائیت سے پُر بھی ہے۔ اشعار دیکھیے۔

انگڑائی لیتی، بل کھاتی، ویرانوں سے آبادی سے
ٹکراتی، کتراتی، مڑتی، خشکی پر گرداب بناتی
اٹھلاتی، شرماتی، ڈرتی، مستقبل کے خواب دکھاتی
سایوں میں ستاتی، مڑتی بڑھ جاتی ہے آزادی سے

امنگ، جذبہ، ولولہ، آگے بڑھنے کا حوصلہ انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ انسان نامساعد حالات کو بھی اپنے حوصلے اور جذبے سے اپنے موافق بنا لیتا ہے۔ اونچائیوں کو چھونے کا حوصلہ بعض اوقات انسانوں کے اندر اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ انھیں یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ آسمانوں کو چھو لیں گے اور تارے توڑ لائیں گے۔ لیکن اس کے بعد یہ حوصلے پست بھی ہو جاتے ہیں، جذبات سرد پڑ جاتے ہیں، چلتے چلتے تھکاوٹ کا احساس ہونے لگتا ہے، ناکامی و مایوسی ہر چہار جانب سے آن گھیرتی ہے۔ اختر الایمان زندگی کی اس سچائی کو بھی بیان کرنے سے نہیں چوکتے۔ کہتے ہیں۔

جیون کی پگڈنڈی یونہی تاریکی میں بل کھاتی ہے
کون ستارے چھو سکتا ہے، راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے

اور بھی کئی نظموں میں اس طرح کے مضامین اختر الایمان نے بیان کیے ہیں۔ ان کی اس نوع کی نظموں کو پڑھنے کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ ان کے یہاں شکست خوردگی، محرومی اور مایوسی کا احساس زیادہ ہے۔ وہ ماضی کی شاعری کرتے ہیں، حال میں انھیں جاذبیت نظر نہیں آتی اور نہ وہ مستقبل سے پُرامید دکھائی دیتے ہیں۔ شاید وہ انسانوں کے حالات کو دیکھ کر ان کے اندر ایسی رمق نہیں دیکھتے کہ وہ ایک بار پھر اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکیں۔ نظم 'تنہائی میں' بھی کچھ اسی طرح کا تاثر پیش کیا گیا ہے۔ اسے اختر الایمان کی شاعری کی خوبی بھی کہا جاسکتا ہے اور خامی بھی۔ خوبی اس لیے کہ انھوں نے نہایت دردمندی سے اپنا اور قوم کا حال سنا دیا، خامی اس لیے کہ وہ حوصلے سے کام نہیں لیتے اور اکثر اپنے اردگرد یاسیت کا ماحول پیدا کر لیتے ہیں اور پھر اس سے باہر نہیں آتے۔ اقبال کی شاعری کا معاملہ اس سے جدا ہے، وہ زندگی کے حقائق کو کھول کر بیان کرتے ہیں، تہذیبی و اخلاقی اقدار کے زوال کا رونا بھی روتے ہیں، موجودہ نسلوں کی غفلت کی بھی نشاندہی کرتے ہیں، مگر اس کے باوجود وہ مایوس نظر نہیں آتے۔ وہ کہتے ہیں" ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی" اس کے برعکس اختر الایمان کی نظم 'پگڈنڈی' کا نچوڑ درج ذیل مصرع ہے۔

کون ستارے چھو سکتا ہے، راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے

ناموافق حالات کو سازگار بنانے کی خواہش اپنی جگہ، جذبات اور امنگوں کا اظہار بھی اپنی جگہ مگر حقیقت یہ ہے کہ کون ستارے چھو سکتا ہے راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے۔ یہ شاعر کا اپنا زاویۂ نظر ہے۔ ضروری نہیں کہ اس سے اتفاق کیا جائے۔ حوصلوں سے انسان نے کیا نہیں کر دکھایا، پہاڑوں کے درمیان سے راستے نکال لیے، سمندر کے سینے کو چیر کر اپنے لیے گزرگاہیں بنا لیں، انتہائی مستحکم قلعوں کو تسخیر کر لیا، شیطانی اور طاغوتی قوتوں کو پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ عہدِ رفتہ کی نسلیں ایسے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دے کر گزر چکی ہیں۔ عہدِ حاضر کی نسلیں گو کہ خوابِ غفلت میں پڑی ہوئی ہیں، لیکن اگر وہ بیدار ہو جائیں تو عین ممکن ہے کہ حالات مختلف ہوں۔ اختر الایمان موجودہ نسلوں سے مایوس ہو کر انھیں بیدار ہونے کی تلقین ہی نہیں کرتے بلکہ اور ہمت توڑ دیتے ہیں، لیکن اقبال آج کی نسلوں کی عیش پرستی اور مادیت پرستی کے باوجود مایوس نہیں ہوتے، اس لیے بھرپور جوش کے ساتھ انھیں جگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے، بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اختر الایمان کی شاعری کا مذکورہ انداز غالباً اس لیے ہے کہ وہ صرف شاعری کرتا ہے، جو کچھ دیکھتا ہے یا جس چیز کا احساس کرتا ہے، اسے بے کم و کاست بیان کر دیتا ہے، نہ کوئی نظریہ وضع کرتا ہے اور نہ اسے دوسروں پر تھوپتا ہے، وہ شاعری میں دیانت داری سے کام لیتا ہے۔ اختر الایمان نے شاعری کی زبان میں اپنے جذبات کی ترجمانی کی ہے اور خلقِ خدا کے احساسات کی بھی۔ اس نے شاعری میں جو کچھ پیش کیا ہے، وہ پورے سماج کے لیے آئینہ ہے جس میں انسانی سوسائٹیاں اور نئی نسلیں اپنی حرکات و سکنات کی تصویر دیکھ سکتی ہیں۔ اگر آئینہ دیکھ کر چہرے کی گندگی کو مٹانے کا ارادہ ہو تو لوگ اختر الایمان کی شاعری میں اپنے چہرے کو دیکھ کر اپنی صورت کو صاف کر سکتے ہیں۔ اس طرح اختر الایمان کی شاعری موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لیے درس بھی بن جاتی ہے اور اصلاح کا ذریعہ بھی۔ اپنی اصلاح کرنے کے لیے سب سے پہلے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک اس بات کی کہ اپنی کمیوں کا اعتراف کر لیا جائے، دوسرے اس بات کی کہ ان کمیوں کو دور کرنے کا عزمِ مصمم اور عمل کیا جائے۔ نیت خالص ہو جائے تو اصلاح کے راستے نکل آتے ہیں۔ اس کام کو اختر الایمان نے بخوبی انجام دیا ہے۔

موضوعاتی نقطۂ نظر سے اختر الایمان کی شاعری کے مطالعے کے بعد یہ بات بہت وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اختر الایمان کی شاعری کا موضوعاتی دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کی شاعری کے کچھ اہم اور خاص موضوعات پر مذکورہ سطریں لکھ کر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اختر الایمان کی شاعری پر موضوعاتی حوالے سے مستقل کام وقت کی ضرورت ہے۔

■

Dr. Yusuf Rampuri
Mohalla: Tandola, Tanda
Rampur - 244925 (UP)
Mob.:9310068594

داستان کی اسطوری فضا اور تخلیقی عمل

زاہد ندیم احسن

اس کائنات میں سب سے متحرک اور فعال کوئی چیز ہے تو وہ تخلیقی عمل ہے۔ قدرت نے اس کائنات کا نظام ہی تخلیقی عمل پر رکھا ہے۔ اگر ہم پوری کائنات پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ یہاں پر پائی جانے والی جتنی بھی مخلوقات ہیں وہ اپنے عروج و بقا کی فکر میں لگی رہتی ہیں۔ جس کے لیے وہ نو بہ نوع چیزیں خلق کرتی رہتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں نئی نئی تخلیقات معرض وجود میں آتی رہتی ہیں۔ انسانی تخلیق کا یہ عمل منصوبہ بند نہیں ہوتا بلکہ یہ عمل یکا یک ہو جاتا ہے یہ کوئی کسبی عمل نہیں ہے یہ ایک وہبی عمل ہے۔

اساطیر کو دنیا کا سب سے پہلا تخلیقی عمل مانا جاتا ہے۔ اس کرۂ ارض پر جب انسان نے قدم رکھا تو اپنے آس پاس کی چیزوں پر نظر ڈالی بڑے بڑے پہاڑ، اوران کے اندر سے دہکتے ہوئے لاوا کا نکلنا، ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر، ندیاں، طوفان، بارش، چاند، ستارے اور سورج کا طلوع اور غروب ہونا زندگی اور موت کے ہونے کا احساس۔ جب انسانوں نے غور کیا تو اس نے یہ محسوس کیا کہ کوئی ایسی قوت ہے جو اس کائناتی نظام کو چلا رہی ہے۔ اس کی اسی فکر نے بہت سے اساطیر کو جنم دیا اور انھوں نے اپنے انداز پر ان کی تجسیم کی اور ان کا نام دیا۔ اس سلسلے میں وزیر آغا رقم طراز ہیں:

''یہ (اساطیر) وہ ابتدائی تخلیق ہے جو ارتقا کے کسی مرحلے پر ایک تخلیقی انکشاف کی صورت میں انسان پر نازل ہوا اور جسے برقرار رکھنے کے لیے اسے مذہبی رسوم خلق کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ گویا ارتکاز اسطوری سوچ کا امتیازی وصف ہے۔ چنانچہ کیسرر کا خیال اس بات کی توثیق کرتا ہے کہ اسطور آفرینی ایک خالص تخلیقی عمل ہے، جو منطقی سوچ سے قطعاً مختلف ہے حقیقت یہ ہے کہ اسطور آفرینی وہ پہلا تخلیقی عمل ہے جو اپنی قوت اور پرواز میں آرٹ اور شاعری کے تخلیقی عمل کا ہم پلہ قرار پا سکتا ہے''

اساطیر کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں یونگ کے خیالات سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کیوں کہ اس کے خیال میں اسطور میں موجود سطحیں اور علامات اساسی نقش تشکیل دیتے ہیں یہ اساسی نقش اجتماعی لاشعور کا حصہ ہوتے ہیں۔ یونگ اجتماعی لاشعور کو روایتی قرار دیتا ہے جو نوع انسان کے ماضی کے تجربات ہوتے ہیں اور ہمارے وراثتی دماغ میں پیوستہ ہوتے ہیں۔ اجتماعی لاشعور اساسی نقوش کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی مثال دنیا کے داستانوی ادب سے لگایا جا سکتا ہے جس میں ہر قوم کی داستانوں میں مشکل سفروں، عزیزوں کی تلاش، آسمانوں کی طرف کوچ، موت سے نجات، مافوق الفطرت مخلوقات سے لڑائی پر مشتمل کہانیاں وغیرہ۔ اساطیر انسانی سائکی کا حصہ ہیں یہ آرکی ٹائپل امیج ہیں جو انسان کے اجتماعی لاشعور میں موجود رہتی ہیں اور نسل در نسل چلی آرہی ہیں جس کی وجہ سے معاشرتی سطح پر تمام قومیں ایک ہی نظر آتی ہیں اور اپنے قدیم آبائی تجربے سے اثرات قبول کرتی ہیں۔ اس کی مثال یونان اور روم کے اساطیری قصے ہیں۔ ان کے یہاں جو دیوی دیوتا ہیں دونوں اپنے اوصاف کی بنا پر ایک ہی طرح کے ہیں انھوں نے صرف نام بدل دیا ہے جیسے: جوپیٹر روم کا اور (زیئس) یونان کا رب الارباب مانا جاتا ہے۔ نیپچون روم کا اور (پوسیڈن) یونان کے سمندر کا حکم راں۔ پلوٹو روم کا (ہیڈیز) یونان کے تحت الثریٰ کا دیوتا مانا جاتا ہے اپولو دونوں جگہ ایک ہی نام سے جانا جاتا ہے عقل و دانش کا دیوتا ہے۔ ولیسٹا روم (ہسیٹیا) یونان میں گھر کے امن وسکون کی دیوی۔ اس کے علاوہ اور دیوی دیوتا جو یونان اور روم میں یکساں ہیں موجود ہیں جونو روم (ہیرا) یونان میں بچوں کی پیدائش کی دیوی۔ منروا روم (اتھینا) یونان عقل و دانش کی کنواری دیوی۔ ڈائنا روم (آرٹیمس) یونان میں عصمت کی دیوی وہ بچوں کی پیدائش کی نگراں بھی ہے اور اس کو چاند سے بھی منسوب کیا جاتا ہے۔ مرکری روم (ہرمیز) یونان میں دولت اور ثروت پر حکمرانی کرنے والا ذہین اور چالاک دیوتا۔ وینس روم (افروڈائٹی) یونان میں حسن ومحبت کی دیوی۔ کیرس روم (ڈیمیٹر) یونان میں ہریالی اور زرخیزی کی دیوی ہے۔ اسی طرح اور جگہ کی کہانیاں بھی ملتی جلتی ہیں۔ جہاں اسلام میں طوفان نوح کا ذکر ہے وہیں، ہندو دیومالا میں متسیہ اوتار کا ذکر ہے جس نے ایک طوفان کا ذکر کیا تھا اور نیک لوگوں کی جان بچائی تھی۔

اساطیر کے مذہبی نظریے کے مطابق اسطورہ کا وجود مذہبی رسوم سے منسلک ہے۔ اس کی سب سے انتہائی شکل میں یہ نظریہ ہے کہ رسومات کو بیان کرنے کے لیے اساطیر یا دیومالا ظہور میں آئے۔ یہ بات سب سے پہلے بائیبل اسکالر William Robertson smith نے اٹھائی۔ ماہر بشریات (Anthroplogist) جیمس فریزر (James Frazer) کا بھی Smith سے ملتا جلتا نظریہ ہے۔ وہ یہ مانتا ہے کہ اولین انسان جادوئی طاقت پر عقیدہ رکھتا تھا لیکن جب اس کا یقین اس سے اٹھ گیا تو اس نے دیوتاؤں کے اساطیر شروع کیے اور یہ بات کہی کہ اس کے پہلے جادوئی رسومات مذہبی رسومات تھیں جو دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے ہوا کرتی تھیں۔ کچھ مفکرین کا ماننا ہے کہ دیو مالا بے جان اشیا اور طاقتوں کی تجسیم سے وجود میں آیا ہے۔ ان مفکرین کے مطابق قدیم لوگوں نے قدرتی مظاہر جیسے آگ اور پانی کی عبادت کی جن کو آگے چل کر دیوتا کے نام سے موسوم کر دیا گیا۔

اساطیری کہانیوں میں مذہبی رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ وسیع مفہوم میں اساطیر ہر اس کہانی کو کہتے ہیں جو روایت کے بطن سے جنم لیتی ہو۔ اساطیر کی تخلیق عام طور سے اولین عہد میں ہوئی ہے جب دنیا نے اپنی موجودہ شکل حاصل نہیں کی تھی اور یہ واضح کرتی ہے کہ اس نے اپنی موجودہ شکل کیسے حاصل کی اور کیسے رسوم و رواج اور ممنوعات عام ہوئے۔ اس طرح اصطلاحی معنوں میں لفظ اساطیر ایسی کہانیوں کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے جن کا تعلق بنیادی طور پر حقیقت سے بعید ہو اور اس میں مافوق الفطری عناصر کی کارفرمائی ناگزیر سمجھی جاتی ہو۔ یعنی اساطیر میں تمام کرداروں کو غیر معمولی صلاحیت کا حامل بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

اساطیری کہانیوں میں اصل کردار عام طور سے ایسے مافوق الفطری ہیرو ہوتے ہیں جو انسان کی عملی زندگی سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ جن کا خیال یا تصور ہی کیا جا سکتا ہے اسے حقیقی زندگی میں اپنایا نہیں جا سکتا۔ مقدس کہانیاں ہونے کی حیثیت سے اساطیر کی توثیق پادریوں اور حکمرانوں کے ذریعے کی جاتی ہے اور مذہب یا روحانیت سے منسلک کی جاتی ہے۔ سماج میں یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ اساطیر عام طور سے ماضی کا صحیح بیان ہے۔

داستانیں بھی اساطیر سے بہت قریب ہیں کیونکہ اساطیری داستانیں روایتی کہانیوں کی مختلف قسمیں ہیں۔ اساطیر کی طرح داستانیں وہ بیانیہ ہیں جو روایتی طور پر صحیح تسلیم کی جاتی ہیں۔ داستانیں عام طور پر انسانوں کو اپنے اصل کرداروں کی حیثیت سے شامل کرتی ہیں جن کے کردار عام طور سے مافوق الفطرت عناصر پر قدرت رکھتے ہیں۔ اساطیر، لوک کہانیاں اور داستانوں کے درمیان امتیاز دراصل صرف روایتی کہانیوں کی درجہ بندی کا ہے۔ بہت سی تہذیبوں میں اساطیر اور داستانوں کے درمیان واضح لکیر کھینچنا مشکل ہے۔ کچھ تہذیبیں اپنی روایتی کہانیوں کو اساطیر، داستان اور لوک کہانیوں میں منقسم کرنے کے بجائے ان کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہیں۔ ایک وہ جو تقریباً لوک کہانیوں سے میل کھاتی ہیں اور دوسرا وہ جو اساطیر اور داستانوں کو ملاتی ہیں۔ اساطیر اور لوک کہانیوں میں پوری طرح فرق نہ ہونے کی وجہ سے یہ کسی سماج میں صحیح خیال کی جاتی ہیں اور کسی دوسرے سماج میں داستان تصور کی جاتی ہیں۔ دراصل جب ایک اساطیر مذہبی نظام کے حصے کے طور پر اپنی حیثیت کھو دیتا ہے تو وہ داستان اور لوک کہانیوں کی عام خصوصیت اپنا لیتا ہے۔ اس کا اولین الوہی کردار انسانی ہیرو، دیو یا پری میں بدل جاتا ہے۔

قصے کہانیاں گزرے ہوئے زمانے کے ان لوگوں کی کہانیاں ہیں جن کا ذکر ہماری مذہبی کتابوں میں ملتا ہے۔ چوں کہ ہمارے ان بزرگوں کی کہانیاں ہمارے لیے جذب و کشش کا سامان ہیں اس لیے ہمارے داستان گو اور کہانی نویسوں نے اپنی کہانیوں اور داستانوں میں ان کی تمثیلی صورت کو اپنا کر اپنی داستانوں کی بنیاد ڈالی اس کے لیے انھوں نے بہت سے مثالی کردار گڑھے جو حق پر رہتے تھے اور باطل کو شکست دیتے تھے۔ اس حق اور باطل کی لڑائی میں انھیں غیبی مدد بھی حاصل ہوتی تھی، کبھی نیک سیرت بزرگ اپنے معجزات کے ذریعے انھیں مدد کرتے اور کبھی طلسماتی جن یا پری سے انھیں مدد ملتی۔ اس خیر و شر کی لڑائی میں ہمیشہ خیر کی ہی فتح ہوتی جو کہ تمام مذاہب میں مشترک قدریں ہیں۔ اسی داستانی قصے اور اساطیر کے مابین رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے قاضی عابد لکھتے ہیں:

''حقائق کو گڑھ کر جو قصہ یا داستان منظر عام پر آتا ہے وہ اساطیر کا حصہ بن جاتا ہے۔ اساطیر اور داستانوں کی مدد کی مماثلت کا ایک مدار خیر و شر کی کشاکش اور پیکار ہے۔ مشہور مستشرق ہائزخ زمر نے اپنی کتاب 'بادشاہ اور سپاہی' میں قدیم اساطیر اور داستانوں کا مطالعہ اس دائرے کے اندر ہی کیا ہے۔ مشرق کی اساطیر ہوں یا یونان کی کلاسیکی اساطیر، داستان ہندوستان کی ہو عجم کی یا پھر شار لیمان اور شاہ آرتھر کی یہ کشاکش اور پیکر ہر طرف نظر آئے گی۔ مہابھارت، رامائن اوڈیسی ایلیڈ، الف لیلیٰ، طلسم ہوش ربا، داستان امیر حمزہ یہ سب اپنے اپنے ثقافتی حوالوں سے خیر و شر کے ایک معرکہ میں ڈھلے ہوئے ہیں۔''

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی تمام داستانوں میں جو قصے بیان کیے جاتے ہیں اس کے ڈانڈے کسی نہ کسی طرح اساطیر سے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ داستانوں میں عقائد، توہمات اور تہذیبی تفاخر کی کارفرمائی جس طرح سے نظر آتی ہے وہ ہماری داستان اور اساطیر کی بنیادی محرک بھی ہے اور اس کا مظہر بھی۔ داستانوں کے کردار میں انسانوں کے ساتھ ساتھ جن، دیو، بھوت پریت، عفریت یا انسانی جسم یا جانور کے سر والے کردار بھی موجود ہوتے ہیں۔ ان تمام کرداروں کا رشتہ دنیا کی مختلف قدیم اقوام کے اساطیر کا حصہ ہیں۔ اس طرح یہ بات اب زیادہ وضاحت طلب نہیں رہی کہ داستان اور اساطیر ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اس لیے جب داستان کا ذکر ہوگا تو اساطیر کا اس میں پایا جانا ناگزیر سمجھا جائے گا۔

اردو میں داستانوں کی تاریخ تو بہت پرانی ہے مگر باضابطہ طور پر اردو کی پہلی داستان ملا وجہی کی 'سب رس' کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ سب رس ملا وجہی کی طبع زاد داستان نہیں ہے بلکہ یہ فارسی کی مثنوی دستور عشاق اور نثری قصہ حسن و دل سے ماخوذ ہے جس کا مصنف محمد یحییٰ بن سیبک فتاحی نیشاپوری ہے۔ یہ داستان ملا وجہی نے عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر لکھی تھی۔

ملا وجہی نے تمام قصے کو تمثیلی پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس میں انھوں نے جن کرداروں کو پیش کیا ہے وہ انسانی نہیں ہیں بلکہ انسانی کیفیات جو غیر مجسم ہوتی ہیں انھیں کردار کا روپ دے کر پیش کیا ہے۔ کرداروں کے نام عقل، عشق، حسن، نظر، قامت، ہمت، رقیب، وہم، توبہ، ناز، غمزہ، عشوہ، زلف، لٹ اور وفا وغیرہ ہیں۔ جو کہ انسانی کیفیات اور حرکات و سکنات سے تعلق رکھتے ہیں۔ قصے میں شہر اور قلعوں کے نام جو ملا وجہی نے دیے ہیں وہ بھی عجیب و غریب ہیں جیسے تن کا قلعہ، ہجران نام کا قلعہ، ہدایت نامی قلعہ اور چاہ ذہن جس میں دل کو قید کیا جاتا ہے۔ شہروں کے نام شہر سیستان، شہر سبک سار، شہر دیدار، شہر عافیت جیسے نام ہیں جو کہ داستان میں ایک محیر العقول فضا قائم کرتے ہیں۔ وجہی نے اپنے اس قصے میں چن چن کر داستانوی رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں بھی دوسری داستانوں کی طرح قصے بیان کیے گئے ہیں۔ جس میں سحر و فسوں کا رنگ نمایاں ہے۔ قصے میں ایک جگہ لڑائی میں غمزہ دعائے سیفی پڑھ کر پھونک مارتا ہے تو توبہ کے تمام لشکر ہرنوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور چوکڑیاں بھرنے لگتے ہیں۔ دوسری جگہ شہزادی اپنے ہیرے میں نظر کو دل کی تصویر دکھاتی ہے۔ شہزادی کے پاس ایک حیرت انگیز انگوٹھی ہے جسے منھ میں رکھنے سے وہ شخص کسی کو دکھائی نہیں دیتا اور جس کے پاس یہ انگوٹھی ہوتی ہے اسے آب حیات کا چشمہ دکھائی دیتا ہے۔ قصے میں اسی انگوٹھی کو منھ میں رکھ کر نظر عقل کی قید سے رہائی حاصل کرتا ہے۔ اس طرح پوری داستان میں جگہ جگہ سحر اور فسوں کاری دکھائی دیتی ہے۔ داستان میں کرداروں کے نام جیسے توبہ، خواجہ خضر اور دوسرے نام جیسے آب حیات اسلامی عقیدے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو پوری داستان کا تانا بانا اسلامی اساطیر کے ارد گرد گھومتا دکھائی دیتا ہے اور پوری داستان میں ایک اسطوری فضا ابتدا سے اختتام تک چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔

اسی طرح باغ و بہار کے قصے اور اس کے کرداروں کا ہم جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تمام قصے ماورائیت سے مملو ہیں اس میں بیشتر کردار جو پیش کیے گئے ہیں وہ ہماری دنیا سے بالاتر دکھائی دیتے ہیں۔ درویشوں کی کہانیوں میں مہادیو کا منڈپ اس کا پجاری کہانی میں گنبد باغیچہ چشمہ ہرن آخری حصے میں کردار کا سمندر میں اترنا، برقع پوش رہنما کا مدد کرنا، چوتھے درویش کو جنوں کی مدد سے اقتدار کا ملنا، بیل پر سوار قاتل کا قتل کر کے روپوش ہو جانا اساطیری عناصر کا حامل ہے۔

حیدر بخش حیدری کی داستان آرائش محفل (قصہ حاتم طائی) بھی اساطیری عناصر سے پر ہے۔ اس داستان میں بھی جگہ جگہ ایسے واقعات پیش آئے ہیں جو اساطیری علائم کے ضامن ہیں۔ اس داستان میں سات سوالوں کو خلق کیا گیا ہے جسے پورا کرنے کے لیے حاتم طائی مختلف دشواریوں اور مصائب سے گزرتا ہے۔ حاتم طائی منیر شامی اور حسن بانو کی شادی کراتا ہے۔ ان تمام سوالوں کے جواب ڈھونڈنے میں بہت سے محیر العقول واقعات پیش آتے ہیں۔ جگہ جگہ دیو، جن، پری، جادو اور سحر کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جو کہ اس داستان کے پورے قصے میں ایک اساطیری فضا قائم کرتا ہے۔

اگر ہم 'مذہب عشق' کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے۔ یہ داستان بھی طبع زاد نہیں ہے جس کے مصنف نہال چند لاہوری ہیں بلکہ عزت اللہ بنگالی کے قصہ گل بکاؤلی کا آزاد ترجمہ ہے۔ چوں کہ داستان کا مقصد دلوں اور ذہن کو مسحور اور حیرت بخشنے کا ایک ذریعہ تھا اس لیے ان داستانوں میں ایسے ایسے عناصر کو پیش کیا جاتا تھا جو اساطیری کردار کے حامل ہوتے تھے۔

اس داستان کی پوری فضا میں حیرت واستعجاب، سحر اور ماورائیت اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ چھائی رہتی ہے۔ اس داستان میں پیش کردہ کردار اور واقعات ایک ماورائی اور محیرالعقول مظہر کے نمائندہ نظر آتے ہیں۔ اس میں دلبر بیسوا کی پالی ہوئی بلی اور چوہا، دیو، پری، سانپ اور بچھو کا پایا جانا اس کے ایک اساطیری داستان ہونے کا ضامن ہے۔

قصہ مہر افروز دلبر کی بات کریں جس کے مصنف عیسوی خاں ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اساطیری عناصر کی بہتات ہے۔ دلبر پریوں کی شہزادی ہے جس پر مہر افروز عاشق ہوتا ہے اس قصے میں خوش رنگ جانور کا پیچھا کرنا پھر ایک طلسماتی فضا میں پہنچ جانا قصے کے شہزادے کا شترمرغ کے انڈے کھانا یہ سب اساطیری عناصر ہیں جو اس قصے کی بنت میں شامل ہیں مافوق الفطری عناصر اور ایسے جانور جو نایاب ہوں اور جن کا تصور داستانوں اور صرف کہانیوں میں ہی موجود ہو اساطیر کے زمرے میں آتے ہیں۔

رانی کیتکی کی کہانی انشا اللہ خاں انشا کی طبع زاد ہے اس کا مرکزی کردار کنور اودے بھان اور رانی کیتکی ہے۔ رانی کیتکی کی کہانی کا خاص وصف مفرس اور معرب الفاظ سے عاری ہونا ہے۔ اس قصے میں تمام الفاظ ہندی کے ہیں۔ ادے بھان کے والد، والدہ اور اودے بھان کو راجہ جگت پرکاش کے ذریعے جادو سے ہرن میں تبدیل کردینا، داستان میں کرداروں کا بھبھوت لگا کر اوجھل ہوجانا، منھ میں گٹکے رکھ کر ہوا میں اڑنا اور آخر میں دیوی دیوتاؤں کی مدد سے کامیابی حاصل کرنے کا بیان ہندو اساطیر کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس طرح سے یہ پورا داستانوی قصہ ہندو اساطیر سے مملو ہے۔

'فسانۂ عجائب' مرزا رجب علی بیگ سرور کی داستان ہے۔ فسانۂ عجائب کی تصنیف کے سلسلے میں ادیبوں کا ماننا ہے کہ اسے سرور نے میر امن کی داستان 'باغ و بہار' کے مقابلے میں تصنیف کیا ہے۔ اس داستان میں بیان کردہ قصے کا جادوئی ماحول اور طلسماتی فضا، ساحر اور جادوگرنیوں کا پایا جانا، اسم اعظم اور لوح کلیم اور بہت سارے ایسے کردار جو کہ پوری داستان میں تحیر اور استعجاب کی فضا پیدا کرتے ہیں جو داستان کو ایک اساطیری داستان کے زمرے میں کھڑا کرتے ہیں۔ داستان میں دیو، پری، جانوروں کا انسانوں کی بولی بولنا، جادو سے انسانوں کا پتھر ہوجانا، شہزادی کے سر سے دریا میں خون کا گر کر لعل موتی میں تبدیل ہوجانا ایک ماورائی اور محیر العقول چیز نظر آتی ہے۔ جو کہ اساطیر کا ہی خاصہ ہے۔

متذکرہ بالا جن مشہور داستانوں کا ذکر میں نے قلت وقت کے سبب اختصار کے ساتھ کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ ایسی داستانیں ہیں جن کا ذکر میرے خیال میں نہ کیا جائے تو انصاف نہ ہوگا۔ ان میں الف لیلیٰ، عجائب القصص، بیتال پچیسی، سنگھاسن بتیسی، قصہ مادھونل کام کنڈلا، اور شکنتلا قابل ذکر ہیں۔ الف لیلیٰ اور عجائب القصص عربی الاصل داستانیں ہیں جب کہ بیتال پچیسی، سنگھاسن بتیسی، قصہ مادھونل کام کنڈلا اور شکنتلا سنسکرت الاصل داستانیں ہیں۔ الف لیلیٰ کی کہانی بھی مذکورہ داستانوں کی طرح ہی ہے۔ الف لیلیٰ میں جو کہانیاں پیش کی گئی ہیں ان میں جانوروں، جن، پریوں کی کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں میں طلسم اور جادو کا رنگ بھی نمایاں ہے اور جگہ جگہ ساحر اور ساحرہ بھی کہانیوں میں پائے جاتے ہیں۔ الف لیلیٰ کی کہانیوں میں بہت سی مخلوق بھی ہیں جو انسان کو آدھا پتھر کا یا گائے، چڑیا، گدھا، کتا اور ہرن وغیرہ بنا دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر گدھے والے مسافر کی کہانی، ہرنی والے بوڑھے کی داستان اور معذور نوجوان کی داستان کو لیا جاسکتا ہے۔ اس میں سند باد جہازی کے سفر کا قصہ بھی ہے اس میں بار بار جہاز ڈوبتا ہے اور ہر بار سند باد ڈوبنے سے بچ جاتا ہے۔ اس قصے میں آدم خور، دیونما انسان سامنے آتے ہیں۔ سفید انڈا، رخ نام کا ایک بڑا پرندہ بھی دکھائی دیتا ہے جو سند باد کو اڑا کر لے جاتا ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت ساری کہانیاں ہیں جس میں مابعدالطبیعات اور حیرت انگیز کردار الف لیلیٰ میں شامل ہیں جو کہ ہمیں ایک اساطیری جہاں کی سیر کراتے ہیں۔ اسی طرح عجائب القصص بھی ایسی داستان ہے جس میں بیان کردہ کہانی حیرت واستعجاب سے پر ہے اور اس میں بیان کردہ کردار ایک اسطوری کردار کے حامل نظر آتے ہیں۔

بیتال پچیسی اور سنگھاسن بتیسی جیسا کہ مذکورہ بالا سطور میں ذکر کیا جاچکا ہے کہ یہ داستانیں سنسکرت الاصل ہیں۔ ان داستانوں میں اساطیری عناصر کی کارفرمائی پورے آب وتاب کے ساتھ دیکھنے کو ملتی ہے اس تعلق سے ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

''بیتال پچیسی کی کہانیوں میں فوق فطری عناصر کم ہیں۔ دیومالا کے زیر اثر کچھ خلاف عادت باتیں ہوئی ہیں۔ مثلاً بکرم ایک چور ہے تعاقب میں ایک کنویں میں پہنچ جاتا ہے کئی جگہ مندر کی دیوی کا مجسم کسی بات پر خوش ہوکر بول پڑتا ہے مرے ہوؤں کو امرت چھل کر جیلا دیا جاتا ہے۔''

بیتال پچیسی عنوان ہی ایک اساطیری عنصر لیے ہوئے ہے۔ اس میں کل پچیس کہانیوں کا ذکر ہے۔ ہندو دیومالا کے مطابق بیتال بھوتوں کی اس نوع کو کہتے ہیں جو مرگھٹوں میں جہاں مردے جلائے جاتے ہیں وہاں بستے ہیں۔ پیش کردہ تمام کہانیوں میں جگہ جگہ ایسے واقعات جو ہندو اساطیر سے مطابقت رکھتے ہیں مثلاً، بنارس کے راجہ پرتاپ مکٹ کی کہانی، کشور برہمن کی بیٹی مدھومالتی کی کہانی، مہادیوی کی کہانی، جین نگر کے برہمن کے لڑکا کی کہانی میں جگہ جگہ اساطیری عناصر کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اسی طرح سنگھاسن بتیسی کے دیومالائی عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے گیان چند جین اپنی کتاب 'اردو کی نثری داستانیں' میں رقم طراز ہیں:

''ان کہانیوں میں دیومالا کا گہرا اثر ہے۔ بیتال پچیسی سے زیادہ پاتال، اندر لوک، اندر، سمندر، دیوتا، چاند دیوتا، شیو، شیش ناگ، جم کے دوت، دیوی گندھر، یہ سب بار بار نمودار ہوتے ہیں۔''

گیان چند جین کے قول کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ تمام کردار جن کا ذکر انھوں نے کیا ہے وہ ہندو اساطیر سے ملتے ہیں۔ دراصل داستان اور اساطیر ایک دوسرے کے اندر اس طرح پیوست ہیں کہ دونوں کا الگ ہونا ایک مشکل امر نظر آتا ہے۔ ان کے علاوہ داستانیں جو اردو ادب میں پائی جاتی ہیں جن میں قصہ گل وصنوبر، سلک گوہر، پنچ تنتر، ہتوپدیش، کتھا سروپ ساگر، طلسم حیرت، اخوان الصفا جیسی داستانیں بھی ہیں جن میں دیومالا اور اسطور کی کارفرمائی پورے آب وتاب کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ مذکورہ بالا صفحات پر داستان اور اساطیر پر جو گفتگو ہوئی ہے اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ داستانوں میں اساطیری عناصر کی کارفرمائی کے بغیر داستانوں کا تصور ممکن نہیں۔ اس سلسلے میں یہاں پر قاضی عابد کا یہ قول قابل ذکر ہے:

''اردو داستان کا اساطیر کے ساتھ ایک اٹوٹ تخلیقی رشتہ ہے۔ داستانوں میں اساطیری علائم کے تخلیقی استعمال نے داستانوں کی معنویت کو گہرا کردیا ہے۔ ان علائم کی وجہ سے ان داستانوں کا مطالعہ نہ صرف انسان کا تہذیبی مطالعہ ہے بلکہ مابعدالطبیعاتی بھی۔ یہ سچ ہے کہ داستانوں کی گہری رمزیت کو اساطیر کی آشنائی کے بغیر پوری طرح نہیں سمجھا جاسکتا۔''

■

Dr. Zahid Nadim Ahsan
Guest Faculty, Dept of Urdu
Delhi University
Delhi - 110007
Mob.:9350924710

ماہیا ثلاثی اور تروینی

ایک جائزہ

شیخ احرار احمد

اردو کی تین مصرعی نظموں میں سب سے زیادہ مقبولیت ماہیا کو ملی، ثلاثی بھی زیرِ بحث رہی بعد میں تروینی معروف تو ہوئی لیکن اول الذکر دونوں صنفوں کی طرح مقبول نہیں ہو پائی۔ اس مضمون میں انھیں تینوں صنف کا جائزہ لینے کی سعی کی گئی ہے۔

ماہیا

'ماہیا' پنجاب کی ایک قدیم اور مقبول صنف ہے، اس کے آغاز وارتقا پر کوئی روشنی نہیں پڑتی کیونکہ پنجابی زبان میں اس کے نقوش لوک گیتوں میں پیوست ہیں، اس کی ابتدا اور موجد کے بارے میں تلاش وجستجو ممکن نہیں لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ماہیا پنجابی لوک گیت ہے، جسے شادی بیاہ اور خوشی کی تقریبات میں گایا جاتا تھا اور اب بھی یہ روایت وہاں برقرار ہے۔ پنجابی زبان میں 'ماہیا' کا لغوی معنیٰ 'ساجن'، 'معشوق' اور خاوند کے ہیں۔ 'ماہیا' تین مصرعوں کی ایک مختصر نظم ہوتی ہے۔ پہلا اور تیسرا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے۔ اس کی بحر اور ارکان مخصوص ہوتے ہیں، جس طرح رباعی میں چوبیس رعایتی آہنگ ہوتے ہیں اور ان میں سے چار آہنگ رباعی کے چاروں مصرعوں میں آسکتے ہیں، اسی طرح ماہیے کے بھی رعایتی آہنگ ہوتے ہیں۔ کندن لال کندن نے اس کے پہلے اور دوسرے مصرعے کے سولہ رعایتی آہنگ نقل کیے ہیں جس کا بنیادی وزن بحر متدارک مسدس مخبون رمخبون مذال ہے۔ اس وزن پر زحاف تسکین کے عمل سے سولہ رعایتی آہنگ بنتے ہیں۔ یعنی فعلن ۔فعلن ۔فعلن رفعلان، ارکان میں سے 'ع' کو ساکن و متحرک کرکے یہ آہنگ رونما ہوتے ہیں۔ ماہیے کے دوسرے مصرعے کا بنیادی آہنگ بحر متقارب مسدس اثرم مقبوض محذوف ر مقصور ہے (بحر متقارب: فعولن) یعنی، فعل ۔فعول ۔فعل رفعول، پر عمل تخنیق سے آٹھ رعایتی آہنگ بنتے ہیں جن میں سے کوئی بھی ایک آہنگ دوسرے مصرعے میں لایا جاسکتا ہے۔ اس طرح ماہیا میں ایک دائرے کی دو مختلف بحریں استعمال ہوتی ہیں۔ ماہیے کا اس طرح عروضی تجزیہ پہلے پہل کندن لال کندن نے کیا ہے اور ماہیے کے لیے یہ عروضی پابندی ضروری بتایا۔[1] ۔حیدر قریشی ماہیے کے وزن اور اس کی خصوصیت پر قدرِ سہل انداز سے روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

''جو ماہیا سہولت کے ساتھ، اپنے فطری بہاؤ میں ماہیے کی پنجابی دھنوں پر گایا، گنگنایا جاسکتا ہے وہ ماہیا ہے۔ جو اس معیار پر پورا نہیں اترتا وہ کلاسیکل موسیقی کا شاہکار ہوسکتا ہے۔ اعلیٰ ادبی فن پارہ ہوسکتا ہے لیکن ماہیا نہیں ہوسکتا۔''

(اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما، ص 17، حیدر قریشی، معیار پبلی کیشنز، دہلی، سنہ اشاعت: ندارد)

حیدر قریشی اپنے ماہیے کا مجموعہ 'محبت کے پھول' کو پنجابی ماہیے کے وزن کے مطابق اردو ماہیوں کا سب سے پہلا مجموعہ بتاتے ہیں۔ اس مجموعے کے پیش لفظ اور رسالے 'کوہسار' میں ماہیے کے تعلق سے چھڑی بحث سے پتا چلتا ہے کہ اردو میں ماہیے کے لیے ایک ہی دائرے کی دو بحروں کے وزن استعمال ہوتے رہے ہیں اور یہی دونوں وزن پنجابی ماہیے کے مطابق درست ہیں۔ وہ دونوں وزن ملاحظہ فرمائیں:

(1)

فعلن فعلن فعلن ۔ کچھ رشتے ٹوٹ گئے
فعلن فعلن فع ۔ برتن مٹی کے
فعلن فعلن فعلن ۔ ہاتھوں سے چھوٹ گئے

(2)

مفعول مفاعیلن ۔ مل مہکی فضاؤں سے
فعلُ مفاعیلن ۔ یار نکل باہر
مفعول مفاعیلن ۔ اندر کے خلاؤں سے

ان ماہیوں کے درمیانی مصرعے کو دیکھنے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں ایک ''سبب'' یعنی دو حرف کم ہیں۔ اور حیدر قریشی نے انھیں دونوں صورتوں کو درست

'ماہیا' پنجاب کی ایک قدیم اور مقبول صنف ہے، اس کے آغاز وارتقا پر کوئی روشنی نہیں پڑتی کیونکہ پنجابی زبان میں اس کے نقوش لوک گیتوں میں پیوست ہیں، اس کی ابتدا اور موجد کے بارے میں تلاش و جستجو ممکن نہیں لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ماہیا پنجابی لوک گیت ہے، جسے شادی بیاہ اور خوشی کی تقریبات میں گایا جاتا تھا اور اب بھی یہ روایت وہاں برقرار ہے۔

قرار دیا ہے۔[2]

سہ ماہی رسالہ 'کوہسار' دسمبر 1997 کے شمارے میں بعنوان 'ماہیے۔ایک مباحثہ' کے تحت ماہیے کی ہیئت اور اس کے وزن پر بحث ہوئی تھی جس میں شارق جمال نے کہا تھا کہ ماہیے کا یہ وزن، فعلن فعلن فعلن، میں ماہیے کی کوئی انفرادیت نظر نہیں آتی انھوں نے مفعول مفاعیلن رفعل (فاع) مفاعیلن رمفعول مفاعیلن کو ماہیے کا آہنگ بتاتے ہوئے کہا کہ ''اسی ایک وزن کا فروغ اردو ادب میں ہونا چاہیے''۔فرحت قادری نے ماہیے کے درمیانی مصرعے کو ساعت پر بوجھ گردانا ہے اور کہا کہ تینوں مصرعوں کو برابر کرکے ''اردو ماہیے'' کے نام سے فروغ دینا چاہیے۔ان تینوں مصرعوں کے برابر ہونے سے ماہیا 'ثلاثی' نہیں بنے گا کیوں کہ ماہیے کے لیے بحر مخصوص ہوتی ہے جس طرح رباعی کے لیے، اور ثلاثی کی کوئی بحر مخصوص نہیں ہوتی۔اس کے لیے انھوں نے رباعی اور قطعہ کی مثال دی ہے۔مناظر عاشق ہرگانوی نے ان دونوں حضرات کے مشوروں کی تردید کی ہے اور رسالہ 'گلبن' کے آنے والے 'ماہیا نمبر' کے مطالعے کا مشورہ دیا۔[3]

فرحت قادری کی رائے کی تردید میں مناظر عاشق ہرگانوی حق بہ جانب ہیں کیوں کہ 1980 کے قریب اردو میں ماہیا نگاری کی طرف ہمارے کچھ شعرا نے خاص توجہ کی اور پنجابی ماہیے کے وزن پر غور کیے بغیر لاعلمی میں تین یکساں مصرعوں میں ماہیا تخلیق کرنے لگے۔ 1990 کے قریب سب سے پہلے حیدر قریشی نے ماہیے کے اصل وزن کی طرف توجہ دلائی جس پر تینوں یکساں مصرعے کہنے والے شعرا نے ان کی اصلاح پر برہمی کا اظہار کیا۔حیدر قریشی نے نہ صرف اصل وزن پر توجہ دلائی بلکہ ان کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ماہیے کے تعلق سے ادبی رسائل میں وضاحتی خطوط اور مضامین چھپوائے اور پنجابی ماہیے کے وزن پر اردو میں اپنے تخلیق کردہ ماہیے پیش کرتے رہے۔اس طرح چند برسوں میں اردو ماہیا نگار شعرا کی اکثریت، حیدر قریشی کے بیان کردہ وزن پر یعنی اصل پنجابی ماہیے کے وزن پر اردو میں ماہیا تخلیق کرنے لگی۔[4]

شارق جمال کا تعلق ناگپور سے ہے اور فرحت قادری کا بہار سے جب کہ کندن لال کندن اور حیدر قریشی کا تعلق پنجاب سے ہے اور ماہیا پنجابی صنف ہے لہٰذا کندن لال کندن اور حیدر قریشی کی رائے زیادہ معتبر ہے۔

ابتدا میں ماہیے کا موضوع بھی غزل کی طرح عشقیہ تھا اور شادی بیاہ کے موقع پر مختلف انسانی جذبات کا اظہار ہوتا تھا پھر بتدریج اس کے موضوع میں وسعت آتی گئی اور غزل ہی کی طرح اس نے بھی زندگی کے تمام موضوع کو اپنے اندر جذب کرنا شروع کردیا۔

اردو میں ماہیے کی ابتدا، 1936 میں فلم 'خاموشی' سے ہوتی ہے اور اس کے تخلیق کار ہمت رائے شرما ہیں۔فلم بک لیٹ پر مئی 1936 درج ہے۔اس فلم کے مکالمہ نگار اور کہانی کار امتیاز علی تاج تھے۔اس میں ہمت رائے شرما کے کل گیارہ ماہیے ہیں۔جس کا انکشاف سب سے پہلے مناظر عاشق ہرگانوی نے کیا اور حیدر قریشی نے تحقیق کرکے دریافت کیا اور قطعیت کے ساتھ ہمت رائے شرما کو اردو ماہیے کا بانی[5] قرار دیتے ہوئے ان کے ان ماہیوں کو اردو ماہیے کا اولین نقش بتایا ہے[6]۔ان کے اس دعوے کی تردید ابھی تک نہیں ہوسکی ہے۔

فلم 'خاموشی' کے لیے ہمت رائے شرما نے ماہیے، صرف لکھے ہی نہیں بلکہ گائے بھی تھے۔حیدر قریشی نے جن ماہیوں کو ایک سے چھ تک ترتیب وار ہونے کا قیاس کیا ہے وہ ہیں:

(1) سرمست فضائیں ہیں　(2) اشکوں میں روانی ہے　(3) کچھ کھو کر پاتے ہیں
پیتم پریم بھری　آنسوں پی پی کر　یاد میں ساجن کی
پھاگن کی ہوائیں ہیں　مدہوش جوانی ہے　یوں جی بہلاتے ہیں

(4) بھیگی ہوئی راتوں میں　(5) کیا اشک ہمارے ہیں　(6) دو نین چھلکتے ہیں
ہم تم کھو جائیں　آنسو مت سمجھو　ساجن آجاؤ
پھر پریم کی باتوں میں　ٹوٹے ہوئے تارے ہیں　ارمان مچلتے ہیں

باقی ماہیے حیدر قریشی کی کتاب میں درج ترتیب کے مطابق ہیں۔

(1) اک بار تو مل ساجن　(2) سہمی ہوئی آہوں نے　(3) کچھ کھو کر پائیں ہم
آکر دیکھ ذرا　سب کچھ کہہ ڈالا　دور کہیں جاکر
ٹوٹا ہوا دل ساجن　خاموش نگاہوں نے　اک دنیا بسائیں ہم

(4) یہ طرز بیاں سمجھو　(5) تارے گنواتے ہو
کیف میں ڈوبی ہوئی　بن کر چاند کبھی
آنکھوں کی زباں سمجھو　جب سامنے آتے ہو

ہمت رائے شرما 23 رنومبر 1919 کو ضلع سیال کوٹ (پنجاب) کے قصبہ نارووال میں پیدا ہوئے۔ان کے بڑے بھائی کیدار شرما اپنے زمانے کے ممتاز فلم ساز تھے۔شاید انھیں کے توسط سے ہمت رائے شرما بھی فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے اور صرف سترہ سال کی عمر میں فلم 'خاموشی' کے لیے نغمے لکھے۔ 1990 میں ان پر فالج کا حملہ ہوا اور کئی سال تک وہ اس کے زیر اثر رہ کر دنیا سے کوچ کیے۔

حیدر قریشی کی تحقیق سے بہت پہلے حمید نسیم نے (بقول حیدر قریشی)[7] کہیں لکھا تھا کہ سب سے پہلے اردو میں ماہیا چراغ حسن حسرت نے کہا ہے۔حمید نسیم کے مطابق جب ڈاکٹر تاثیر جنوری 1936 میں امرتسر کالج کے پرنسپل بن کر آئے تو انھوں نے ایک مشاعرہ کرایا تھا جس میں حسرت نے پہلی بار اردو میں ماہیا پیش کیا تھا اور پھر 1937 میں بنی فلم 'باغباں' میں بھی ان کے ماہیے شامل ہیں۔حیدر قریشی کی تحقیق سے جو بات سامنے آئی ہے وہ یہ کہ ڈاکٹر تاثیر جنوری نہیں بلکہ 20 رمئی 1936 کو پرنسپل بن کر آئے تھے[8]، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمت رائے شرما کے بعد ہی حسرت نے اردو میں ماہیا کہے ہوں گے۔فلم 'باغباں' میں حسرت کے لکھے ہوئے ماہیے کے نمونے ملاحظہ فرمائیں:

(1) باغوں میں پڑے جھولے　(2) ساون کا مہینہ ہے　(3) اب اور نہ تڑپاؤ
تم بھول گئے ہم کو　تم سے جدا ہوکر　ہم کو بلا بھیجو
ہم تم کو نہیں بھولے　جینا کوئی جینا ہے　یا آپ چلے آؤ

حیدر قریشی نے آخری دو بند کو ماہیا کہا ہے اور پورے بند کو ملا کر گیت تسلیم کیا[9]۔

فلم 'خاموشی' کے تقریباً بیس سال بعد فلم 'پھاگن' میں قمر جلال آبادی اور فلم 'نیا دور' میں ساحر لدھیانوی نے اردو ماہیے لکھے جو بہت مشہور ہوئے اور اسی بنا پر لوگ ان دونوں کے ماہیوں کو اردو کے اولین ماہیے سمجھ بیٹھے۔وہ مشہور ماہیا یہ ہیں۔

تم روٹھ کے مت جانا/ مجھ سے کیا شکوہ/ دیوانہ ہے دیوانہ

شاعر: قمر جلال آبادی۔فلم: پھاگن۔آواز: محمد رفیع اور آشا بھونسلے۔

دل لے کے دغا دیں گے/ یار ہیں مطلب کے/ یہ دیں گے تو کیا دیں گے

شاعر: ساحر لدھیانوی۔فلم: نیا دور۔آواز: محمد رفیع

قمر جلال آبادی اور ساحر لدھیانوی سے پہلے قتیل شفائی، فلم 'حسرت' (پاکستان) میں ماہیا پیش کر چکے تھے۔ 1980 کے بعد اردو میں ماہیا نگاری کی لہر چل نکلی جس میں چند شعرا کو چھوڑ کر زیادہ تر، ماہیے کے فن کو جانے بغیر ماہیے کے نام پر ثلاثی پیش کرنے لگے اور 1990 کے بعد حیدر قریشی کے توجہ دلانے پر اس کے فن کی طرف متوجہ ہوئے اور اردو میں پنجابی ماہیوں کے وزن پر ماہیا لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔

ماہیا تین مصرعوں اور مخصوص وزن کی مکمل نظم ہوتی ہے مگر اس کی ایک خوبی یہ بھی

ہے کہ ایک ہی موضوع کے کئی پہلو پر لخت لخت کئی ماہیے کہہ کر اسے ایک ساتھ رکھا جائے تو اس میں تسلسل اور ربط بھی ملے گا۔ اردو ماہیوں میں بھی اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں جیسے ہمت رائے شرما کے ماہیے ایک ساتھ ترتیب سے رکھے جائیں تو وہ سب ملا کر ایک نظم معلوم ہوں گے جب کہ وہ لخت لخت ہیں۔ اسی طرح حیدر قریشی نے بھی اپنے ماہیوں کے مجموعے میں ایک موضوع کے کئی پہلو پر ماہیے کہہ کر انھیں ایک عنوان کے تحت ترتیب دے دیا جس سے لگتا ہے کہ یہ سب ایک ہی نظم کی کڑیاں ہیں۔ نمونہ دیکھیں: 10

مرد	عورت	مرد	مرد-عورت
اس حال فقیری میں عمریں بیت گئیں زلفوں کی اسیری میں	زلفوں سے رہا ہو جا رب تیری خیر کرے جا ہم سے جدا ہو جا	کیا لطف رہائی کا دل جب سہہ نہ سکے دکھ تیری جدائی کا	ملنا ہو تو ملتے ہیں پھول محبت کے پت جھڑ میں بھی کھلتے ہیں

یہ ماہیے گو بظاہر مکالمے کی صورت میں ایک ہی نظم معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ الگ الگ وقتوں میں تخلیق ہوئے ہیں اور لخت لخت ہیں۔ پنجابی ماہیوں میں اس طرح تسلسل سے ماہیا کہنے کی روایت ہے۔ خاص کر کے شادی بیاہ کے موقعوں پر یا محبوب سے چھیڑ چھاڑ، گلہ شکوہ اور سوال و جواب کی صورت میں کئی ماہیے کی لڑیاں ایک دوسرے سے مربوط نظر آئیں گی۔

ثلاثی

ثلاثی، تین مصرعے کی مختصر نظم کو کہتے ہیں۔ عموماً اس کا پہلا اور تیسرا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے۔ تینوں مصرعے ہم وزن ہوتے ہیں، اس کے لیے کوئی ایک بحر مخصوص نہیں ہے۔ یہ تینوں مصرعے مل کر ایک مکمل معنوی نظام یا ایک اکائی بنتے ہیں۔ اسی طرح تین تین مصرعوں پر مشتمل کئی اکائیاں ایک مرکزی خیال کے تحت ایک ہی لڑی میں پروئی جاتی ہیں جسے مثلث کہا جاتا ہے۔ ثلاثی کو پہلے پہل مثلث اور تثلیث بھی کہا گیا۔ بقول حمایت علی شاعر بعد میں انھوں نے اسے ثلاثی نام دیا۔

حمایت علی شاعر خود کو اس صنف کا موجد بتاتے ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ''مٹی کا قرض پہلی بار 1974 کراچی سے، پھر دوبارہ 1980 میں کراچی ہی سے شائع ہوا۔ اس شعری مجموعے میں 'ثلاثی' کے عنوان کے تحت صفحہ تیرہ پر بالکل نیچے یہ مصرع ''یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری'' درج ہے۔ اس مجموعے میں کل چونتیس ثلاثیاں مختلف عنوانات کے تحت شامل ہیں۔ دو ثلاثیاں بطورِ نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

انکشاف	شاعری
مشتعل عالم تھے، باکمال تھے، اہلِ کتاب تھے	ہر موجِ بحر میں کئی طوفاں ہیں
آنکھیں کھلیں تو اپنی حقیقت بھی کھل گئی	پھر بھی رواں ہوں ساحلِ بے نام کی طرف
الفاظ کے لحاف میں ہم محوِ خواب تھے	لفظوں کی کشتیوں میں سجائے، متاعِ دل

(شاعر: حمایت علی شاعر، شعری مجموعہ: مٹی کا قرض۔ اشاعت دوم 1980۔ پاک کتاب گھر، اردو بازار، کراچی، پاکستان)

'حرف حرف روشنی' حمایت علی شاعر کا ہندوستانی ایڈیشن، اپریل 1986 میں مکتبہ جامعہ لمٹیڈ نئی دہلی نے شائع کیا۔ یہ مجموعہ ان کے تین شعری مجموعوں آگ میں پھول، مٹی کا قرض اور 'ہارون کی آواز' کا مختصر انتخاب ہے۔ اس مجموعے میں کل ستائیس ثلاثیاں ہیں یہ سبھی ان کے مجموعے 'مٹی کا قرض' میں شامل ہیں۔ اس مجموعے کے صفحہ 12 پر عنوان 'ثلاثی' کے نیچے قوسین میں لکھا ہے '(ایک نئی صنفِ سخن)' اور 'حرفِ مختصر' کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں:

''........ بالخصوص اس نئی صنف میں جسے میں نے مثلث کی رعایت سے 'ثلاثی' کا نام دیا ہے۔ 'ثلاثیاں' میں 1960 سے کہہ رہا ہوں پہلے اس کا نام تثلیث رکھا تھا مگر ایک مذہبی نظریے کی اصطلاح سے مناسبت پیدا ہو جانے کے سبب بہت جلد اسے ترک کر دیا اور اب 'ثلاثی' ہی کے نام سے یہ صنف موسوم ہے۔ ہیئت اور فن کے اعتبار سے میں اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوں اس کا فیصلہ بھی اہلِ ادب کریں گے۔''

(شعری مجموعہ: حرف حرف روشنی، ص 10، ہندوستانی ایڈیشن، اپریل، 1986، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ نئی دہلی)

اس قول سے یہ واضح ہوتا ہے کہ پہلے تثلیث پھر ثلاثی، یہ دونوں نام بھی حمایت علی شاعر کا ہی رکھا ہوا ہے۔ مذکورہ بالا تمام باتوں سے اس صنف کا موجد ہونے کا دعویٰ صاف ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے اس تجربے پر سب سے پہلا مضمون اثر فاروقی (مدیر: قومی محاذ، اورنگ آباد) کا ہے جو ماہنامہ، الشجاع، کراچی، پاکستان میں جون 1962 کو شائع ہوا۔ جس کے بعد چند ماہ تک بحث کا سلسلہ جاری رہا جس میں محسن بھوپالی، شورش کاشمیری، اثر لکھنوی، سلیم احمد اور خود حمایت علی شاعر نے حصہ لیا۔ اثر فاروقی کے مشورے ہی پر حمایت علی شاعر نے اس کا نام، تثلیث سے بدل کر ثلاثی رکھا۔[1]

محمد جمال شریف نے مثلث کے ضمن میں مولوی عبدالحق اور حکیم نعمانی کے حوالے سے خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی ایک مثلث کا نمونہ پیش کیا ہے[2]۔ اس نمونے کو کچھ شعرا اردو کی پہلی ثلاثی مانتے ہوئے حمایت علی شاعر کے بجائے خواجہ بندہ نواز گیسودراز کو ثلاثی کا موجد مانتے ہیں۔ مولوی عبدالحق اپنی تصنیف ''اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام'' میں، اس جملے کے ساتھ وہ نمونہ پیش کرتے ہیں:

''منجملہ ان کے ایک مثلث بھی ہے جو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔''[3]

او معشوق بے مثال نور نبی نہ پایا
اور نور نبی رسول کا میرے جیو میں بھایا
اپسیں اپیں دیکھارے کیسی آرسی لایا

مولوی عبدالحق نے مثلث کے ضمن میں یہ مثال پیش کی ہے۔ مثلث تین مصرعوں پر مشتمل کئی بند کی قدیم نظم ہے۔ مختلف مثلث کے مصرعوں میں قافیے کی ترتیب مختلف ہوتی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مولوی عبدالحق کو مثلث کے طور پر صرف ایک ٹکڑا ملا ہو یا پوری نظم ملی ہو جس کا صرف پہلا بند نمونے کے لیے پیش کیا ہو۔ اس مثلث کے علاوہ کوئی اور مثال ثلاثی کے ضمن میں نہیں پیش کی گئی، یہ دلیل کمزور ہے، لہٰذا جب تک تحقیق کی روشنی میں کوئی ٹھوس دلیل یا ثلاثی کا نمونہ نہیں ملتا تب تک حمایت علی شاعر کے دعوے کو مسترد کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

ثلاثی کے ضمن میں دوسرا سب سے اہم نام کوثر صدیقی (مدیر: سہ ماہی مجلّہ، کاروانِ ادب، بھوپال) کا ہے۔ اردو میں سب سے پہلا ثلاثی کا مجموعہ 'جیب میں پتھر' انھیں کا ہے۔ اس کے بعد 'بیچاری اردو' 2006۔ 'فصیلِ شب' اور 'ثلاثیات' ثلاثی کے مجموعے شائع ہوئے۔ آخر الذکر مجموعہ مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے شائع کرایا تھا۔ ان کے ثلاثی کے کل مجموعوں میں ثلاثیوں کی تعداد دو ہزار سے زیادہ ہے۔ اب تک اردو میں سب سے زیادہ ثلاثیاں انھوں نے ہی کہی ہیں۔ ان کا دوسرا اہم کام یہ ہے کہ انھوں نے ثلاثی کے لیے 1990 میں ایک فارم وضع کیا جس میں بحر خفیف سالم سے برآمد شدہ ارکان، فاعلاتن مفاعلن فعلن، کو ثلاثی کے لیے مخصوص کیا اور تینوں مصرعوں میں قافیہ کی ترتیب، ا۔ب۔ا، رکھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ 1990 کے پہلے تین مصرعی نظمیں جیسے، ہائیکو اور ماہیے کے مصرعوں کے ارکان معین ہیں لیکن زیادہ تر شعرا بلا لحاظ ان کے مصرعوں کو ہم وزن کر دیتے تھے اور تروینی جیسی صنف بھی متعارف ہو چکی تھی جس کی وجہ سے ثلاثی اور ان تین مصرعی نظموں میں شناخت مشکل ہو گئی تھی۔ اس فارم میں کوثر صدیقی کی ثلاثیوں

کے نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

☆

فرش و قالین مجھ سے لیتا جا
دور رکھ جھوٹی شان وشوکت سے
مجھ کو میری چٹائی دیتا جا

☆

تجربہ تو یہی بتاتا ہے
جب بھی فرعون سر اٹھاتے ہیں
کوئی موسیٰ ضرور آتا ہے

کوثر صدیقی کا وضع کردہ ثلاثی کا یہ فارم معقول ہے۔انھوں نے اس صنف کے لیے رواں دواں بحر کا انتخاب کیا ہے،شاید اسی لیے زیادہ تر شعرا نے اس سے اتفاق کیا اور اس فارم میں ثلاثی کہنے کی شروعات کی۔اس طرح ثلاثی کی ایک ہیئت اور شناخت قائم کرنے کا سہرا کوثر صدیقی کے سر ہے۔

تروینی

موضوع اور ہیئت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو تروینی اور ثلاثی میں ترتیب قوافی کے علاوہ کوئی فرق نہیں ہے۔گلزار کی تروینیوں کا مجموعہ'تروینی' میں 107 /تروینیاں ہیں جس میں سے زیادہ تعداد ان کی ہے جن کے تینوں مصرے معرا ہیں۔چند ایسی ہیں جن کا پہلا اور دوسرا مصرع ہم قافیہ اور تیسرا معرا ہے۔کچھ ایسی ہیں جن کا پہلا مصرع معرا ہے اور دوسرا،تیسرا ہم قافیہ۔اس کے علاوہ ایک اور فرق جو نظر آتا ہے وہ یہ کہ دوسرے اور تیسرے مصرعے کے درمیان فاصلہ رکھا جاتا ہے۔تروینی کے پہلے دو مصرعے ایک مکمل شعر ہوتے ہیں،تیسرا مصرع اضافی ہوتا ہے جو شعر کے مفہوم کی توسیع میں مددگار کی حیثیت رکھتا ہے۔اس مجموعے کی پہلی تروینی جو'بوسکی کے لیے' ہے اور باقی تروینیوں سے علیحدہ ہے،کافی اثر انگیز ہے۔

کچھ خوابوں کے خط ان میں، کچھ چاند کے آئینے،سورج کی شعائیں ہیں
شعروں کے لفافے ہیں، کچھ میرے تجربے ہیں، کچھ میری دعائیں ہیں

نکلو گے سفر پہ جب، یہ ساتھ میں لے لینا، شاید کہیں کام آئیں

(دوسرے مصرعے میں لفظ ''تجربے'' پر معلم عروض توجہ دے سکتے ہیں) چند نمونے اور ملاحظہ فرمائیں:

☆

چودھویں چاند کو پھر آگ لگی ہے دیکھو
پھر بہت دیر تلک آج اُجالا ہوگا

راکھ ہوجائے گا جب پھر سے اماوس ہوگی

☆

بھیگا بھیگا سا کیوں ہے یہ اخبار
اپنے ہاکر کو کل سے چینج کرو

''پانچ سو گاؤں بہہ گئے اس میں''

☆

شام گزری ہے بہت پاس سے ہوکر لیکن
سر پہ منڈلاتی ہوئی رات سے جی ڈرتا ہے

سر چڑھے دن کی اسی بات سے جی ڈرتا ہے

☆

لَو پھوٹی ہے اور کرنوں سے کانچ بجے ہیں
گھر جانے کا وقت ہوا ہے پانچ بجے ہیں

ساری شب گھڑیال نے چوکیداری کی ہے!

گلزار اسے ایک نئی صنف کہتے ہوئے خود کو اس کا موجد بتاتے ہیں۔انھوں نے 73-1972 سے تروینی کہنی شروع کی اور ان کی تروینیاں ہندی میگزین'ساریکا' میں شائع ہوتی رہیں،اس وقت اس میگزین کے ایڈیٹر کملیشور جی ہوا کرتے تھے۔تروینی کی وجہِ تسمیہ کا خلاصہ وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''شروع شروع میں جب یہ فارم بنائی تھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ کس سنگم تک پہونچے گی۔تروینی نام اسی لیے دیا تھا، کہ پہلے دو مصرعے گنگا جمنا کی طرح ملتے ہیں اور ایک خیال،ایک شعر کو مکمل کرتے ہیں۔لیکن ان دو دھاراؤں کے نیچے ایک اور ندی ہے۔سرسوتی۔جو پوشیدہ ہے۔نظر نہیں آتی۔تروینی کا کام سرسوتی دکھانا ہے۔تیسرا مصرع کہیں پہلے دو مصرعوں میں پوشیدہ ہے،چھپا ہوا ہے۔''[1]

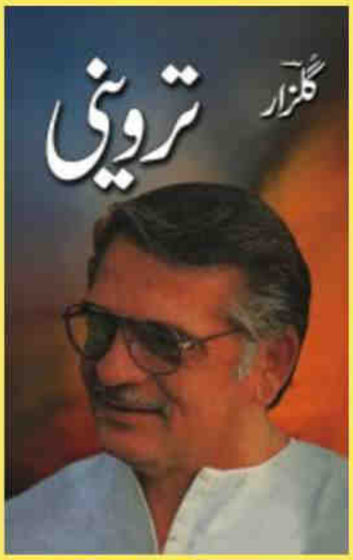

تروینی کا سب سے پہلا مجموعہ 'تروینی' کے نام سے 2001 میں شائع ہوا جس کے خالق گلزار ہیں۔اور اس مجموعے کے ذریعے انھوں نے تروینی کو ایک صنف کا مقام دینے کی کوشش کی۔اگر پہلے سے موجود کسی صنف کی خارجی ہیئت میں قافیوں کی خفیف سی ترتیبی رد وبدل سے کوئی نئی صنف وجود میں آتی ہے تو بلا شبہ تروینی ایک نئی صنف ہے اور گلزار اس کے موجد ہیں۔

بعد میں شارق جمال نے تروینی کے مصرعوں کے ارکان میں کمی بیشی کر کے تینوں مصرعوں کے لیے تین طرح کے اوزان،مربع،مسدس اور مثمن رکھ کر نو شکلیں بنائیں اور'تروینی اپنے صحیح عروضی فارم میں' عنوان کے تحت اپنی کچھ نظمیں رسالہ'کوہسار' جرنل، شمارہ نومبر 1998 میں اپنے نوٹ کے ساتھ شائع کرائی[2]۔اس کے بعد علیم صبا نویدی، کاظم نائطی،مناظر عاشق ہرگانوی کے علاوہ کئی اور شاعروں نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا۔

حوالے

ماھیا

1 ص25، 149، 150، 151، رباعیات وماہیے اور ماہیے کی ہیئت۔کندن لال کندن، اشاعت: 2008
2 ص9، پیش لفظ4 ص10۔10ص33۔34۔محبت کے پھول، حیدر قریشی، اشاعت: 1996، ناشر: نایاب پبلی کیشنز
3 ص12، 13، سہ ماہی'کوہسار جرنل'دسمبر 1997، مدیر: مناظر عاشق ہرگانوی
5 ص21، 6ص30، 7ص9، 8ص9، 9ص16، 17، اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما۔حیدر قریشی، معیار پبلی کیشنز، دہلی، سن اشاعت: ندارد

ثلاثی

1 ص233، اعتراف،۔مرتبین: صباحت سلمان/رومی جعفری، ناشر: دبستان بھوپال۔اشاعت: 2003
2 ص64۔دکن میں اردو شاعری ولی سے پہلے۔ڈاکٹر محمد جمال شریف۔ناشر: ادارۂ ادبیاتِ اردو، حیدرآباد۔اشاعت، 2004
3 ص15۔16۔مولوی عبدالحق۔اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام۔دوسری اشاعت: 1939، انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی

تروینی

1 گلزار،'تروینی' اشاعت: 2001، ناشر: روپا اینڈ کمپنی
2 اردو شاعری میں نئے تجربے، ص168، علیم صبا نویدی، اشاعت، فروری 2002، چنئی۔

■

Dr. Shaikh Ahrar Ahmad
7, Netaji Subhash Road
Charni Road (w)
Mumbai - 400002 (MS)
Mob.: 7498088534
Email.: ahrarazmi1978@gmail.com

محمد افروز عالم

اردو میں سائنسی ادب اور عصری تقاضے

تقریباً دوسو سال پہلے دہلی کالج میں اردو تعلیم کا ذریعہ تھی اور تمام عصری سائنسی مضامین اردو میں پڑھائے جاتے تھے۔ جیسا کہ مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب مرحوم دہلی کالج میں ذکر کیا ہے کہ 1825 میں دہلی کالج نے ایک غیر مذہبی تعلیمی ادارے کے طور پر کام کرنا شروع کیا جو جدید اور سائنسی علم فراہم کرنے کے لیے قائم کیا گیا۔ مشہور مستشرقین جیسے ایلویس اشپرنگر اور فیلکس بوٹروس دہلی کالج سے وابستہ رہے تھے اور انھوں نے سائنسی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنے کی ترغیب دی۔ انھوں نے بڑی تعداد میں سائنسی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کروایا اور ان کتابوں کو نصاب کا حصہ بنایا گیا کیوں کہ دہلی کالج میں ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ یہ سب کچھ 1835 کے بعد بدل گیا۔ جیسا کہ مولوی عبدالحق نے ذکر کیا ہے۔

ابتدائی طور پر 1800 میں کلکتہ میں قائم شدہ فورٹ ولیم کالج کے ادیبوں اور اساتذہ نے اردو میں سائنسی اور تکنیکی موضوعات پر کتابیں لکھنا شروع کیں، لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر نہیں چل سکا۔ دہلی کالج کے بعد، 1918 میں قائم کی گئی عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد دکن، ایک ایسا ادارہ تھا جہاں انجینئرنگ اور طب سمیت تمام اعلیٰ تعلیم کے لیے اردو ذریعہ تعلیم تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی اور کچھ دوسرے اداروں کو، جنھیں سابقہ ریاست حیدرآباد دکن کے حکمرانوں نے قائم کیا تھا، یہ اعزاز حاصل ہے کہ انھوں نے ہزاروں اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ کیا اور سائنسی، فنی اور تکنیکی موضوعات پر ہزاروں کتابیں شائع کیں۔ سائنسی اصطلاحات، سائنس اور ٹکنالوجی پر اردو میں ہزاروں کتابیں دستیاب تھیں۔ اس طرح کے کاموں کی مکمل فہرست سازی میں کئی جلدیں لگیں گی۔ لیکن ایک مختصر فہرست، جس میں ایسی سیکڑوں کتابوں کا تذکرہ ہے، ابواللیث صدیقی نے اپنی کتاب 'اردو میں سائنسی ادب' میں دی۔

خواجہ حمید الدین شاہد کے مطابق اردو میں سائنسی کام کی ابتدائی مثال بھوگ بال ہے، جسے شہاب الدین قریشی نے 1505 اور 1543 کے درمیان حیدرآباد دکن میں لکھا تھا۔ یہ ایک مثنوی تھی جس میں بعض امراض کے طبی نسخے شامل تھے۔ یہ نسخہ حیدرآباد دکن کے سالار جنگ میوزیم میں محفوظ ہے۔ 19 ویں صدی میں، حیدرآباد دکن کے حکمرانوں نے، جنھیں شمس الامرا کہا جاتا ہے، نے اردو میں لکھی گئی سائنسی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا۔

بعد میں اودھ کے حکمرانوں نے 1850 کی دہائی میں اودھ کے سقوط تک اردو میں لکھی اور شائع ہونے والی سائنسی کتابوں کی طباعت کی سرپرستی کی۔ سرسید احمد خان کی سائنٹفک سوسائٹی سے اردو میں کتابیں شائع ہوئیں۔ رڑکی انجینئرنگ کالج برصغیر کے قدیم ترین تکنیکی اور انجینئرنگ اداروں میں سے ایک ہے۔ برطانوی حکومت کی طرف سے 1840 کی دہائی میں قائم کیا گیا۔ اس نے اردو میں سائنس پڑھانے اور سائنس اور انجینئرنگ پر اردو میں کتابیں لکھنے اور شائع کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

سائنسی کتابوں کے مصنفین اور دیگر جو ماہرین تھے اور سائنسی علم رکھتے تھے، انھوں نے پوری توانائی مغربی کتابیں بالخصوص علوم کی کتابوں کی تالیف اور ترجمے میں صرف کردی۔ اس دور کے کام اردو زبان کی عظمت اور بتدریج ترقی کی عکاسی کرتے ہیں۔ اودھ کے بادشاہوں، دہلی کالج، سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ، انجمن پنجاب اور روڑکی کالج آف انجینئرنگ نے اردو زبان کی تاریخ میں عظیم انقلاب برپا کیا۔ حیدرآباد دکن سے تعلق رکھنے والے اردو کے عاشق اور دولت مند شہزادے محمد فخرالدین خان کی سرپرستی میں ریاضی، کیمیا، طب اور مغربی نظام طب کی کتابوں کی ایک بڑی تعداد (جن کی کل تعداد 30 تھی) 1832 سے 1860 کے درمیان شائع ہوئی۔

اودھ کے بادشاہوں کی سرپرستی میں علم کی مغربی شاخ کی کتابوں کے تراجم کی دوسری کوشش کی گئی۔ 1833 سے 1853 کے عرصے کے درمیان سائنسی علوم کی کتابیں مرتب کی گئیں۔ اسی طرح 1841 سے 1851 کے درمیان دہلی کالج میں تیسری منظم کوشش کی گئی۔ یہ کالج واقعی مشرق و مغرب کا سنگم تھا۔ اس کی نمایاں اور امتیازی خصوصیات یہ تھیں کہ علم کی مغربی شاخوں کی تدریس کا ذریعہ اردو تھا۔ دہلی کالج کے شعبہ تالیف و ترجمہ نے بہت سی سائنسی کتابیں مختلف سائز میں شائع کیں۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کالج نے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے میں اہم اور امتیازی کردار ادا کیا۔ 1873 سے 1877 کے درمیان مغرب کی بہت سی سائنسی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ رڑکی کالج آف انجینئرنگ نے 1856 سے 1888 کے درمیان اردو میں بڑی تعداد میں نصابی کتابیں شائع کیں۔ انجمن پنجاب نے بھی سائنسی کتابوں کے اردو ترجمے میں باوقار کردار ادا کیا۔

اردو ذریعہ تعلیم کے حوالے سے محمد شریف نظامی (2013، ص 166-143) لکھتے ہیں:

"گلکرسٹ (ایک انگریز) نے سب سے پہلے اردو کو فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں 1800 میں اپنایا اور اس میں متعدد قابل قدر تصانیف مکمل کروائیں۔ 1918 میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (دکن) میں اسے بطور ذریعہ تعلیم اپنایا گیا۔ سائنس، انجینئرنگ، آرٹس اور جملہ علوم، ایم اے، ایم ایس سی کی سطح تک، اردو میں ہی پڑھائے جاتے رہے۔ اس کے بعد 1927 میں میڈیکل کی تعلیم بھی اردو میں شروع ہوگئی اور 1948 تک کامیابی سے جاری رہا۔ انجینئرنگ کالج رڑکی میں 1935 میں ذریعہ تعلیم اردو ہی تھی۔ اسی طرح آگرہ میڈیکل کالج میں 1938 کے دوران، اردو اور انگریزی دونوں بطور ذریعہ تعلیم رائج تھیں۔ جامعہ ملیہ دہلی میں نصف صدی تک تمام علوم اردو میں پڑھائے جاتے رہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے ایک میڈیکل گریجویٹ کو ملٹری ہسپتال کا کمانڈنٹ آفیسر بنایا گیا اور اس کا اردو میں طب پڑھنا آڑے نہ آیا۔ 1935 میں برٹش میڈیکل کالج کونسل نے یہاں کے فارغ شدہ میڈیکل گریجویٹس کو برطانیہ میں براہ راست ایف آر سی ایس کا امتحان دینے کی اجازت دی۔ ان سب سے بڑھ کر چشم کشا امر یہ ہے کہ 1807 میں کلکتہ میڈیکل اسکول میں انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ 1818 میں لندن میں علوم مشرقیہ کا ادارہ قائم کیا گیا۔ جس میں اٹھارہ اردو تصانیف کی گئیں۔ 1855 میں یونیورسٹی کالج لندن، 1859 میں آکسفورڈ یونیورسٹی اور 1860 میں کیمبرج یونیورسٹی میں اردو کی تعلیم و تدریس شروع کی گئی۔ متعدد حضرات نے لندن یونیورسٹی سے اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگریاں بھی حاصل کیں۔ اسی طرح پروفیسر رالف رسل نے اردو کو برطانیہ میں مقبول بنانے کے لیے اس کے استاد شعرا پر کتب تحریر کیں۔ ملکہ وکٹوریہ اردو کی خوبیوں سے متاثر ہوکر اس کی اتنی شائق ہوگئی تھیں کہ اسے سیکھنا شروع کردیا۔ وہ بعض اوقات اپنی

ڈائری بھی اردو میں تحریر کیا کرتی تھیں۔"

لہٰذا بعض اداروں نے اردو کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے اختیار کرکے اردو کی لسانی اہمیت اور افادیت کے اعتراف کے لیے میدان ہموار کردیا۔ یہ ان اداروں کی بہت بڑی خدمتِ اردو تھی۔ اگر یہ ادارے وہ علمی وفنی خدمات انجام نہ دیتے تب بھی اردو ذریعہ تعلیم کے ادارے کی حیثیت سے مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ میں ان کا نام سنہرے حرفوں میں لکھا جاتا۔ ان میں سے پہلا نام دہلی کالج کا تھا۔

مولوی عبدالحق کی تحقیق کے مطابق مدرسہ غازی الدین کی ابتدا 1792 میں ہوئی۔ 1825 میں یہ مدرسہ کالج میں تبدیل ہوگیا اور دہلی کالج کے نام سے مشہور ہوا۔ مسٹر ٹیلر کی سفارش پر دہلی کالج قائم کیا گیا اور وہی اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ یہاں انگریزی زبان کی حیثیت ثانوی تھی۔ لیکن اہلِ دہلی کے اشتیاق کے پیشِ نظر انگریزی کی جماعتیں علیحدہ بھی قائم کی گئیں۔ دہلی کالج کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے اردو کے ذریعہ مغربی سائنس علم ہئیت، ریاضی، نیچرل سائنس، فلسفہ وغیرہ کی تعلیم کا انتظام کیا اور شمالی ہندستان میں سب سے پہلے مشرق اور مغرب کے صحت مند عناصر کو سمونے کی کوشش کی۔ دہلی کالج کی خدمات کے بارے میں ڈاکٹر صفیہ بانو (1978، ص 56) لکھتی ہیں:

"اس کالج نے نہ صرف اردو زبان میں تعلیم کی شاندار روایات قائم کیں بلکہ ایک اور نئی کشش جہت پیدا کی۔ تعلیم میں مادری زبان کی اہمیت، مشرق ومغرب کا امتزاج اور آزاد نقطۂ نظر کا اولین احساس اسی کالج نے پیدا کیا۔ رواجی تصورات سے نجات دلا کر ماضی کا تنقیدی شعور، حال کا نیا احساس اور مستقبل کی پذیرائی کی۔ اس کی اولیات میں تنقید شعروادب، ترجمہ و تاریخ، سیرت و سوانح، مضمون نگاری اور صحافت کو اہمیت حاصل ہے"۔

صدیق الرحمٰن قدوائی (1961، ص 46) لکھتے ہیں:

"1835 میں ایک مبارک کام یہ بھی ہوا کہ اردو زبان کی تعلیم وتکمیل کے لیے ورنا کیولر سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ مغربی علوم کو اردو زبان میں منتقل کرنے کے لیے قواعد وضوابط بنائے گئے اور مشہور مستشرق ڈاکٹر اسپرنگر کو اس کا نگراں مقرر کیا گیا"۔

ماسٹر رام چندر، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد، مولوی ذکاء اللہ، پیارے لال آشوب، صہبائی، کریم الدین جیسے مشہور ومعروف بزرگ اسی کالج کے طالب علم تھے، جنھوں نے نہ صرف اردو زبان کو نئے فکر ونظر عطا کیے بلکہ اپنی گراں قدر تصانیف سے اردو زبان میں گنج گراں مایہ کا اضافہ کیا۔

حیدرآباد دکن کے امرا میں نواب سالار جنگ بہادر اور ان کے خاندان کی تعلیمی خدمات بھی کافی اہم ہیں۔ 1856 میں ان کی ڈیوڑھی واقع 'پتھر گٹی' میں مدرسہ دارالعلوم جامعہ عثمانیہ کی ابتدا ہوئی۔ پہلے سال ہی وہاں طلبا کی تعداد 130 ہوگئی۔ چند سالوں میں مدرسہ نے جامعہ کی صورت اختیار کرلی۔ درسِ نظامیہ کی طرز پر وہاں تعلیم اعلیٰ درجات تک دی جانے لگی۔ قیام جامعہ کے وقت سے ہی اس میں سائنس اور فنون کے شعبوں میں تعلیم دی جانے لگی۔ اس کے علاوہ دینیات کا شعبہ علیحدہ تھا۔ تعلیمی شعبے ریاضی، انگریزی، تاریخ اسلام، تاریخ یورپ، معاشیات، فلسفہ ومنطق، طبیعات، کیمسٹری، عربی، فارسی، اردو، سنسکرت، مرہٹی پر مشتمل تھے۔ جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ کی ایک خاص اہمیت ہے جو تعلیمی لحاظ سے جامعہ عثمانیہ کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس بارے میں عرشیہ شفقت رضوی (1974، ص 123) لکھتی ہیں:

"جامعہ عثمانیہ نے ایک قلیل مدت میں ثابت کردیا کہ اردو ذریعہ تعلیم سے فارغ التحصیل طلبا کارگزاری کے اعتبار سے دنیا کی کسی یونیورسٹی سے پیچھے نہیں اور یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرکے جب وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے دنیا کے کسی ملک میں بھی جاتے ہیں تو زبان ان کے مقصد میں رکاوٹ ثابت نہ ہوئی۔ اردو میں پڑھنے والوں نے دنیا کی کسی یونیورسٹی سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرکے وہاں کے معیار کی بلندی کا لوہا منوالیا۔"

برصغیر میں طب مغرب (ایلوپیتھی) کی تعلیم وتربیت کا سب سے پہلا ادارہ مدرسہ طبابت حیدرآباد تھا۔ اس کا آغاز 1845 میں آصف جاہ رابع (ناصر الدولہ) کے دور میں حیدرآباد دکن میں ہوا تھا۔ اس کے نگراں اور کئی اساتذہ انگریز تھے۔ ڈاکٹر میکلین جارج اسمتھ، ڈاکٹر وڈ وغیرہ بعد میں اسی مدرسے کے مستفیدین میں سے مقامی حضرات بھی یہ خدمت سرانجام دینے لگے تھے۔ اس مدرسے کی خصوصیت کے حوالے سے حکیم سید محمود احمد برکاتی (1974-75، ص 265) لکھتے ہیں:

"ایک اہم خصوصیت اس مدرسے کی یہ تھی کہ اس میں ذریعہ تعلیم اردو تھی۔ انگریز اساتذہ بھی اردو میں درس دیتے تھے۔"

اس مدرسے کی طرف سے اسکول میگزین کے طور پر اردو میں ایک رسالہ بھی 1855 کے اواخر سے شائع ہونا شروع ہوا تھا جس کا نام رسالہ طبابت تھا۔ اس کے مدیر جارج اسمتھ تھے۔ یہ رسالہ اردو کا سائنس کے حوالے سے پہلا جریدہ تھا۔ اس مدرسہ نے جنوبی ہندوستان میں بڑا نام اور مقام پیدا کیا اور ایلوپیتھی پر چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں۔

اردو زبان میں سائنسی تراجم کا سلسلہ جاری رہا اور 1862 میں سر سید احمد خان کی 'سائنٹفک سوسائٹی' میں بھی شروع ہوگیا تھا۔ اس سوسائٹی کے تحت اردو زبان میں سائنسی اور معلوماتی مضامین نہ صرف انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیے جاتے تھے بلکہ نشستوں اور اجلاسوں کے دوران حاضرین کے سامنے پیش بھی کیے جاتے تھے۔ اردو زبان میں اصطلاح سازی سے متعلق پہلی باضابطہ کتاب 'وضعِ اصطلاحات' 1921 میں شائع ہوئی تھی۔

جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن میں تمام علوم کی تدریس اردو زبان میں کی جاتی تھی۔ جب کہ اس جامعہ کا ایک وسیع شعبہ تصنیف وتالیف یعنی دارالتصنیف بھی تھا جہاں اس مقصد کے لیے ہمہ وقت سائنسی وعلمی تراجم کا کام جاری رہتا تھا۔ اس شعبے کے لیے نظامِ دکن اپنی طرف سے ہر سال کئی لاکھ روپے دیا کرتے تھے۔ موجودہ وقت کے لحاظ سے یہ رقم دو یا تین ارب روپے سالانہ بنتی ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے دیگر شعبہ جات کے لیے مختص رقم اس کے علاوہ تھی۔

جامعہ عثمانیہ ہی کے تحت سائنسی ومعلوماتی اصطلاحات کے اردو تراجم کا سلسلہ بھی باقاعدگی سے کیا جاتا تھا، تاکہ انھیں درس وتدریس میں استعمال کیا جاسکے۔ ہندوستان کی آزادی تک تقریباً پانچ لاکھ سائنسی وعلمی اصطلاحات کا اردو ترجمہ کیا جاچکا تھا۔ ہندوستان میں صرف انھیں مکمل طور پر رائج کرنے کا مرحلہ باقی رہ گیا تھا۔

ڈاکٹر محمود علی سڈنی اپنی کتاب 'فلسفہ سائنس اور کائنات' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"ایک زمانے میں جامعہ عثمانیہ میں ایم۔اے، ایم ایس سی کے علاوہ انجینئرنگ اور میڈیکل کالج میں ذریعہ تعلیم اردو زبان تھی۔ ایم بی بی ایس کی پانچ سالہ تعلیم اردو زبان میں دی جاتی تھی اور امتحانوں کے سارے پرچے بھی اسی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ اردو زبان اس وقت بھی علمی زبان بن چکی تھی۔ عالم گیر جنگ دوم کے بعد تقریباً چار سو طلبا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ اور امریکہ کی جامعات میں بھیجے گئے تھے۔ ان ملکوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں کسی کو ذرا سی بھی دقت نہیں ہوئی اور سب نے اعلیٰ ترین ڈگریاں حاصل کیں۔" (ص،9)

اردو زبان کا سب سے پہلا سائنسی جریدہ، سہ ماہی 'سائنس' تھا، جسے 'انجمن ترقی اردو ہند' نے جنوری 1928 میں شائع کرنا شروع کیا۔

1843 میں ماسٹر رام چندر کی کوششوں سے Vernacular Translation society کا قیام عمل میں آیا۔ 1845 میں انھوں نے 'فوائد الناظرین' کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار شائع کیا جس میں سائنسی اور تاریخی خبریں ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ ستمبر 1847 میں ماسٹر رام چندر نے ایک ماہنامہ رسالہ خیر خواہ ہند جاری کیا۔ جسے نام بدل کر محبّ ہند کردیا گیا۔ اس میں سوانح، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، طبیعات سے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے۔

ماسٹر رام چندر نے اردو زبان کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا تھا اور اسے علمی اور سائنسی مزاج عطا کیا تھا۔ اردو میں سائنس اور ریاضی پر کئی کتابوں ترجمہ کیا۔ مثلاً رگھوناتھ کا رسالہ علم طبیعات، دیارام کا آسانی سائنس، چندر لال کا ارض النجوم، دیوی پرساد کی تلخیص الحساب، درگا پرساد کی علم الحساب، مکند لال کی علم کیمیا، ورون لال کی منطق قیاسی، جادو چندر چکرورتی کی علم ریاضی قابل ذکر ہیں۔

اس دور کے دیگر ناموں میں منشی ذکاء اللہ اہم ہیں جو کہ دہلی کالج کی ورنا کلر سوسائٹی کے روح رواں تھے۔ انھوں نے سائنس اور ریاضی کی تقریباً 160 کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا نیز اردو زبان میں معلوماتی مواد کے ترجمے کی بنیاد ڈالی۔

عصری تقاضے

گزشتہ چند دہائیوں میں بہت سے ادارے سامنے آئے ہیں جو اردو میں معلوماتی ادب اور سائنس و سماجی علوم کی مقبول کتابیں شائع کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ کتابیں عام معلوماتی اور سائنسی و سماجی علوم کے تصورات کو مثالوں، تصویروں اور واقعات کے ذریعے عام فہم زبان میں پیش کرتی ہیں۔ ان اداروں میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (NCPUL)، نئی دہلی سرفہرست ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارتِ تعلیم، حکومت ہند کا ایک خودمختار ادارہ ہے۔ جس کا بنیادی مقصد اردو زبان و ادب کا فروغ اور اس کے دائرہ کار کو وسیع کرنا ہے۔ عصری علوم کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنا اور اشاعت کرنا بھی اس میں شامل ہے۔ اردو کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے جدید ٹکنالوجی اور ذرائع معلومات کی مدد سے عصری علوم کی کتابیں ویب سائٹس پر بھی فراہم کی جارہی ہیں۔ قومی کونسل ادبی و اردو میں معلوماتی کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ رسائل و جرائد بھی شائع کرتی ہے۔ ان رسائل و جرائد میں تحقیقی و معلوماتی ادب کے ساتھ ساتھ معلوماتی سائنسی و سماجی علوم و تعلیم و تربیت کے مضامین بھی شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ اردو میں شائع ہونے کی وجہ سے عوام میں اور علمی حلقوں میں کافی مقبول ہیں۔ مثال کے طور پر اردو دنیا، خواتین کی دنیا، بچوں کی دنیا، فکر و تحقیق وغیرہ۔

اس کے علاوہ نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ (NCERT)، نئی دہلی بھی اردو میں نصابی و درسی کتابیں شائع کررہی ہے۔ جس سے نہ صرف طلبا کو آسانی ہورہی ہے بلکہ اردو میں معلوماتی ادب میں بھی اضافہ ہورہا ہے۔ مثلاً سائنس اور سماجی علوم کی کتابیں ہر جماعت کے لیے اردو میں شائع کی جارہی ہیں۔ جس سے اردو اصطلاحات کو بھی فروغ مل رہا ہے۔ اردو اساتذہ کی رہنمائی کے لیے مختلف جماعتوں کے لیے رہنما کتب کے علاوہ اردو زبان میں دیگر مضامین کی درسی کتب کے تراجم کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں دارالمصنفین اعظم گڑھ بھی مختلف موضوعات پر تنقیدی و تحقیقی تصانیف کی اشاعت سرگرم ہے۔

موجودہ وقت میں سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس اور تعلیم میں ان کے استعمال سے اردو میں معلوماتی ادب کی فراہمی بہت حد تک آسان ہوگئی ہے۔ مثال کے طور پر مختلف تعلیمی ویب سائٹس، فیس بک، ٹوئیٹر، آرکٹ، یوٹیوب، پوڈ کاسٹ وغیرہ کے ذریعہ عام معلومات کی فراہمی بھی آسان ہوئی ہے جس سے اردو ذریعہ تعلیم کو بھی فائدہ حاصل ہورہا ہے۔

وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا، ہر عہد کی نئی معلومات کو بیان کرنا اور علمی سطح پر خود کو مفید بنانا زبان کی بقا کی ضمانت ہے۔ زبان کی ترقی و ترویج میں ادب اور علم ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ عام طور پر جو زبانیں علمی کہی جاتی ہیں ان میں علوم کی اشاعت میں ایک تسلسل پایا جاتا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے ابتدا ہی سے یہ کوشش کی ہے کہ اردو کو اس لائق بنایا جائے کہ اس میں ہر طرح کے خیال کا اظہار ہوسکے اور وہ محض شعر و ادب کی زبان بن کر نہ رہ جائے۔ اردو کو تعلیم کی زبان بنانے کے سلسلے میں چند اداروں اور شخصیتوں کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ دلّی کالج، جامعہ عثمانیہ، ماسٹر رام چندر، ورنا کلر سوسائٹی، سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی، دارالترجمہ وغیرہ اہم تھے۔ اس دور میں بھی کئی سرکاری و غیر سرکاری ادارے اردو میں نئے علوم کو عام کرنے کی گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا ڈائریکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز مختلف علمی موضوعات پر درسی و نصابی کتابوں کے ساتھ ساتھ معلوماتی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام بھی کررہا ہے۔ تعلیم و تربیت کے متعلق عصری علوم کی تقریباً 17 کتابوں کی اشاعت ہوچکی ہے۔ دیگر مضامین میں بھی کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں سائنسی کتابیں بھی شامل ہیں۔

یہاں اردو ذریعہ تعلیم سے سائنسی علوم کے مختلف کورسز چلائے جارہے ہیں۔ شعبہ کمپیوٹر سائنس اور انفارمیشن ٹکنالوجی میں بی ٹیک، ایم ٹیک اور پی ایچ ڈی کے کورسز اردو میڈیم میں بحسن و خوبی چلائے جارہے ہیں۔ ساتھ ہی شعبہ ریاضی، طبیعیات، کیمیا، نباتات اور حیوانیات کے مختلف کورسز بھی اردو میڈیم میں چلائے جارہے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈپلوما انجینئرنگ پالی ٹکنک اور آئی ٹی آئی کے الگ الگ شعبوں میں بھی کئی کورسز چلائے جارہے ہیں۔ جس سے فارغ التحصیل طلبا ملک کے الگ الگ حصوں، ریاستوں، کمپنیوں اور سرکاری نوکریوں میں بھی منتخب ہورہے ہیں۔

ڈی ایل ایڈ اور بی ایڈ جیسے کورسز میں ریاضی، کیمیا، طبیعیاتی سائنس اور حیاتیاتی سائنس کے طلبا و طالبات بڑی تعداد میں کامیاب ہوکر ملک کے الگ الگ حصوں کے اسکولوں میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کورسز میں پڑھائے جارہے نصاب کے مطابق یونیورسٹی ان سائنسی مضامین کے لیے اردو میں مواد اور نصابی کتاب بھی تیار کررہی ہے۔ ساتھ ہی اس طرح کے کورسز میں زیر تعلیم طلبا کو درکار اردو کتابوں کی ضرورت کو ملک کے دوسرے اہم ادارے بھی پورا کررہے ہیں۔

حوالہ جات

1. مولوی عبدالحق، مرحوم دہلی کالج، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، 1989
2. ابواللیث صدیقی، اردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ، مقتدرہ قومی زبان، کراچی، 1981
3. خواجہ حمید الدین شاہد، اردو میں سائنسی ادب قدیم ترین کارنامے، سب رس، کتاب گھر، حیدرآباد، 1957
4. خواجہ حمید الدین شاہد، شمس الامراء کے سائنسی کارنامے، ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد
5. محمد شریف نظامی، اردو ذریعہ تعلیم، معارف مجلۂ تحقیق، جولائی–دسمبر 2013، ص 166-143
6. ڈاکٹر صفیہ بانو، انجمن پنجاب، کفایت اکیڈمی، اردو بازار، کراچی، 1978
7. صدیق الرحمٰن قدوائی، ماسٹر رام چندر، ادبی پرنٹنگ پریس، بمبئی، 1961
8. عرشیہ شفقت رضوی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، برصغیر پاک و ہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے، مجلۂ علم و آگہی، گورنمنٹ نیشنل کالج، کراچی، 1974
9. سید محمود احمد برکاتی، مدرسہ طبابت حیدرآباد، برصغیر پاک و ہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے، مجلۂ علم و آگہی، گورنمنٹ نیشنل کالج، کراچی، 1974
10. ڈاکٹر محمود علی سڈنی، فلسفہ سائنس اور کائنات، لاہور، 1995
11. ڈاکٹر عبدالمعز شمس، کاروانِ سائنس، علی گڑھ، 2019
12. مجیب الاسلام، دارالترجمہ عثمانیہ کی علمی اور ادبی خدمات اور اردو زبان پر اس کے اثرات، دہلی، 1987
13. مشتاق صدف، اردو نصاب تعلیم اور چند اہم ادارے (ساہتیہ اکادمی، قومی اردو کونسل اور نیشنل بک ٹرسٹ کے حوالے سے)، اردو دنیا، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ستمبر 2012، ص 27-26
14. https://www.rekhta.org/ebooks
15. https://www.urducouncil.nic.in
16. https://www.ncert.nic.in
17. https://www.manuu.edu.in
18. https://nbtindia.gov.in
19. https://sahitya-akademi.gov.in
20. https://www.researchgate.net

■

Dr. Md. Afroz Alam
Assistant Professor, MANUU
College of Teacher Education
Cahndanpatti, Laheriasarai
Darbhanga - 846002 (Bihar)
Mob.: 8885472844
Email: afrozmanuu@gmail.com

نواب یوسف علی خاں ناظم کے شعری کمالات

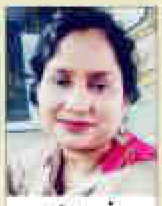

رشیدہ پروین

نواب یوسف علی خاں ناظم ریاست رام پور کے سربراہ بھی تھے اور کہنہ مشق شاعر بھی۔ آپ کے والد نواب محمد سعید بہادر اور والدہ فتح النسا بیگم تھیں۔ آپ 5 مارچ 1816 میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تعلیم بنارس، لکھنؤ اور دہلی میں ہوئی۔ 1840 میں والد ماجد کی مسند نشینی کے ساتھ ہی آپ بھی رام پور آگئے اور 1844 میں آپ کو گورنر جنرل کی طرف سے ولی عہدی کا خلعت پہنایا گیا۔ مسند نشینی کے وقت آپ کی عمر 39 برس تھی۔ 10 اپریل 1855 کو مسٹر الیگزینڈر ایجنٹ ریاست، کمشنر روہیل کھنڈ نے رام پور تشریف لاکر مسند نشینی کی رسم ادا کی۔ اور اس طرح آپ باقاعدہ ریاست کا کام انجام دینے لگے۔ امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

"آپ فنون سپہ گری میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، جسم مضبوط اور چہرہ نہایت خوش قطع تھا۔ داڑھی صاف اور مونچھیں باریک رکھتے تھے اور اس زمانے کے رواج کے مطابق اکثر رنگین و زرتار لباس زیب تن فرمایا کرتے تھے۔" (مکاتیب غالب، ص 2)

آپ عربی فارسی، منطق فلسفے سے خوب آگاہ تھے گفتگو بہت عمدہ کرتے تھے۔ ساتھ ہی طبیعت میں موزونیت اور سخن وری کا ذوق شروع سے ہی تھا۔ لکھنؤ میں امیر اور دہلی میں مومن، غالب اور شیفتہ جیسے بلند پایہ شعرا کی صحبت نے آپ کے ذوق شعر گوئی کو مزید جلا بخشی لیکن جب باقاعدہ شعر کہنے لگے تو مومن کی شاگردی اختیار کرلی۔ آپ صرف ایک حکمراں ہی نہیں بلکہ ایک قابل قدر اور خوش گو شاعر بھی تھے۔ اخبار الصنادید میں نجم الغنی لکھتے ہیں:

"شعر کے نکتہ شناس تھے طبیعت موزوں تھی اردو شعر کہنے کا شوق تھا۔ مومن خاں دہلوی سے پہلے مشورۂ سخن تھا پھر مرزا نوشہ سے تلمذ ہوا اس کے بعد مرحوم منشی مظفر علی اسیر لکھنوی کو کلام دکھایا۔ سب سے آخر میں امیر مینائی سے بھی شعر و سخن میں مشورہ رہتا تھا۔"

(ذکیہ جیلانی: کلیات ناظم، ص 22،23)

مومن کی صحبت کا اثر یہ ہوا کہ آپ نے متعدد غزلیں مومن کی زمین میں کہی مثلاً:

غیر سے دلدار خفا ہوگیا
ناوک بیداد خطا ہوگیا

بڑھتا گیا جو رشک تو اخلاص کم ہوا
چھینا عدو نے دوست کو یہ کیا ستم ہوا

وفا کی ہم نے اور تم نے جفا کی
تم اچھے ہم برے قدرت خدا کی

غدر کی تباہی نے عوام و خواص سبھی کو متاثر کیا شعرا کچھ بنگال، کچھ حیدرآباد، پٹیالہ اور دیگر ریاستوں کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ نواب یوسف علی خاں نے غالب کو رام پور بلالیا اور دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کردی۔ ذوق ہمیشہ شاگرد کی سنگ دلی کا رونا روتے رہے۔ نواب یوسف علی خاں ناظم کی خوش اخلاقی و قدر دانی نے ملک کے ہر حصے سے شعرا اور باکمال حضرات کو رام پور آنے کی دعوت دی۔ مظفر علی اسیر، مولوی فضل الحق خیرآبادی، منیر شکوہ آبادی، امیر مینائی، داغ دہلوی، مومن وغیرہ باکمال اور فنکار اہل دانش رام پور کی شعری بزم کا حصہ بن گئے۔

نواب یوسف علی خاں مومن کے بعد غالب کی شاگردی اختیار کی اس وقت وہ یوسف تخلص رکھتے تھے مگر غالب کے رابطے میں آئے تو پتہ چلا کہ حسن اتفاق سے غالب کے بھی نوابان رام پور سے دیرینہ تعلق تھے جب نواب یوسف علی خاں نے فضل حق خیرآبادی کے مشورے سے 1857 میں غالب کے نام اپنے خط کے ساتھ ڈھائی سو روپیہ بہ تقریب شیرینی اور کچھ کلام بہ غرض اصلاح ارسال کیا تو غالب نے اس کے جواب میں لکھا:

"میں نہیں چاہتا کہ آپ کا اسم سامی اور نام نامی تخلص رہے، ناظم، عالی، انور، شوکت، نیساں ان میں سے جو پسند آئے رہنے دیجیے مگر یہ نہیں کہ خواہی نخواہی آپ ایسا ہی کریں اگر وہی تخلص منظور ہو تو بہت مبارک زیادہ حد ادب۔

تم سلامت رہو قیامت تک۔" (دیوان ناظم، ص نمبر 17)

اس طرح یوسف کے بجائے ناظم تخلص پسند فرمایا۔ ناظم نکتہ رس، ذہین اور شوخ طبیعت کے مالک تھے روایتی مضامین کو بھی اپنے فنکارانہ انداز بیان سے نئے نئے پہلوؤں کے ساتھ پیش کرنے کا ہنر خوب جانتے تھے سلاست و روانی اور شگفتگی ان کی شاعری کا خاص وصف ہے۔ آپ کی زبان اہل لکھنؤ اور اہل دہلی کی مشترکہ زبان ہے، جس میں گنگا جمنی تہذیب و ثقافت کا سنگم خاص طور پر دکھائی پڑتا ہے۔

کیوں کہے کوئی کہ تم نے کیا کیا
کیوں نہیں کہتے کہ ہاں اچھا کیا

چلے ہو دشت کو ناظم اگر ملے مجنوں
ذرا ہماری طرف سے بھی پیار کرلینا

ان اشعار میں استاد غالب کا کچھ رنگ جھلکتا ہے۔ منشی ذو الفقار علی خاں گوہر رام پوری لکھتے ہیں: "ناظم نے جس قدر استاد کے رنگ کو نبھایا ہے دوسرے میں یہ مثال نہ ملے گی۔ ہمارے سامنے ذوق، داغ، مومن، تسلیم، شیفتہ، مظفر علی اسیر، حالی، ناسخ، آتش کے شاگرد موجود ہیں مگر مومن و تسلیم میں البتہ یک رنگی ایک حد تک ہے لیکن ایسی نہیں ہے جیسے ناظم اور غالب میں ہے۔ مومن اور شیفتہ میں بھی اس قدر مشابہت نہیں ہے۔" اس طرح ناظم کا کلام فطری اعتبار سے تو مومن کے قریب ہے مگر زبان و بیان کے لحاظ سے دیکھیں تو غالب کا رنگ نمایاں ہے۔

ہے لڑائی اب تو آؤ سامنے
صلح میں ہم سے بہت پردا کیا

میں نے جل کر بات کرنی چھوڑ دی
اس نے چپ رہنے کا بھی چرچا کیا

ناظم کی شاعری کا انفرادی رنگ اس کی شوخی و بانکپن اور معاملہ بندی ہے۔ جہاں ہجر و وصال کی تڑپ، ناز برداری کی چاہت، حسن و عشق کے معاملات لطف زبان کی مہک مکمل طور پر کلام کو پرکشش بناتی ہے۔ انھوں نے کہیں بھی اپنی انفرادیت کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ ان کی شخصیت ہر رنگ میں اپنی جلوہ نمائی کرتی ہے۔ ناظم نے جہاں کہیں بھی رعایت لفظی سے کام لیا ہے اس کا پاس و لحاظ بھی بخوبی رکھا ہے اور یہی خصوصیت ان کے کلام کو رونق بخشتی ہے۔

بوسہ عارض مجھے دیتے ہوئے ڈرتا ہے کیوں
لوں گا کیا نوکِ زباں سے تیرے رخ کا، تل اٹھا
کہتے ہو سب کہ تجھ سے خفا ہوگیا ہے یار
یہ بھی کوئی بتاؤ کہ کس بات پر ہوا

رعایت الفاظ نے ان اشعار کو نہایت خوبصورت بنا دیا ہے جس سے شوخی و بانکپن اور عاشقی کی چاشنی ہمارے احساسات کو مہکا رہی ہے۔

جب گزرتی ہے شبِ ہجر، جی اٹھتا ہوں
عہدہ خورشید نے پایا ہے، مسیحائی کا
شبستاں میں رہو، باغوں میں کھیلو مجھ سے کیوں پوچھو
کہ راتیں کس طرح کٹتی ہیں دن کیسے گزرتے ہیں

ناظم کے کلام میں مومن کی طرح تمام شعری لوازمات جیسے طنزیہ انداز، نوک جھونک اور مکر شاعرانہ جیسی خصوصیات بآسانی تلاش کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً دوست سے امید وفا پر کتنا زبردست طنز کرتے ہیں۔

اس سے ہے امیدِ وفا واہ واہ
خیر ہے ناظم تمھیں کیا ہوگیا
وفا کی ہم نے اور تم نے جفا کی
تم اچھے ہم برے قدرت خدا کی
ہر چند وصل غیر کا انکار جھوٹ ہے
کہنا پڑا لحاظ سے لیکن بجا مجھے
میں، اور چاہوں غیر کو، پر چاہتا ہوں یہ
پہنچے یہ چرچا کان میں اِن کے کسی طرح

ناظم کے کلام میں اگرچہ فلسفیانہ تخیل، حکیمانہ انداز، محرومی سے پیدا شدہ گداز، تصوف کا رچا ہوا ذوق نہیں ملتا، بر خلاف ناظم کے یہاں رجائیت، انبساط، سرمستی اور رنگینی رچی بسی ملتی ہے۔ مگر ایسا نہیں کہ تصوف سے ان کا کلام خالی ہے۔ جب کہیں بھی فلسفیانہ مضامین باندھتے ہیں دل پر اثر کرتے ہیں۔ ان کی شاعری عشق حقیقی کے ساتھ ساتھ عشق مجازی کی ترجمان ہے۔

کس کس کا کروں رشک کہ اس راہ گذر میں
ہر ذرہ مجھے دیدۂ بینا نظر آیا
آگیا دھیان میں مضمون تیری یکتائی کا
آج مطلع ہوا مصرع میری تنہائی کا

نواب یوسف علی خاں ناظم منطق اور فلسفہ کے ماہر تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر پڑھتے تھے۔ شاعری عہد و ماحول میں پرورش و پروان چڑھتی ہے حالات و ماحول کی پروردہ ہوتی ہے۔ دراصل ناظم کے پاس اپنے ہر جذبہ و خواہش کا ساز و سامان میسر تھا یہی وجہ ہے کہ وہ جذبۂ محرومی سے ناآشنا تھے وہ سوز و گداز اور روح کو تڑپا دینے والا احساس نظر نہیں آتا جو اس دور کے شعرا میں شدت کے ساتھ نظر آتا ہے اس بات کا اعتراف وہ خود کرتے ہیں۔

فروغ اہل سخن سوزِ غم سے ہے ناظم
جلے جو نخل تو، ہیں اس کے برگ و بار چراغ

لیکن اس کے باوجود اکثر اشعار میں زبان و بیان کے اعتبار سے فکری بصیرت کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

کم سمجھتے ہیں ہم خلد سے میخانے کو
دیدۂ حور کہا چاہئے پیمانے کو
وفا شعاری ناظم یقین نہیں، نہ سہی
یہ کون شخص ہے، اس کا بھی کچھ خیال نہیں
افسانۂ مجنوں سے نہیں کم میرا قصہ
اس بات کو جانے دو کہ مشہور نہیں ہے

ناظم کے کلام میں جگہ جگہ ایسے اشعار بکھرے ہوئے ہیں جن سے نوابی شان و شوکت، حکومت اور سماجی برتری کے احساس کا اظہار ہوتا ہے۔ شاعر نے بار بار اپنی جاہ و حشم اور طاقت و مرتبے کا احساس دلایا ہے۔ باوجود اس کے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری کے لیے طبیعت کا موزوں ہونا ضروری ہے امیر و غریب کی اس میں قید نہیں۔

غلطی غیر کی گفتار کی دیکھی ناظم
میں جو جاتا ہوں تو کہتا ہے نواب آتے ہیں
وہ اٹھے محفل سے ناظم مجھ کو آتا دیکھ کر
اور میں سمجھا کہ اٹھتے ہیں میری تعظیم کو

کیونکہ ناظم ایک ریاست کے مالک تھے لہٰذا دولت کا نشہ، حکومت پسندی اور خود بلندی کی جھلک کلام میں پایا جانا غیر فطری نہیں۔ باوجود اس کے وہ مبتلائے ملک و مال نہیں۔

قاصدوں کے انعام میں بٹ جائے نہ ملک
جلد جلد میرے ناموں کے جواب آتے ہیں
ناظم یہ انتظام رعایت ہے نام کی
میں مبتلا نہیں ہوں ملک و مال کا

ناظم اپنے زمانے کی روش عام سے ہٹ کر عشق مجازی کی ڈگر پر چلے ان کا محبوب اسی دنیا کا فرد ہے جس کے ہجر میں وہ بے چین ہوجاتے ہیں لیکن جب لذت وصل کا موقع آتا ہے تاب لانا مشکل نظر آتا ہے۔

وصل ہے عمر فزا کاش نہ ہو شادئ مرگ
حشر تک زندہ ہوں بچ جاؤں اگر آج کی رات
وہی معبود ہے ناظم جو ہے محبوب اپنا
کام کچھ ہم نہ مسجد سے نہ بت خانہ سے

ناظم اپنے کلام میں نادر تشبیہات و استعارات کا استعمال بڑی نازک خیالی کے ساتھ کرتے ہیں، وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی نہایت خوش اسلوبی سے پیش کرنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ جس کی بنا اکثر مضامین اچھوتے معلوم پڑتے ہیں جس سے کلام کی خوبی میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

رشتۂ شمع فروزاں ہے میری نبض طبیب
تو ہی جانے گا اگر ہاتھ لگایا تو نے
نخل وفا میں دیکھیے آتا ہے کیا ثمر
پیدا ہوئے ہیں گل کی جگہ اس شجر میں داغ

ایسی بے مثل تشبیہات و استعارات کو اگر اس طرح لطیف پیرائے میں سجایا جائے تو لذتِ کلام دوبالا ہوجاتا ہے۔

عیش کی ہجر میں بھی خو نہیں چھٹتی ناظم
ساغر بادۂ چراغ شبِ تنہائی ہے

شجر میں داغ، عیش کی ہجر، بادۂ چراغ شب تنہائی کی کیا خوبصورت تصویر کشی کی گئی ہے جو اپنے آپ میں بے حد نرالی ہے۔

اس طرح دیکھا جائے تو ناظم ایک بلند پایہ شاعر ایک کامیاب حکمراں اور علم و فن کا قدر دان نظر آتے ہیں جس کی اپنی ایک الگ شناخت ہے جن کے علم و فن اور حکمت و تدبر سے انسان دوستی کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کا دامن بھی وسیع ہوا یہی وجہ ہے کہ ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں 'اسٹار آف انڈیا' کا ایک خاص آرڈر قائم ہوا تھا، جس کے تحت یکم نومبر 1861 میں الہ آباد میں ایک شاہانہ دربار منعقد کیا گیا تھا جس میں مہاراجہ گوالیار، مہاراجہ پٹیالہ، بیگم بھوپال اور نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم کو 'اسٹار آف انڈیا' (ستارۂ ہند) کے تمغے سے نوازا تھا۔ رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

''نواب صاحب نے شعرائے دہلی اور لکھنؤ کو اپنے دربار میں جمع کر کے اردو شاعری کو گنگا جمنی کر دیا، یعنی ان دونوں طرزوں کو ملا کر ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی تھی۔''

(تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، ص 412)

1861 میں پہلی بار ان کا دیوان شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن ان کی وفات کے بعد 1869 میں شائع ہوا۔ رضا لائبریری میں ان کے دیوان کے 6 قلمی نسخے موجود ہیں۔ ان میں وہ نسخہ بھی شامل ہے جن پر غالب کے قلم کی اصلاحات ہیں۔ سب سے زیادہ اہم اور خوب صورت وہ نسخہ ہے جو خود یوسف علی خاں ناظم کی حسب ہدایت تحریر کیا گیا تھا۔ یہ مرصع نسخہ ہے، لائبریری کی انتظامیہ نے اس نسخے کو من و عن شائع کیا۔

سچ تو یہ ہے کہ ناظم کو خود اپنے شعری کمالات پر فخر تھا تبھی تو کہا ہے۔

جانا نظم میں ناظم! اسے میرا پیرو
کوئی مجھ سا اگر آجائے نظر میرے بعد

وفات کے بعد آپ کا لقب فردوس مکاں ہوا۔

■

Razia Parveen
Assistant Professor Urdu
Govt. Girls P.G College
Rampur-244901 (UP)
Mob.: 9457387505

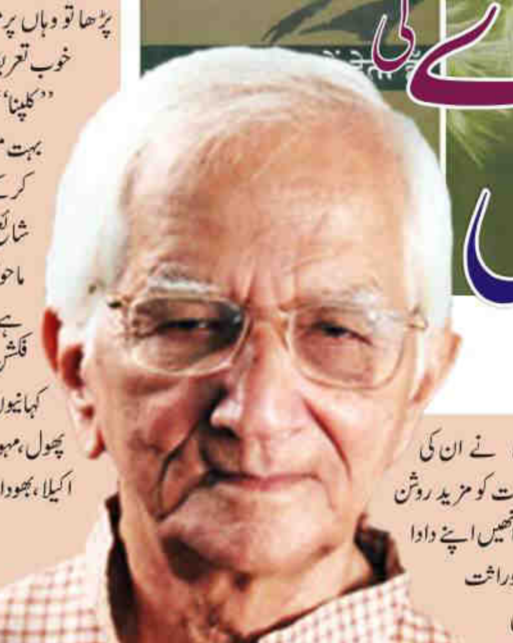

مارکنڈے کی کہانیوں کی تفہیم

شیو پرکاش

مارکنڈے کی ولادت اتر پردیش کے ضلع جونپور کے بَرائی نامی گاؤں میں 2 مئی 1930 کو ایک معمولی کسان خاندان میں ہوئی۔ اپنے خاندان میں سب سے بڑی اولاد ہونے کی وجہ انھیں حد درجہ لاڈ پیار ملا۔ اُن کے جد امجد مہادیو سنگھ کی شخصیت عظیم تھی۔ وہ سنسکرت کے بہت اچھے عالم تھے اور مذہبی توہم پرستی کے سخت مخالف تھے۔ مارکنڈے کے والد کا نام تعلقدار سنگھ تھا اور ان کی والدہ کا نام موہرا دیوی۔ ان کی والدہ نہایت رحمدل اور مذہبی خاتون تھیں۔ گاؤں میں غریب اور بے سہارا لوگوں کے تعاون میں وہ ہمہ وقت مصروف نظر آتی تھیں۔ ان کے اسی اخلاق برتاؤ کے بارے میں بال کرشن پانڈے لکھتے ہیں کہ ''جب وہ دلہن بن کر آئی تھی اور گھر کی چوکھٹ نہیں لانگھ سکتی تھی، اپنے گھر کے پیچھے ایک جھونپڑی میں رہنے والی بے بس اور مجبور عورت دُکھنا کو رات کا کھانا دے آتی تھیں۔ بعدازاں مارکنڈے نے اسی دُکھنا کو بنیاد بنا کر اپنا اہم افسانہ 'مہوے کا پیڑ' لکھا۔ مارکنڈے کے دل میں غریبوں کے تئیں جو لگاؤ، اپنا پن تھا وہ اُن کی رحمدل ماں کی دین تھی۔'' غریبوں کے تئیں ان کی ماں کا اخلاق اور برتاؤ مذکورہ اقتباس میں ہمیں صاف نظر آتا ہے۔

افسانہ نگار مارکنڈے کے والد تعلقدار سنگھ اپنے رشتے دار کی ایک چھوٹی سی ریاست کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ اپنے والد کے تئیں مارکنڈے کے دل میں حد درجہ ہمدردی تھی۔ میٹرک کی تعلیم مکمل کرنے سے قبل ہی مارکنڈے کو دل کا دورہ پڑا اور دوسری بیماریوں میں رفتہ رفتہ مبتلا ہوگئے۔ اس واقعے کے بعد ان کی زندگی کو گہرا صدمہ ہوا۔ دادا کی موت کے بعد مارکنڈے کی زندگی میں ایک گہری سنجیدگی پیدا ہوگئی۔ ذہن متحرک ہو گیا اور ایسی صورت حال میں مقدر نے سڑی گلی تعلق داری کے مابین لا کھڑا کر دیا جہاں انھوں نے عوام پر ہونے والے ظلم وستم اور ناانصافیوں کو دیکھا، لگان کی وصولی کے لیے ان کے ساتھ ہونے والے جانوروں سے بھی بدتر سلوک کو دیکھا جنھوں نے ان کی اخلاقیات کو مزید روشن کیا جو انھیں اپنے دادا سے وراثت میں ملی تھی۔ دادا کی موت کے بعد وہ اپنی آگے کی تعلیم کے لیے اپنے والد صاحب کے ساتھ پرتاپ گڑھ آگئے۔ انھیں کے لفظوں میں ''آٹھ دس سال کا وہ دور جب میں ایک معمولی کسان کے گھر سے نکل کر پرتاپ گڑھ اپنی ایک ریاست دار رشتہ دار کے یہاں آگے پڑھنے کے لیے چلا گیا تھا۔ اس ریاست کے منتظم میرے والد تھے۔ مارکنڈے کے دل میں جو آزاد ہندوستان کا خواب تھا اس کا بیج دادا نے بویا تھا۔ استحصال زدہ طبقے کے تئیں ان کے دل میں جو ہمدردی تھی وہ ان کے دادا اور ان کی ماں کی تربیت کی دین تھی۔

اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے مارکنڈے الہٰ آباد آگئے اور یہیں الہٰ آباد یونی ورسٹی میں اپنی تعلیم کو مزید جاری رکھا۔ جب مارکنڈے الہ آباد آئے تھے اس وقت یہ شہر ہندوستان کی ثقافتی راجدھانی کے طور پر مشہور تھا۔ یہیں پر ان کی ملاقات نرالا، پنت، مہادیوی ورما، رام کمار ورما وغیرہ متعدد ادیبوں سے ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ مارکنڈے نے امرکانت اور شیکھر جوشی کے ساتھ مل کر نئی کہانی کی تحریک کو نئی سمت عطا کرنے والی اس دوستی کو ایک نئی تثلیث کے طور پر تشکیل دی۔ الہٰ آباد میں مارکنڈے انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنسوں میں شرکت کرنے لگے جس میں متعدد طرح کی ادبی بحثیں ہوتی تھیں۔ مارکنڈے نے اپنی پہلی کہانی 'گلرا کے بابا' کو پڑھا تو وہاں پر موجود مصنفین اور ادیبوں نے ان کی خوب تعریف کی۔ اگلے مہینے ان کی یہی کہانی ''کلپنا'' نامی رسالے میں شائع ہوئی۔ اور بہت مقبول ہوئی۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے ان کی کہانیوں کے آٹھ مجموعے شائع ہوئے جن میں انھوں نے دیہی ماحول کے مسائل پر زیادہ لکھا ہے۔ انھوں نے پریم چند کے بعد ہندی فکشن کو ایک نئی زندگی عطا کی۔ آٹھ کہانیوں کے مجموعوں میں ''پان پھول، مہوے کا پیڑ، ہنس جائی اکیلا، بھودان، ماہی، سہج اور شُبھ اور بل یوگ کے علاوہ انھوں نے دو ناول 'شیمل کے پھول' اور 'اگنی بیج' لکھے۔ شیمل کے پھول میں جہاں انھوں نے نیلیما اور سُومنگل کے ناکام عشق کو پیش کیا وہیں 'اگنی بیج' میں گاؤں کی حقیقت کو نہ صرف پیش کیا ہے بلکہ مختلف مسائل کو بھی نشان زد کیا ہے۔ ہر تخلیق کار پہلے ایک شاعر ہوتا ہے اس کی تصدیق کے لیے مارکنڈے نے خود شاعری کی۔ ان کے دو شعری مجموعے ہیں۔ ان مجموعوں میں 'سپنے تمہارے تھے' اور 'یہ دھرتی تمھیں دیتا ہوں' شامل ہیں۔ مارکنڈے نے 'پتھر اور پرچھائیاں' کے عنوان سے یک بابی ڈراما بھی لکھا ہے۔ انھوں نے ایک تنقیدی کتاب بنام 'کہانی کی بات' لکھی۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی کالیداس، بان بھٹ، بھوبھوتی، بال پنچ تنتر اور ہتوپ دیش جیسے ادب اطفال بھی تخلیق کیے۔ اس کے علاوہ مارکنڈے نے 1960 میں 'کتھا' نامی اہم رسالے کی ادارت کی۔ ان کی ادارت میں 'کتھا' کے کل 14 شمارے منظر عام پر آئے۔ دیہی کہانی کار مارکنڈے ڈیڑھ دہائی تک کینسر اور قلبی بیماریوں میں مبتلا رہے۔ آخر کار 18 مارچ 2010 کو نئی دہلی کے روہنی کے ''راجیو گاندھی کینسر انسی ٹیوٹ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے مردہ جسم کو دوسرے دن الہٰ آباد لایا گیا جہاں ان کی آخری رسومات 19 مارچ 2010 کو ادا کی گئیں۔

ہندی کہانی میں مارکنڈے کو عموماً ایک دیہی کہانی کار کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ پریم چند کے بعد مارکنڈے نے ہندی کی افسانوی دنیا کو ایک نئے وژن سے دیکھا۔ اسی ضمن میں انھوں نے دیہی ماحول، عورتوں کی حالت، کسانوں کی بدحال حالت، بچوں کی نفسیات وغیرہ کو اپنی کہانیوں کا

موضوع بنایا ہے۔ہندی کہانی میں ان کی انفرادیت اور پہچان مسلم ہے۔اگر چہ مارکنڈے کے علاوہ شیکھر جوشی، امر کانت،موہن راکیش، کملیشور، راجندر یادو وغیرہ نے بھی اس عہد میں کہانیاں لکھیں لیکن دیہی زندگی کی حقیقت تک جتنی گہرائی تک مارکنڈے رسائی حاصل کر سکے ہیں وہ ان کا امتیاز بن گیا ہے۔ان کی کہانیوں میں بھلے ہی دیہی ماحول اور کسانوں کی بدحالی کی کتنی ہی زیادتی کیوں نہ ہو لیکن ان کا نرم دل بچوں کی معصومیت کو اپنی کہانیوں میں شریک کرنا نہیں بھولتا اور یہی وجہ ہے کہ ان کی بیشتر کہانیوں میں بچوں کی نفسیات پر سب سے زیادہ زور ملتا ہے۔

مارکنڈے نے اپنی کہانی کے مجموعوں میں دیہی ماحول میں حاصل سماجی، معاشی، سیاسی،ثقافتی مسائل کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔حصول آزادی کے بعد ادنیٰ طبقے کس طرح اعلیٰ طبقے کے پاؤں تلے روندے جاتے ہیں،کس طرح ان کے گھر کی بہو بیٹیاں اعلیٰ طبقوں کے مردوں کے استحصال کا شکار بنتی ہیں۔یہ ان کی کہانیاں واضح طور پر بیان کرتی ہیں۔اگر چہ مارکنڈے دیہی کہانی کار کے طور پر ہیں لیکن ان کی باریک نگاہ،ان کا طرز اسلوب اور ان کی واضح سوچ اپنے زمانے اور سماج کے گوشے گوشے تک وسعت رکھتی ہے۔ان کی کہانیوں میں حصول آزادی کے بعد کی سماجی،سیاسی،معاشی حالات کا من وعن انعکاس ملتا ہے۔

مارکنڈے کی کہانی کے مجموعوں کی کہانیوں کی قرأت کے بعد میرے دل ودماغ میں ان کی کہانیوں کی نئی جہات کے در وا ہوتے ہیں۔ان کے یہاں الگ الگ طرح کے جذبات ملتے ہیں۔مارکنڈے کے یہاں بچوں کی نفسیات کی مختلف زاویوں سے پیش کش ملتی ہے۔میرا خیال ہے کہ مارکنڈے کی دیہی حسیت،اور سماجی شعور وغیرہ کے پس منظر میں ان کی کہانیوں کی بحث اور تذکرہ تو بہت ہے لیکن ان کی کہانیوں میں زماں اور تناظر کا ابھی پوری طرح جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے۔بچوں کی نفسیات کا موضوع،کردار اور واقعات کی بحث یا مکالمے کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ان کی کہانیوں میں بچوں کی تربیت،رہن سہن،روایت،دیہی زندگی اور ثقافت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔موجودہ صارفی دور میں اور انفارمیشن انقلاب کے دور میں نئی نسل اور بچوں کی نفسیات کی تفہیم میں مارکنڈے کی کہانیوں سے ہمیں مدد مل سکتی ہیں۔یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ کسی بھی تخلیق کار کی تخلیق کی معنویت ہی اسے عہد ساز بناتی ہے۔لہٰذا مارکنڈے کو عہد ساز کہانی کار کہنے میں ہمیں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔

مارکنڈے بنیادی طور پر علاقائی تخلیق کار ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ فن اور زندگی ایک دوسرے سے ہم آمیز ہوتے ہیں۔وہ فن کے افادی پہلو کے قائل ہیں۔یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ کسی بھی فن پارے یا تخلیق کے مقاصد کو منہا نہیں کیا جا سکتا ہے۔دراصل فن ہمیں سماجی شعور عطا کرتا ہے۔اس بات سے ہم واقف ہیں کہ آزادی کے بعد ہندوستانی سماج اخلاقی گراوٹ، بے سمتی اور لایعنیت سے دو چار ہو گیا۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ادیبوں نے اپنی سماجی ذمے داری کو ایک چیلنج کے طور پر قبول کیا۔دراصل حالات کے پیش نظر اس چیلنج کو قبول کرنا بھی لازمی ہو گیا۔ سماج اور زندگی کے متعلق بنیادی مسائل بھی ابھر کر سامنے آ گئے۔دراصل ان مسائل کا حل ڈھونڈنا بھی انھیں ادبا کی ذمے داری تھی۔

مارکنڈے کا فنی نظریہ نہایت سنجیدہ ہے۔ان کے یہاں زندگی اور فن دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ تخلیق کار کو فن اور فن کی باریکیوں پر گہری نگاہ رکھنا چاہیے۔ یہی سنجیدہ عمل ایک تخلیق کار کا وصفِ خاص ہے۔فنکار،فن پارے کی تخلیق میں علامت اور استعارے کا استعمال بڑی ذمے داری سے کرتا ہے۔ دراصل کسی فن پارے کو ابعادی بنانے میں علامت اور استعارے کا اہم رول ہوتا ہے۔

مارکنڈے دیہی زندگی کے کامیاب کہانی کار ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں دیہی زندگی کے مختلف جہات کو پیش کیا ہے۔مارکنڈے کہانی میں متعدد اوصاف کے امتزاج کو لازمی تصور کرتے ہیں۔مارکنڈے کے مطابق 'ہمارے ملک کی ثقافتی اور جغرافیائی ساخت ایسی ہے جس کی وجہ سے ہر سو دو سو میل کے بعد عوام کے رہن سہن، بول چال،زبان میں تبدیلیوں کا رونما ہونا فطری بات ہے۔بالخصوص کسانوں میں یا گاؤں میں بسنے والی عوام میں یہ فرق واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔زمینی رشتوں میں بھیانک نابراری ہے۔مختلف حکمرانوں کے قوانین کا اثر اس پر واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔کہیں بٹائی داری ہے تو سرداری، کہیں تعلق داری ہے تو کہیں زمین داری۔

اسی طرح دیہی زندگی پر مبنی کہانی ایسی ہی تلاش کا نتیجہ ہے،جس میں زندگی کی نئی ابھرتی ہوئی حقیقتوں کو ماحول کے ساتھ پیش کرنے کی للک ہے۔جس نے کہانی کو مرنے سے بچایا ہے،اس کے ساتھ افسانے میں ایک نئی تازگی،سماجی ترقی کی نئی سچائی اور زبان کی ایسی طاقتیں آئیں،جنھوں نے کتھا کی دنیا کو ایک نئی دنیا سے ہمکنار کیا۔اسے مارکنڈے آزادی اور جمہوریت کی دین تصور کرتے ہیں۔اس طرح مارکنڈے کے مطابق بنیادی سوال 'کسی مخصوص علاقے کا نہیں ہے بلکہ نئی تخلیقیت کا ہے۔اس نظریاتی آگاہی کا ذکر یہاں اس نقطہ نظر سے بھی اہم ہے کہ مارکنڈے نے دیہی زندگی پر مبنی کہانیوں پر بھی کہانیاں لکھی ہیں۔اس سیاق میں ان کا 'ماہی' مجموعہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔

مارکنڈے نے تسلیم کیا ہے کہ نئی کہانی پر پریم چند کا کافی اثر ہے،اس سیاق میں ان کی تخلیقی نظر کا سب سے زیادہ اثر اس معنی میں نمایاں ہے کہ پریم چند کے بعد پہلی نئی کہانی کے دور میں ادیبوں نے اپنے سماجی سیاق کو کہانی کی راست بنیاد بنایا ہے۔تخیل کا کردار کم ہو گیا ہے۔ ہندی کہانی کا مخصوص رجحان سماج کی ترقی سے ہی جڑا ہوا ہے۔کہانی کیونکہ راست سماجی حقیقت سے جڑی ہوئی تھی۔اس لیے فطری پیرہن پہن کر متعدد ادیبوں نے اپنی تخلیقات کو حقیقی طور پر پیش کیا ہے۔

'ہنسا جائی اکیلا'،مہوئے کا پیڑ، پان پھول، بھودان، تاروں کا گچھا اور،ماہی وغیرہ افسانوں کے مجموعے ہیں۔اس میں دیہاتی زندگی اور اس کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ان کی کہانیاں زمین داروں کے تصادم، غریبی، ظلم وستم،کھوکھلا پن،خشک سالی وغیرہ موضوعات پر مبنی ہیں۔

'ہنسا جائی اکیلا' مارکنڈے کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔اس میں کل سات افسانے شامل ہے اور تمام کہانیاں دیہاتی زندگی سے متعلق ہیں۔یہ دراصل پریم چند کی روایت کی توسیع کر رہے ہیں۔اس روایت کے مدنظر مارکنڈے نے بدلتے ہوئے سماجی،سیاسی ماحول، بدلتی ہوئی زندگی کو تازگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔انھوں نے اس کہانی کے مجموعے کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ:''افسانہ نگار کے نقطہ نگاہ سے وچار کرنے پر، نئے پرانے عہد میں فرق کئی وجوہ سے کبھی کم اور کبھی زیادہ ہوتا ہے۔ان وجوہ میں کسی ملک کے عوام کی سماجی،سیاسی زندگی کی تبدیلی یا کسی مخصوص فرد کے اثر کا بھی حصہ ہو سکتا ہے۔کیوں کہ عوام کی زندگی ہی وہ زمین ہے جہاں ادیب/ فنکار اپنے تجربات کو پیش کرتا ہے اور عام زندگی کے محور پر اس کے مکالمے کی تعمیر ہوتی ہے۔جو ادیب جتنی گہرائی سے ان بدلتی بھاؤ بھومیوں کو پکڑ پاتا ہے وہ اتنی ہی شدت سے زندگی کے مکالمات کو جذب کر کے اپنے تجربات میں اضافہ کرتا جاتا ہے۔گاؤں کی کہانی لکھنا ہی فنی ذرائع کی نئی تلاش نہیں کہا جا سکتا ہے۔بلکہ گاؤں کی زندگی میں نئی بصیرت کو شامل کرنا اور وہاں کی زندگی کے متبدل سمت کو پرانی سمت میں دیکھ پانا ہی نئی کہانی کی تخلیق میں معاون ہو سکتا ہے۔

■

Dr. Shiv Parkash
Asst Prof.
Centre for Indian
Languages, School of Language,
JNU, New Delhi-110067

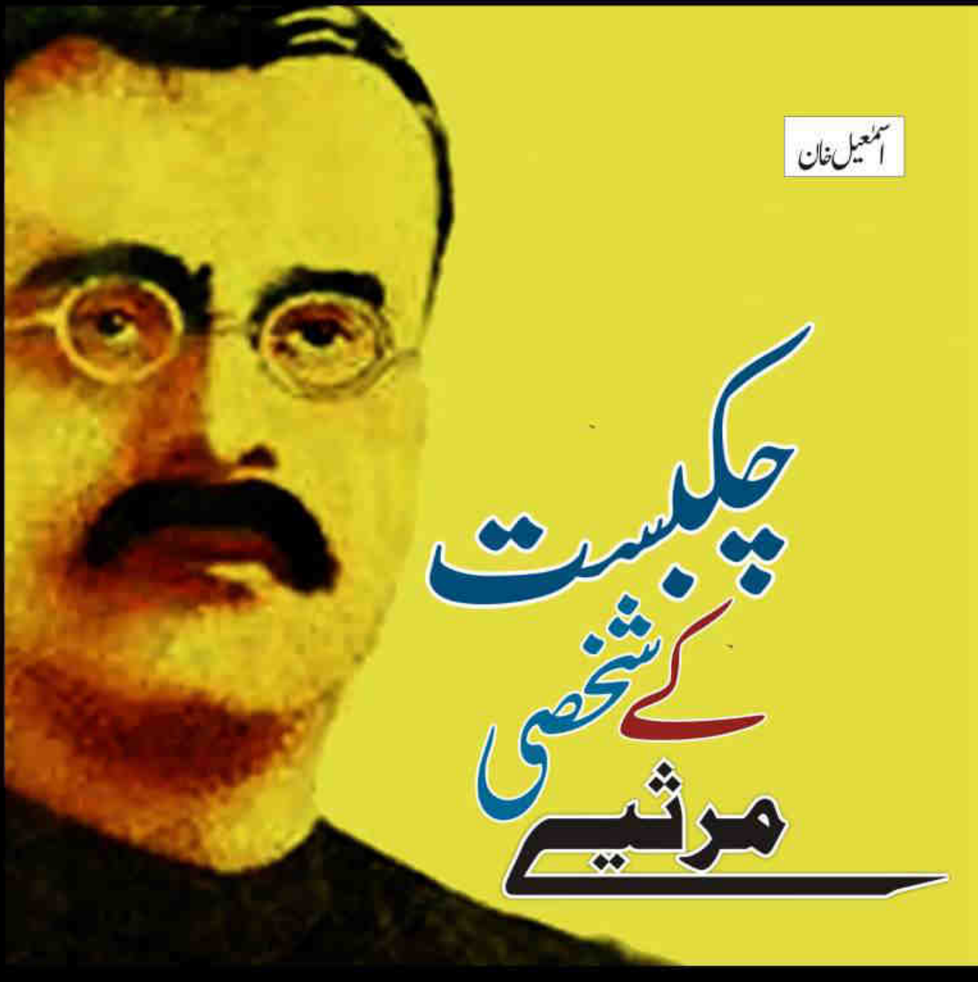

چکبست کے شخصی مرثیے

اسمٰعیل خان

کسی اہم شاعر، ادیب، سماجی کارکن، مصلح قوم، سیاست داں اور صاحب حیثیت شخصیت کا انتقال ہوجائے اور جس سے شاعر کے خصوصی وذاتی تعلقات ہموار ہوں، اس کی موت پر لکھی جانے والی شاعری شخصی مرثیہ کہلاتی ہے۔فنی طور پر شخصی مرثیے میں کردار نگاری، درد والم، غم و اندوہ کی کیفیت اور مرنے والے سے نجی تعلقات کا بیان نہایت فنکارانہ طور پر کیا جاتا ہے۔شخصی مرثیے میں کربلائی مرثیے کی طرح اجزاء ترکیبی نہیں ہوتے بلکہ سیدھے سادے انداز میں افسردگی کے جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔شخصی مرثیے کے لیے ہیئت کا تعین بھی ضروری نہیں ہے۔

اُردو شاعری میں غالب نے 'مرثیہ عارف' لکھ کر شخصی مرثیے کی بنیاد رکھی۔مومن نے اپنی محبوبہ کے انتقال پر مرثیہ لکھ کر اس روایت کو آگے بڑھایا۔اس کے بعد دہلی اور لکھنؤ کے بے شمار شعرا نے شخصی مرثیے کی طرف توجہ دی حالی نے غالب کی رحلت پر 'مرثیہ غالب' لکھ کر شخصی مرثیہ نگاری کو مزید وسعت بخشی حالی کے بعد سیماب اکبر آبادی، سرور، اقبال اور چکبست نے شخصی مرثیے کی روایت کو مستحکم کیا۔

چکبست کے شعری مجموعے 'صبح وطن' میں 9 شخصی مرثیے ہیں جن کے نام یہ ہیں: بشن نرائن در، گوپال کرشن گوکھلے، بال گنگادھر تلک، گنگا پرشاد ورما، اقبال نرائن مسلہ داں، نشتر یاس (تیج نرائن چکبست)، ماتم یاس (اجودھیا ناتھ آغا)، مہادیو گووند راناڈے، پرتاپ کرشن گرٹو

چکبست کی غزلیں ہوں یا نظمیں سبھی قومیت وحب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہیں۔ مذکورہ مرثیے بھی زیادہ تر انھیں افراد کے ہیں جن کا ملک وقوم وطن کی سیاسی، سماجی، قومی تحریکوں سے تعلق تھا۔جن کی وفات کے بعد وطن کو شدید نقصان ہوا۔ چنانچہ ان تمام مرثیوں میں چکبست نے انفرادی و اجتماعی درد والم، غم و اندوہ کو نہایت پر اثر انداز میں بیان کیا ہے۔

چکبست کے شعری مجموعے 'صبح وطن' میں شامل مرثیوں میں پہلا مرثیہ بشن نرائن در کا ہے۔چکبست کے مطابق 1890 کے درمیان پنڈت نرائن سے دہلی میں ان کی ملاقاتیں ہوتی رہی، جس کے بعد بشن نرائن سے ان کی عقیدت ایسی ہوگئی جیسے کسی شاگرد کو استاد سے ہوتی ہے۔ایک جگہ چکبست کہتے ہیں کہ:

''پنڈت بشن نرائن در نے، مجھ کو غور وفکر کا طریقہ بتلایا، مجھے ان کی علمی شاگردی کا فخر ہے اور ان کی خدمات میں نیاز حاصل ہونے کو ایک نعمت سمجھتا ہو۔

((چکبست ،ص30)

چنانچہ چکبست نے اس نعمت کے اُٹھ جانے پر اپنے غم کا اظہار اس طرح کیا ہے کہتے ہیں ۔

صدمہ عام یہ ہے قوم کا پیارا نہ رہا
بے زبانوں کی زباں دِل کا سہارا نہ رہا
گلشن علم وادب کا چمن آرا نہ رہا
مطلع دانش بنیش کا ستارا نہ رہا

(صبح وطن ،ص144)

اسی طرح بشن نرائن کی شخصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

روش عام سے تجھ کو نہ سروکار رہا
جو ہر خاص کا ہستی سے طلب گار رہا
گوکہ جنجال میں دنیا کے گرفتار رہا
اپنے دامن کو سمیٹے ہشیار رہا
رنگِ دنیا سے رہا عالم فانی میں جدا
جیسے لہروں سے کنور ہتا ہے پانی میں جدا

(ایضاً ،ص136)

چکبست کے مطابق بشن نرائن بے لوث شخصیت کے حامل انسان تھے۔پوری زندگی میں کبھی دنیا کی دولت سے رشتہ نہیں رکھا۔حرص و ہوس سے یہ بہت دور رہے، انصاف پسند، حق گو تھے، چنانچہ چکبست ان کی شخصیت کی خوبیوں کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں ۔

تجھ کو معلوم نہ تھا دولت دُنیا کیا ہے
حرص کیا شئے ہے زر و مال کا سودا کیا ہے
خود پرستی کا زمانہ میں تقاضا کیا ہے
عیش کیا چیز ہے راحت کی تمنا کیا ہے
دل محبت پہ فدا آنکھ مروّت سے غنی
تجھ کو دشمن کی بھی منظور نہ تھی دِل شکنی
مگر انصاف کے حق میں ہوا گرنیش زنی
پھر نہ تھا تجھ سے زیادہ کوئی جرأت کا دھنی

(ایضاً ،ص 136,137)

بشن نرائن سے جتنی عقیدت چکبست کو تھی اتنی ہی عقیدت انھیں گوپال کرشن گوکھلے سے تھی۔گوپال کرشن گوکھلے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کے قومی افق پر ابھرنے والی شخصیتوں میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ 1905 میں صدر کل ہند کانگریس منتخب ہوئے گوکھلے ملک کے عظیم سیاست داں ہونے کے ساتھ ماہر تعلیم بھی تھے۔ملک میں تعلیم کو خصوصی اہمیت دینے پر ہمیشہ زور دیتے رہے اور علم کی روشنی کے ذریعے ہندوستانی عوام کے سماجی اور سیاسی شعور کو بیدار کیا۔گوکھلے کے انتقال پر چکبست انھیں ہند کی قوم

کاسرتاج کہتے ہوئے اپنے غم کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

لرز رہا تھا وطن جس خیال کے ڈر سے
وہ خون رُلاتا ہے دیدۂ تر سے
صدا یہ آتی ہے پھل پھول اور پتھر سے
زمین پہ تاج گرا قوم ہند کے سر سے

(ایضاً،ص 139)

گوپال کرشن گوکھلے ہندوستان کے نرم دِل سیاست داں گذرے ہیں۔ چکبست ان کے نرم مزاج پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں۔

رہا مزاج میں سودائے قوم خو ہوکر
وطن کا عشق رہا دل کی آرزو ہوکر
خدا کے قلم سے جب آبِ وگل بنا تیرا
کسی شہید کی مٹی سے دل بنا تیرا

(ایضاً،ص 140)

چکبست کے مطابق گوکھلے کی رگ رگ میں قومیت رچی ہوئی تھی اور وطن کی عظمت انھیں بہت عزیز تھی۔ اس مرثیے میں چکبست نے وطن کی خاک کو گوکھلے کی بارگاہ اعلیٰ کہا ہے چکبست کہتے ہیں ان کی موت پر دوست کیا دشمن بھی انھیں سفیر قوم، راہِ قوم، خادمان وطن کہہ کر افسردگی کا اظہار کیا تھا۔ مرثیے کے آخر میں گوکھلے کے گذر جانے پر انفرادی واجتماعی غم وآفسردگی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ۔

رہے گا رنج زمانہ میں یادگار ترا
وہ کون دل ہے کہ جس میں نہیں مزار ترا
جو کل رقیب تھا ہے آج سوگوار ترا
خدا کے سامنے ہے ملک شرمسار ترا
پلی ہے قوم ترے سایۂ کرم کے تلے
ہمیں نصیب تھی جنت ترے قدم کے تلے

گوکھلے کے ہم عصر بال گنگادھر تلک بھی ہندوستان کے عظیم قومی رہنما اور آزادی کی تحریک کے بڑے علمبردار گذرے ہیں چکبست نے بال گنگادھر تلک کی موت پر بھی مرثیہ لکھ کر انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ چکبست کا کہنا ہے کہ گوکھلے نرم دل تھے اور تلک گرم دل تھے حکومت بال گنگادھر تلک سے خوف کھاتی تھی پوری زندگی انھوں نے مجاہدانہ گذاری ہے چنانچہ چکبست ان کے قومی جذبے اور مجاہدانہ زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی موت کو قومی ورثے کا بڑا نقصان بتایا ہے کہتے ہیں۔

اُٹھ گیا دولتِ ناموسِ وطن کا وارث
قومِ مرحوم کے اعزازِ کہن کا وارث
جاں نثار ازلی شیرِ دکن کا وارث
پیشواؤں کے گرجتے ہوئے رن کا وارث

چکبست کے مطابق تلک ملک کی ہستی بنانے اور عوام میں قومی جذبہ پیدا کرنے میں ہمیشہ آگے رہے۔ انھوں نے ہندوستانی قوم کے سوئے ہوئے ارمانوں کو جگایا اور ان کی ویران زندگیوں میں بجلی کی طرح چمکے چنانچہ وطن وقوم پر قربان ہونے کے جذبے کی ستائش کرتے ہوئے چکبست کہتے ہیں۔

ہوگی نذر وطن ہستی فانی تیری
نہ تو پیری رہی تیری نہ جوانی تیری

ملک وقوم کے خدمت گذاروں کی موت کا غم چکبست کو ہر گھڑی ستاتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں گنگا پرشاد ورما کی موت پر لکھا گیا مرثیہ بھی قابل ذکر ہے اس مرثیے میں بھی اظہارِ غم کی کیفیت وہی ہے جو دوسرے مرثیوں میں ہے۔ گنگا پرشاد ورما ملک وقوم کے خدمت گذار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ممتاز صحافی بھی تھے۔ عرصے تک لکھنؤ میونسپل کمیٹی کے صدر بھی رہے۔ لیکن ان کا انتقال نینی تال میں ہوا۔ جس کا افسوس چکبست کو بہت ہوا چکبست کے مطابق انھیں لکھنؤ سے بے حد لگاؤ تھا۔ لیکن مرتے وقت انھیں یہ شہر نصیب نہیں ہوا جس کا اظہار چکبست نے اس مرثیے میں کیا ہے۔

لکھنؤ کا تجھے دم بھر نہ گوارا تھا فراق
مر کے اس خاک کا دامن نہ ملا رنج ہے شاق

(ایضاً،ص 146)

اس مرثیے میں چکبست نے ورما کی صحافتی زندگی پر بھی روشنی ڈالی ہے ان کے مطابق ورما آزاد اور بے باک صحافی تھے۔ ان کی موت سے ایسا لگتا ہے کہ عالم اخبار کی سیاہی مٹ گئی ہو۔ ورما کی بے باکانہ صحافت کے تعلق سے چکبست کہتے ہیں۔

قوم کرتی تھی فقط تیری زباں سے فریاد
بحث وتحریک کے میدان میں قلم تھا آزاد
تیرے اخبار دلائیں گے ترے جوش کی یاد
دل کے ٹکڑے ہیں یہی اور یہی تیری اولاد

(ایضاً،ص 147)

چکبست نے ملک وقوم کی عظیم ہستیوں کے علاوہ اپنے عزیز واقارب کے وصال پر بھی مرثیے کہے ہیں ان مرثیوں میں بھی انفرادی واجتماعی دردوغم کی کیفیت وہی ہے۔ جیسے 'نشتر یاس' اور 'ماتم یاس' مرثیے ان کے عزیزوں کے متعلق ہیں۔ نشتر یاس تیج نرائن چکبست کے انتقال پر لکھا گیا ہے۔ یہ ان کے عزیزوں میں سے تھے۔ جو نوجوانی میں عالم جنون میں خودکشی کرلی تھی۔ جس سے چکبست کو دلی صدمہ پہنچا جس کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں۔

دعائیں دیتے تھے جس گود میں کھلا کے تجھے
اُسی میں آج سلایا کفن پہنا کے تجھے
جو دل میں دردِ محبت تھا آج داغ ہوا
چتا کی آگ سے روشن یہی چراغ ہوا

(ایضاً،ص 153)

اسی طرح مرثیہ ماتم یاس، پنڈت اجودھیاناتھ آغا کی وفات پر لکھا گیا ہے۔ پنڈت آغا چکبست کے قریبی رشتے داروں میں سے تھے ان کی وفات بھی نوجوانی ہی میں ہوئی لہٰذا ان کی وفات کے صدمے کا نوحہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

اے جوانی کے مسافر اے اجل کے مہماں
سوگیا تو سنتے سنتے زندگی کی داستاں
کارِ دنیا سے کوئی یوں بے خبر ہوتا نہیں
رات بھر جاگا ہوا دولہا بھی یوں سوتا نہیں
یہ کفن ہرگز نہیں تیرے پہنانے کے لیے
لائی ہو خلعت تجھے دولہا بنانے کے لیے

(ایضاً،ص 154)

پنڈت آغا کے ماں باپ بھائی بہنوں کے غم کو بھی چکبست نے بڑی شدت سے بیان کیا ہے کہتے ہیں۔

ماں کو رونا ہے کہ جاتا ہے تو جاٹل کر گلے
بھائی کہتا ہے رہوں گا کس کی چھاتی کے تلے
کہتی ہیں بہنیں کہاں منہ موڑ کر بھائی چلے
دھیان کچھ اس کا بھی ہے جس گود میں ہم تم پلے

(ایضاً،ص 155)

مذکورہ شخصی مرثیوں کے مطالعے کے بعد مجموعی طور پر یہی کہہ سکتے ہیں کہ شخصی مرثیے کی روایت کو آگے بڑھانے میں چکبست کے یہ مرثیے قابل ذکر ہیں۔ فنی طور پر ان تمام مرثیوں میں کردار نگاری، درد والم، پر اثر و فنکارانہ طور پر کیا ہے۔ مرثیے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ قارئین وسامعین کے ذہنوں پر ایک سوگوار فضا چھاجائے۔ چنانچہ چکبست کے ان تمام مرثیوں میں یہ خوبی پائی جاتی ہے۔ ان کے مرثیوں میں حقیقی جذبات وغم کے ساتھ ساتھ شاعرانہ صناعی بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس کے علاوہ ان کے مرثیوں میں بے ساختگی روانی وتسلسل اور صداقت، احساسات، موضوع سے عقیدت ومحبت اس قدر شامل ہے کہ مرثیوں کو پڑھنے کے بعد زباں سے بے ساختہ آہ! اور واہ، کے الفاظ نکلتے ہیں۔

■

Dr. Ismail Khan
Department of Urdu,
Karnataka State Akkamahadevi
Women's University,
Vijayapur- 586102(Karnataka)
Cell:9701514755

فکر تونسوی کی نظم نگاری

محمد تنویر

فکر تونسوی بنیادی طور پر مزاح نگار تھے، مگر انھوں نے شاعری بھی کی، یہ اور بات ہے کہ ان کی شاعری پر توجہ نہیں دی گئی یا خود انھوں نے بھی اس میدان کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنانے پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم فکر تونسوی کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ مقدار میں کم معلوم ہوتی ہیں۔

اپنی کتاب 'وارنٹ گرفتاری' میں فکر تونسوی نے اپنا تعارف 'مصنف کا کچا چٹھا کے عنوان سے لکھا ہے، آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

''شکل بھونڈی ہے، تحریر خوبصورت ہے اور یہ دونوں چیزیں خداداد ہیں۔ لوگ اس کی تحریر پڑھ کر اسے دیکھنا چاہتے ہیں، جب دیکھ لیتے ہیں تو اس کی تحریریں پڑھنا چھوڑ دیتے ہیں۔ اس لیے مصنف دنیا سے منھ چھپاتا پھرتا ہے۔ عزت قائم رکھنے کے لیے انسان کو سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔'' (مصنف کا کچا چٹھا، وارنٹ گرفتاری: فکر تونسوی)

فکر تونسوی کا اصل نام رام نارائن بھاٹیہ تھا۔ فکر تونسوی لاہور کے تاریخ ساز ادبی رسالوں کے مدیر رہے۔ شاعری کی، لیکن شہرت طنز و مزاح کی وجہ سے

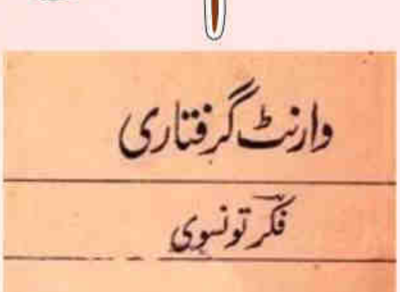

ملی۔ وہ اپنے اصل نام کو واہیات کہتے تھے، اور خود ساختہ نام فکر تونسوی کو پسند کرتے تھے۔ فکر تونسوی کے حالات زندگی اور ان کی شخصیت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سہیل عظیم آبادی نے لکھا ہے کہ فسادات کے دوران جب ہر طرف افراتفری کا ماحول تھا فکر تونسوی بے فکر ہوکر لاہور کی گلیوں میں اپنے مسلمان دوستوں کے ساتھ گھومتے پھرتے رہے۔ بہر حال جہاں تک ان کی شاعری بالخصوص نظم نگاری کا تعلق ہے تو بچپن بلکہ آٹھویں جماعت سے ہی انھوں نے شعر موزوں کرنا شروع کر دیا تھا۔ مگر نظم گوئی کی طرف انھوں نے بعد میں توجہ کی۔ فکر تونسوی نے اپنے متعلق لکھا ہے کہ ابتدا میں نظمیں ضرور کہتے تھے مگر وہ اپنی نظمیہ شاعری سے مطمئن نہیں تھے، انھیں ایسا لگتا تھا کہ وہ شاعری سے زیادہ اچھی نثر لکھ سکتے ہیں اور اسی سوچ نے انھیں نثر بلکہ مزاحیہ نثر کی جانب متوجہ کیا۔

جہاں تک فکر تونسوی کی نظم نگاری کا تعلق ہے تو 1947 میں ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ 'ہیولے' کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں چند غزلوں کے علاوہ اکتالیس نظمیں شامل ہیں۔ ان نظموں میں مہا گیانی، پھر بھی، تب اور اب، بغاوت، اجنبی مجسمہ، بیاہ، دو جواب، بے ٹھکانہ، نیند، تنہائی، سوئمبر، راستہ، مشورہ اور وہی پرانی ریت وغیرہ شامل ہیں۔

ان کی نظم 'تنہائی' جب شائع ہوئی تو ادبی حلقے کو فکر تونسوی کی شکل میں ایک نیا نظم گو شاعر مل گیا تھا۔ ان کی نظم 'تنہائی' 'ادبی دنیا' میں 1942 کے شمارے میں شائع ہوئی۔ فکر تونسوی نے خود اس نظم کی مقبولیت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'حلقہ ارباب ذوق' نے ان کی نظم 'تنہائی' کو سال کی بہترین نظم قرار دیا تھا۔ نظم تنہائی ملاحظہ کریں۔

دور جہاں کے ہنگاموں سے/ سونی سونی ہے ایک وادی/ بنجر راہیں سنسان ٹیلے/ کالی گہری لمبی دراڑیں/ آگے پیچھے دائیں بائیں/ مایوسی کی لہریں گائیں/ غم کے جھولے میں لہرائے/ ایک مسلسل سائیں سائیں/ چرمر چرمر کرتے جائیں/ رومانی تخیل کے ڈھانچے/ لاکھوں ہلکی ہلکی نیندیں/ ایسے آئیں ایسے جائیں/ بادل کے پردے کے پیچھے/ چاند کی آنکھ مچولی جیسے/ آہوں کی یہ طوفان خیزی/ ہانپ گیا تنہا فریادی/ دور جہاں کے ہنگاموں سے/ سونی سونی ہے ایک وادی

نظم 'تنہائی' گرچہ فکر تونسوی کی پہلی نظم ہے مگر اس نظم میں ان کی شاعرانہ پختگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نظم میں ایک طرف جہاں تنہائی کو موضوع بنایا گیا ہے وہیں دوسری جانب مادیت پرستی پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ مادیت پرستی کے اس دور میں لوگ اپنے مفاد کے لیے دوسروں کو نقصان پہنچانے سے بھی نہیں کتراتے اور یہ رویہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ فکر تونسوی کی مذکورہ بالا نظم 1942 میں شائع ہوئی۔ اگر اس دور کے سیاسی حالات کا

جائزہ لیں تو بھی اس شعر کی معنویت میں اضافہ ہوتا ہے۔ پوری دنیا دوسری عالمی جنگ میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں انسانی زندگی اور آبادی کو تباہ و برباد کرنے پر تلی تھی۔ اس نظم کا کلیدی مصرعہ 'آہوں کی یہ طوفان خیزی، ہانپ گیا تنہا فریادی' ہے۔انسان اور اس کی بقا کی کوئی فکر نہیں کرتا۔

ان کی ایک نظم 'مہا گیانی' ہے۔اس نظم کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ متکلم سیاست کے گرتے معیار اور سماجی اخوت کے بگڑنے سے ناخوش ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مذہب کے نام پر ہر چیز کو تقسیم کر دیا گیا ہے، ظاہر ہے یہ تقسیم انسانیت کی بقا کے لیے خطرناک ہو سکتی ہے۔نظم کا ابتدائی ایک بند ملاحظہ کیجیے

دودھیا چاند میں پھر ڈالے گئے چار شگاف
اور تڑپنے لگیں، کٹنے لگیں سیمیں کرنیں
ماتمی آنسو ابھر آئے، فضا میں پھڑکے!
خاک و افلاک کے معصوم کلیجے دھڑکے
چیخ اٹھے دیوتا، رکنے لگے برہمانڈ کے سانس
اور یونہی کٹتے ہوئے، بٹتے ہوئے عالم میں
چاند کی وحدت نورانی نے دم توڑ دیا

فکر تونسوی نے اس نظم میں ایک طرف جہاں سماجی رشتوں میں آ رہی گراوٹ کو موضوع بنایا ہے وہیں دوسری جانب انھوں نے سماج میں عدم مساوات اور ذات براوری کی کشمکش پر بھی طنز کیا ہے۔

فکر تونسوی کے یہاں ایسی کئی نظمیں ہیں جس میں انسانیت کے دشمنوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔فکر تونسوی کی ایک نظم 'شکنتلا' ہے، جو کالی داس کے ڈرامے 'شکنتلا' کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔اس نظم میں ظلم اور ناانصافی کے خلاف فکر تونسوی نے جس انداز میں طنز کیا ہے وہ قابل مطالعہ ہے۔نظم کا ایک ٹکڑا ملاحظہ کیجیے

اسے دیوار میں چنوا دو اسے سنگسار کرو
اسے نیزوں پہ بچھا دو اسے چھلنی کردو
دھڑ دھڑاتے ہوئے شعلوں میں جھلس دو اس کو
ہڈیاں پیس دو کتوں سے اسے نچوا دو
اس نے توہین شہنشاہ معظم کی ہے
ایک ذرہ نے تمنائے دو عالم کی ہے

کالی داس نے مہابھارت سے متاثر ہو کر شکنتلا نام کا ڈرامہ لکھا تھا۔اس ڈرامے کی کہانی یہ ہے کہ شکنتلا ایک رشی یعنی سادھو کی لڑکی تھی، اس کی پیدائش منا کا پری کے بطن سے ہوئی تھی مگر پیدائش کے ساتھ ہی جنگل میں پھینک دی گئی۔شکنتلا کی پرورش رشی کنوا نے کی تھی، عالم جوانی میں راجا دشینت نے اس کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر اپنی ایک انگوٹھی یادگار کے طور پر دی۔ کچھ دنوں بعد جب شکنتلا اپنے شوہر کے پاس گئی تو راستے میں اس کی انگوٹھی کھو گئی، راجا دشینت کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور اس نے شکنتلا کو اپنے دربار سے نکال دیا، جہاں اس کے بطن سے شہزادہ بھرت پیدا ہوا۔مگر چند برسوں کے بعد راجا دشینت کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے اپنی غلطی پر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے شکنتلا اور بھرت کو اپنے محل میں لے آیا۔فکر تونسوی نے اپنی نظم 'شکنتلا' میں بھی اس واقعے کی جانب اشارہ کیا ہے اور بالخصوص عورتوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ابتدا سے ہی عورتوں پر مختلف اقسام کی زیادتی کی جا رہی ہیں، انھیں سماجی اور سیاسی طور پر اب بھی وہ اختیار حاصل نہیں ہے جو انھیں ہونے چاہیے تھے۔فکر تونسوی نے اس جانب اشارہ کیا ہے۔

فکر تونسوی کی شاعری میں ہندو دیو مالا کا استعمال جا بجا نظر آتا ہے۔شکنتلا، برہما چاری اور مہا گیانی جیسی نظمیں اس کی مثال ہیں۔نظم 'شکنتلا' میں فکر تونسوی نے سماج کے اس پہلو کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے جس میں ہونے والی ہر برائی کا ذمے دار عورت کو بتاتے ہوئے الزام تراشی کرتے ہیں۔اس الزام تراشی میں ہر کوئی پیش پیش ہے خواہ وہ بادشاہ وقت ہی کیوں نہ ہو۔فکر تونسوی نے شکنتلا کے درد کو بھی بیان کیا ہے کہ کس طرح اس نے جنگلوں میں راتیں گزاری، تکلیفیں جھیلیں، اندھیرے میں بھٹکتی رہی۔نظم کے یہ دو مصرعے دیکھیے جس میں عورت کی تکلیف ہی نہیں مہذب سماج میں عورت کی اہمیت کی جانب بھی اشارہ ملتا ہے

روح نے صدیوں سے انسان کو اندھیرے بخشے
ان اندھیروں میں کئی جنگلی دو شیزائیں!

یہ نظم کالی داس کے ڈرامہ شکنتلا میں بیان واقعہ کی خوبصورت تصویر پیش کرتے ہوئے عورتوں کی سماجی صورت حال کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔نظم 'شکنتلا' کے متعلق کنہیا لال کپور نے لکھا ہے

'وہ [فکر تونسوی] واحد شاعر ہے جس نے ہندو دیو مالا کو جدید حیران کن اور منفرد زاویہ نگاہ سے دیکھا ہے۔ ہندو دیو مالا سے اس کا یہ سلوک روایات سے ہٹ کر انفرادی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔''

فکر تونسوی کی ایک نظم 'بچھڑا ہوا گھر' ہے۔اس نظم کا پس منظر تقسیم ہند ہے۔ تقسیم کا کرب اس عہد کے تقریبا تمام تخلیق کاروں کے یہاں کم یا زیادہ نظر آتا ہے۔ شاعری کی تمام اصناف میں اس کا اظہار ملتا ہے۔فکر تونسوی کی نظم 'بچھڑا ہوا گھر' بھی اسی تناظر میں لکھی گئی ہے۔ انسان کو سب سے زیادہ دکھ اپنی مٹی اور اپنی زمین سے جدا ہونے کا ہوتا ہے۔ سعادت حسن منٹو نے اپنے افسانے 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' میں اسی جانب اشارہ کیا ہے کہ ایک پاگل جسے تقسیم اور سیاست سے کوئی لینا دینا نہیں وہ بس ایک ہی بات جاننے کا خواہش مند ہے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ جو اس کا آبائی وطن ہے وہ تقسیم کے بعد کہاں ہے؟ تقسیم کا سانحہ تاریخ کا ایسا سیاہ باب ہے کہ جب بھی اس کا ذکر آئے گا وہ تمام درد اور تکلیف ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔فکر تونسوی نے اپنی نظم میں انہی خیالات کا اظہار کیا ہے

مری انجان امنگوں کا شرابیں جھرنا
چند البیلے عزائم کو نگاہوں میں لیے
اپنے مجلس کی حدیں چیر گیا، پھوٹ پڑا

سرکشی پھیل، بکھرتی گئی، افسانہ بنی
پیاس کی ماری کو تمیز من و تو نہ رہی
برف پہ ٹہلی تو شعلوں پہ کبھی جھول گئی

یونہی لذت گہ انوار میں وہ مست شباب
بھول کر ظلمت و زنجیر کا اندوہ قدیم
اس پہ ڈالے ہوئے انگاروں کے، برفوں کے نقاب
کھوجتا پھرتا رہا اپنی نگاہوں کا حریم

فکر تونسوی نے آزادی کے بعد کی صورت حال کو پیش کیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ مذہب کے نام پر ہونے والی اس تقسیم کو لوگوں نے اس سرور میں قبول کر لیا کہ یہ تمام مسائل کا حل ہے مگر ایسا نہیں ہوا، اس تقسیم کا انجام برا تھا اور وہ سامنے آ کر رہا

زہر انجام تھا لیکن وہ اجالوں کا سرور
کوئی آئین جہاں ساز پہ انگلی رکھتا
کیوں چھٹے تیر کو منزل کا نشاں مل سکتا ہے
ٹوٹ کر رہ گیا انجان بغاوت کا غرور

فکر تونسوی نے اپنی نظم میں تقسیم ہند کو زمین کی تقسیم کے ساتھ دلوں کی تقسیم بھی بتایا ہے۔ جس چیز کی بنیاد غلط ارادوں سے ڈالی جاتی ہے اس کا انجام برا ہی ہوتا ہے اور یہی حال قیام پاکستان کے ساتھ بھی ہوا۔ حالانکہ تقسیم کے درد کو سرحد کے دونوں جانب یکساں طور پر محسوس کیا گیا، اسے سیاست کا سب سے مکروہ چہرہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ایک ملک کے نہ صرف دو ٹکڑے کر دیے گئے بلکہ لوگوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی زمین سے الگ ہو جائیں،

اس مٹی سے محروم ہوجائیں جہاں ان کے بچپن کی معصومیت جوانی کی امنگیں وابستہ ہیں۔

اور اب میرا جگر گوشہ، وہ بے گھر جھرنا
آگ اور خوں کی گذر گہ پہ بہے جاتا ہے
اجنبی دکھ ہے، کلیجے پہ سہے جاتا ہے
یعنی اک عشرت موہوم کے خوابوں کا صلا
آہ، اس ماندہ و آوارہ حزیں راہی کے
روح میں ٹھہرے ہوئے زخم کوئی سہلا دے
ہے کوئی، توڑے جو خودساختہ بندھن اس کے
اور اسے بچھڑے ہوئے گھر کا پتہ بتلا دے

فکر تونسوی کی پیدائش چونکہ ملتان میں ہوئی تھی جو اب پاکستان کا حصہ ہے۔انھوں نے نہ صرف تقسیم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا بلکہ اس قیامت خیز واقعے کو محسوس بھی کیا تھا، یہی نہیں بلکہ پاکستان سے ہندوستان آنے والوں میں ان کا کنبہ بھی تھا۔ظاہر ہے تقسیم کا جو درد انھوں نے سہا ہوگا، جو انھوں نے محسوس کیا ہوگا اسے ہم محسوس بھی کر سکتے۔ان کی نظم 'بچھڑا ہوا گھر' میں اس درد کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔

فکر تونسوی کی نظم 'بے ٹھکانہ' بھی ایک ایسے انسان بلکہ روح کے کرب کو بیان کرتی ہے جو اپنی زمین سے دور ہوگیا ہے اور اپنی اصل کی جانب لوٹنا چاہتا ہے مگر زمانے کی بے حسی کے سبب وہ ایسا نہیں کر پاتا۔وہ اس بات پر پشیماں ہے کہ وہ اپنی اصل کو لوٹ نہیں سکتا اور اپنی اس مجبوری پر ایک طرح سے شرمندہ بھی نظر آتا ہے۔

کیوں اجالے کے تعاقب میں چلی جاتی ہو
وہی قندیل ہے جو روز جلا کرتی ہے
وہ۔ جسے پاکی تمدن کا ہراس پنہاں
اپنے زر تار لبادے میں چھپالیتا ہے
حسن کی وحشی ترنگوں میں بہی جاتی ہو
روح کی بازیگری، جسم کا سودا تو نہیں

فکر تونسوی نے مہاجرین کو اس پرندے سے تعبیر کیا ہے جو سر شام اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر اپنے گھر کا پتہ بھول گیا۔ ایسا پرندہ بہ حالت مجبوری ایسے سہاروں سے خود کو بہلانے کی کوشش کرتا ہے جو کئی مرتبہ کمزور بھی ہوتے ہیں۔انسان کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے، جب وہ اپنوں سے جدا ہوجاتا ہے تو کسی ایسے سہارے کی تلاش کرتا ہے جو کچھ وقت کے لیے ہی سہی اس کے دکھ درد کو کم کر دے اور جب ایسا کوئی سہارا مل جاتا ہے تو اس کو خوشی ہوتی ہے اور اس کے اندر امید کی کرن نظر آنے لگتی ہے وہ ایسا محسوس کرتا ہے کہ اب اس کی تکلیف ختم ہوجائے گی اور وہ اپنے اصل

فکر تونسوی کے یہاں انسان اور انسانیت سے ہمدردی نظر آتی ہے وہ ادب برائے زندگی کے قائل تھے یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں مقصدیت بھی نظر آتی ہے۔ ان کا شعری سرمایہ مختصر ضرور ہے مگر اس میں خیال کی ندرت اور فکر کی بالیدگی نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فکر تونسوی کا شاعری ترک کرنا اردو شاعری کے حق میں اچھا نہیں رہا۔

یعنی اپنے گھر اپنے دوستوں کے پاس واپس جاسکتا ہے مگر ظاہر ہے یہ اس کا صرف وہم ہوتا ہے۔فکر تونسوی نے انہی خیالات کا اظہار اپنی نظم 'بے ٹھکانہ' میں کیا ہے۔

پے در پے تم کو دیے جاتی ہے راحت کے فریب
اور راحت کا خدا وند۔ وہ قندیل کی لو
کب تلک جلتی رہے صرف تمہاری خاطر
پاس ہی چاندی سی تہذیب کے سائے بھی تو ہیں
سانس روکے ہوئے زر تار لبادے بھی تو ہیں

فکر تونسوی کے طنز ومزاح اور شاعری دونوں میں تقسیم کا کرب اور لاہور سے ہجرت کا دکھ نہ صرف شامل ہے بلکہ چند مقامات ایسے بھی آتے ہیں جہاں تقسیم کی ایسی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے کہ قاری کی آنکھیں نمناک ہوجاتی ہیں اور محسوس کرتا ہے کہ وہ سارے واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

نظم '1947' بھی ہیولے میں شامل ہے۔اس نظم میں جہاں ایک طرف آزادی کے فوراً بعد رونما ہوئے فساد اور تقسیم کی روداد ملتی ہے وہیں متکلم اس بات پر پشیماں بھی نظر آتا ہے کہ ہم جس خوبصورت مستقبل کے منتظر تھے، اور گیت گاتے خوشیاں منانے میں مشغول تھے وہ صبح نہیں آئی، بلکہ انھوں نے ان لوگوں کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے جو تقسیم کو مستقبل کی ضرورت سمجھتے تھے۔

یہ دھاندلی مچاتی، کف اڑاتی آج زندگی کہاں چلی
گلال سے اچھالتی، نگاہ و دل کی منزلیں پھلانگتی
ہوا کے تیز رو سروں پہ نغمۂ شرر فشاں الاپتی
وہ کوند کر لپک پڑی، وہ گھوم کر جھپٹ پڑی
اُدھر کا تار ٹوٹ کر، ادھر الجھ کے رہ گیا
ادھر کی لے اچھل کے، اُس الاپ سے لپٹ گئی
یہ کیسا شور ہے، کہ جس کا نام ہے نہ رنگ ہے
بس ایک امنگ ہے، کہ عرصہ حیات جس پہ تنگ ہے
بس ایک بھنور سا جیسے چیرتا ہوا تہوں کو، گھومتا ہے چار سو
بس ایک آہو نہ رم، بس ایک سیل ناؤ ہو
بس اک مقام بے نشاں کی جستجو

فکر تونسوی کی شاعری میں جو سنجیدگی پائی جاتی ہے وہ ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ مذکورہ بالا مصرعوں کو پڑھتے ہوئے تقسیم کی تصویر ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ تقسیم ہند سے کس نے کیا پایا یہ بتانا تو مشکل ہے مگر ہم یہ بات آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ جس نفرت کی بنیاد پر اس ملک کی تقسیم ہوئی وہ آج بھی سرحد کے دونوں طرف جاری ہے۔فکر تونسوی کی نظم میں نہ بغاوت کے سر نظر آتے ہیں اور نہ ہی وہ تقسیم کے تعلق سے اپنی کوئی رائے ظاہر کرتے ہیں وہ ایک خوبصورت مصور کی طرح ایک تصویر بناتے ہیں اور قاری پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اس سے کیا معنی اخذ کرتا ہے۔ان کا یہ کہنا کہ شور کا کوئی رنگ نہیں اس جانب بھی اشارہ کرتا ہے کہ ہم تقسیم کے لیے کسی فرد یا کسی خاص کمیونٹی کو ذمے دار نہیں ٹھہرا سکتے ہیں۔اور یہی نہیں اس کا نقصان تمام انسانیت کو ہوا۔نظم کا اختتام ان مصرعوں پر ہوتا ہے۔

میں دیکھتا ہوں دور اک غبار پھوٹتا ہوا
شکست ساز کے جلو میں سیل برگ و بار پھوٹتا ہوا
مجھے تو اپنے گیت کی ہر ایک تان یاد ہے!
مگر وہ ساز اور ہے، وہ دھاندلی اور ہے...!

بہر حال فکر تونسوی کی شہرت مزاح نگار کی ضرور ہے مگر ان کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری ذات کے غم اور پیچیدگیوں میں الجھی ہوئی شاعری ہے۔وہ ایک صاحب اسلوب شاعر ہیں اور بقول کنہیالال کپور 'وہ اپنے اسلوب بیان میں الفاظ کی جدت اور تازگی میں نئی تراکیب میں تشبیہوں کی ندرت میں بے مثال چابک دستی رکھتا ہے۔' فکر تونسوی کے یہاں انسان اور انسانیت سے ہمدردی نظر آتی ہے وہ ادب برائے زندگی کے قائل تھے یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں مقصدیت بھی نظر آتی ہے۔ ان کا شعری سرمایہ مختصر ضرور ہے مگر اس میں خیال کی ندرت اور فکر کی بالیدگی نظر آتی ہے۔ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فکر تونسوی کا شاعری ترک کرنا اردو شاعری کے حق میں اچھا نہیں رہا۔

■

Dr. Mohd Tanveer
B 3/01, Ground Floor
DDA Flat, Sector E-1
Cluster-6, Mahipalpur Road
Near CNG, Vasant Kunj
New Delhi - 110070
Mob.:8076892245

عبدالماجد قاضی

عربی زبان کے مایہ ناز استاذ

پروفیسر محمد راشد ندوی

صبح آٹھ بجے کا وقت ہے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی صبح نشاط کا سحر انگیز سماں ہے، پوری فضا سرشار ہے، طلبہ کچھ تنہا، کچھ چھوٹی ٹکڑیوں اور کچھ گروہوں میں، بہترین لباس زیب تن کیے، بلکہ بہت سے باقاعدہ بن ٹھن کر ہنستے، مسکراتے کلاسوں کی طرف کشاں کشاں جارہے ہیں، علی گڑھ کی ثقافتی روایات کا جلوہ ہر سو نمایاں ہے۔ ہر طرف سے سلام کی آوازیں ماحول میں سکون اور اپنائیت کا رنگ پھیلا رہی ہیں، شیروانی میں ملبوس طلبہ واساتذہ کا تناسب بھی کافی زیادہ ہے، اسکولوں کے بچے رنگ برنگ یونیفارم میں ملبوس صبح کو مزید خوبصورت بنارہے ہیں۔

طلوع آفتاب کی پہلی کرنوں کے جلو میں جب اسکولوں، درسگاہوں اور دانش گاہوں کی سمت علم کے طلب گار جذبہ وامید کی مجسم تصویر بن کر گھر سے نکلتے ہیں تو وہ ہماری کائنات کے حسن کا مرکزی نقطہ ہوتے ہیں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں انہی مناظرِ حسن کی ہر سو نمود ہے، میں اپنی چشمِ تصور سے فروری 1992 کی ایک صبح کا منظر دیکھ رہا ہوں، یونیورسٹی کی مرکزی شاہراہ پر آمد ورفت عروج پر ہے، سائکلوں سے طلبہ طالبات اور ملازمین اپنی اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں، کچھ اساتذہ رکشوں پر سوار ہیں، نسبتاً کم تعداد میں سکوٹر اور موٹر سائیکلیں بھی دکھائی دے رہی ہیں، شاذ و نادر کوئی ایمبیسڈر کار یا اس سے بھی شاذ ماروتی 800 کے ذریعے بھی کچھ لوگ گزر رہے ہیں، اس دیارِ دانش میں کسی کا سماجی رتبہ اس کے زیرِ استعمال سواری کی خودکاری یا پہیوں کی تعداد سے نہیں طے ہوتا، بلکہ درحقیقت یہاں کے بڑے اہل علم بھی سائکل کا استعمال زیادہ پسند کرتے ہیں، پروفیسر چغتائی صاحب اور پروفیسر عرفان حبیب صاحب جیسے فرزانے بھی سائکل ہی بطور سواری استعمال کرتے ہیں، ایک قابلِ لحاظ تعداد ان لوگوں کی بھی ہے جو رکشے کے ذریعے اپنی اقامت گاہوں سے دفاتر اور درسگاہوں کا رخ کرتی ہے۔

اسی دوران ایک رکشا آرٹس فیکلٹی کے سامنے سے گزرا، شیخ الجامعہ کی رہائش گاہ سے آگے بڑھا اور اگلے چوراہے سے داہنی طرف موریسن کورٹ جانے والی سڑک پر مڑا، کچھ ہی قدموں کے فاصلے پر واقع تکون سے بائیں جانب والے راستے پر آگیا اور حالی روڈ پر کچھ دور چلنے کے بعد شعبہ عربی اور ادارہ علوم اسلامیہ کی مشترک عمارت کے سامنے آکر رک گیا۔

رکشے سے اترنے والے صاحب نے جیب سے پیسے نکال کر کرایہ ادا کیا اور سیدھے عمارت کے اندر داخل ہو گئے، سفید براق شرٹ، سرمئی رنگ کی پینٹ اور سیاہ پالش شدہ سینڈل میں ملبوس، میانہ قد، جسم قدرے فربہی مائل، کشادہ جبین، گندمی رنگ، سیاہ گھنے بال قدرے دراز، اس سلیقے کے ساتھ کنگھی کیے ہوئے کہ وہ چمکدار تہ دار، اور ہموار شکل لیے ہوئے ہیں، گھنے ابرو، نگاہوں میں کسی فوری تاثر کا کوئی شائبہ نہیں۔ سلیقے سے تراشی ہوئی قدرے باریک مونچھیں، چہرہ ناآشنائے ریش، آواز میں ایک طرح کی کھنک لیکن بہ وقت گفتگو دھیمی، پورے سراپا کو دیکھتے ہی ان کے بارے میں ایک باوقار شخصیت کا تاثر ذہن نشین ہو جاتا ہے، یہ ہیں استاذ محترم پروفیسر محمد راشد ندوی سابق صدر شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

گزشتہ صدی کے آخری دہے میں اگر آپ کو شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جانے کا اتفاق ہوا ہوگا تو آپ نے اس باوقار اور سدا بہار دیارِ علم وادب میں پروفیسر محمد راشد صاحب کی کوئی جھلک ضرور دیکھی ہوگی۔ ہر روز صبح اسی معمول کے مطابق پروفیسر راشد صاحب رکشے سے شعبہ عربی پہنچتے، وہ صدرِ شعبہ تھے اور اپنے دفتر میں بیٹھ کر لکھنے پڑھنے میں مصروف ہو جاتے، تمام اساتذہ اپنے کمروں یا کلاس روم میں ہوتے، ہر کام نظام کے تحت انجام پزیر ہوتا تھا۔

میں نے پروفیسر راشد صاحب سے زیادہ مستقل مزاجی اور معمول کی پابندی کے ساتھ کسی اور کو اپنے دفتر میں اتنے طویل اوقات کار تک بیٹھتے نہیں دیکھا۔ صبح آٹھ بجے سے دوپہر دو بجے تک کرسی پر متمکن ہو کر دفتری امور پر توجہ اور وقت ملنے پر مطالعہ جاری رکھنا، کلاس کا وقت ہو جانے پر کلاس روم میں موجودگی، وقت کی پابندی اور شعبے کی ہمہ جہت کارکردگی کی نگرانی۔ یہ تھا استاذ گرامی کا وہ یومیہ گوشوارۂ عمل جس کی زمانی ومکانی پابندی کی مثال گھڑی کی سوئیوں کی پیہم تگ وتاز سے ملتی جلتی تھی، جن کی گردش ایک محدود مکانی دائرے میں ہوتی ہے لیکن وہ لامحدود زمانی حقیقتوں کی پیائش کے ساتھ امکانات کو مفروضوں اور

واہموں کی دنیا سے نکال کر واقعات اور حقائق کا وجود عطا کر رہی ہوتی ہیں۔ یہاں ہر شخص کبھی ساکن اور کبھی سیار ہوتا، لیکن پروفیسر راشد صاحب مانندِ کوہ اپنی جگہ پر قائم رہ کر تدریس و انتظام کی تمام ذمے داریوں کو انجام دیتے، اتنی دیر تک جم کر بیٹھ جانا اور اس معمول پر سال بھر قائم رہنا ایک مشکل ترین کام ہے مگر پروفیسر راشد صاحب کے لیے بہت آسان تھا کیونکہ ان کی دلچسپی صرف پڑھنے پڑھانے اور لکھنے میں تھی، ان کو کسی اضافی انتظامی عہدے کی طلب نہیں، وہ کسی ہال کے پرووسٹ نہیں بننا چاہتے، وہ اساتذہ کی انجمن میں کسی عہدے کے طلب گار نہیں وہ یونیورسٹی کی اندرونی سیاست میں سرگرم کسی گروہ کا حصہ نہیں، ان کو شیخ الجامعہ سے تقرب کی کوئی تمنا نہیں، کسی مالی منفعت یا اثر و رسوخ کی چاہت نہیں، اس طرح کے کردار والا شخص اپنی ایک دنیا خود بناتا ہے اور اس دنیا میں خوش رہتا ہے۔

اس دوران اگر ان کو گیلری میں کوئی طالب علم وقت گزاری یا گپ شپ میں مصروف مل جاتا وہ اس سے باز پرس کر لیتے کہ وہ کلاس کے وقت یہاں کیا کر رہا ہے، یا اگر وہ ریسرچ سکالر ہے تو لائبریری چھوڑ کر باہر کیوں گھوم رہا ہے، بلکہ میں نے ایک آدھ مرتبہ ایک نوجوان استاذ کو کسی تاخیر یا غفلت پر ان کے سامنے جواب دہی پر مجبور دیکھا۔

ایم اے سال دوم میں ہمیں پروفیسر راشد صاحب نے ادب کی تنقید پڑھائی، حسبِ معمول وقت پر کلاس شروع ہوتی اور پورے وقت گفتگو نصاب میں شامل موضوعات پر ہی ہوتی، ذاتی زندگی یا مقرر شدہ موضوعات کے علاوہ چیزوں میں وقت گزاری کا یہاں کوئی گزر نہیں تھا، ہمارے ساتھیوں میں کچھ لوگ کیرالا کے بھی تھے اس لیے پورا لیکچر فصیح اور معیاری عربی میں ہوتا، سوالات کے تشفی بخش جواب دیے جاتے۔ بلا ناغہ کلاسیں اگر عرصۂ دراز تک ہوتی چلی جائیں تو آپ پڑھنے میں جتنے بھی سنجیدہ ہوں کبھی کبھی چاہتے ہیں کہ بارش ہو طوفان ہو یا جو بھی امکان ہو، کسی دن چھٹی مل جائے اور معمول کی یکسانیت ٹوٹے، یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھار طلبہ کو اساتذہ کی ناسازی طبیعت کی خبر، خبرِ وحشت اثر نہیں معلوم ہوتی، پروفیسر راشد صاحب، اور دیگر اساتذہ بھی کبھی کلاسوں سے غیر حاضر نہیں ہوتے تھے، البتہ سال میں ایک آدھ مرتبہ طلبہ کی یہ خواہش بھی پوری ہو جاتی، استاذ گرامی شعبہ عربی کالی کٹ یونیورسٹی کے بورڈ آف سٹڈیز کے ممبر تھے، اس کے اجلاس میں شرکت کے لیے جب سفر ہوتا تو اس کا مطلب تھا ایک ہفتے کی چھٹی، اس زمانے میں ریل کے ذریعے سفر کا زیادہ رواج تھا اور کالی کٹ کا یک طرفہ سفر بھی تین دن پر محیط ہوا کرتا تھا۔

کلاس کے باہر یا عام مزاج کے حوالے سے استاذ محترم کا شمار طبعاً کم گو لوگوں میں کیا جانا چاہیے، وہ اگر کسی علمی محفل میں موجود ہوتے تو محض اپنی موجودگی درج کرانے کے لیے کوئی لب کشائی نہ کرتے، جیسا کہ بعض حضرات کے مزاج کا لازمہ ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی نشست میں ہوں حاضرین میں مرکزِ توجہ بننے کے لیے گفتگو میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں تا کہ ہر خاص و عام کو پتہ چل جائے کہ یہاں ایک اہل علم تشریف فرما ہے۔

گزشتہ صدی کے آخری دھے میں اگر آپ کو شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جانے کا اتفاق ہوا ہوگا تو آپ نے اس باوقار اور سدا بہار دیار علم و ادب میں پروفیسر محمد راشد صاحب کی کوئی جھلک ضرور دیکھی ہوگی۔ ہر روز صبح اسی معمول کے مطابق پروفیسر راشد صاحب رکشے سے شعبہ عربی پہنچتے، وہ صدر شعبہ تھے اور اپنے دفتر میں بیٹھ کر لکھنے پڑھنے میں مصروف ہو جاتے، تمام اساتذہ اپنے کمروں یا کلاس روم میں ہوتے، ہر کام نظام کے تحت انجام پزیر ہوتا تھا۔

استاذ محترم کے مزاج میں کسی پروگرام میں رسماً یا ضمناً یا محض شرکت برائے شرکت کا کوئی تصور نہ تھا، کسی مجلس میں طفیلی بن کر یا کسی پروگرام میں سرکاری مراعات کا فائدہ اٹھا کر بغیر کسی با مقصد کردار ادا کیے شریک ہونا انہیں بالکل منظور نہ تھا، سعودی عرب میں ہر سال اعلیٰ سرکاری سطح پر جشنِ جنادریہ کے زیر عنوان ایک ثقافتی ہفتہ منایا جاتا ہے، اس میں علمی ادبی اور متنوع ثقافتی پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں، سنہ 1999 یا 2000 میں دہلی کے سعودی سفارت خانے سے استاذ محترم کے ساتھ رابطہ کیا گیا کہ اس سال کے پروگرام میں ایک دو اور مہمانوں کے علاوہ ہندوستان کی نمائندگی کے لیے ان کے نام کا انتخاب ہوا ہے، استاذ محترم نے معلوم کیا کہ اس پروگرام میں ان کی شمولیت کس عنوان کے تحت ہوگی اور ابھی اس کی تاریخ میں کتنا وقت باقی ہے، معلوم ہوا کہ دس دن کا وقفہ ہے اور وہ معزز مہمان کے طور پر رسمی شمولیت کریں گے، انھوں نے بغیر کسی توقف کے اس پیشکش کو مسترد کرتے ہوئے شرکت سے معذرت کر دی کہ اتنا طویل سفر محض کوئی رسم نباہنے کے لیے نہیں کر سکتا۔ ایک نامور، معروف اور سرگرم دانشور جو اتفاق سے پروفیسر راشد صاحب کے شاگرد بھی رہ چکے تھے انھوں نے فون سے رابطہ کر کے استاذ گرامی کو آمادہ کرنے کی کوشش کی اور بتایا کہ سفر کا پورا انتظام سعودی حکومت کی طرف سے ہے وہاں کی رہائش بھی پانچ ستارہ معیار کی ہوگی آخر دعوت قبول کرنے میں کیا چیز مانع ہے، لیکن راشد صاحب نے اپنے موقف کا اعادہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کے نزدیک بغیر کسی علمی مقصد اور واضح اور معروضی جواز کے اس پروگرام یا اس جیسی کسی تقریب میں شرکت ایک بے معنی عمل تھا، وہ اپنے فیصلے پر قائم رہے۔

کچھ لوگوں کی منطق کی رو سے یہ بات بالکل ناقابل فہم ہوگی کیونکہ وہ ہر طرح کے پروگراموں، تقریبات اور محفلوں میں شامل ہونا اپنے آپ میں ایک کمال اور ہنر سمجھتے ہیں چاہے وہاں نشست و برخاست اور لذت کام و دہن کے علاوہ ان کا کوئی کردار نہ ہو۔

پروفیسر راشد صاحب کا آبائی وطن قصبہ بندی خورد ضلع اعظم گڑھ ہے، اس خطۂ مردم خیز کے ایک ممتاز علمی خاندان میں آپ کی ولادت 1936 میں ہوئی، آپ کے والد مولانا محمد سعید ندوی سید سلیمان ندوی کے خاص شاگردوں میں سے تھے ان کو مولانا حمید الدین فراہی سے شرفِ تلمذ بھی حاصل تھا وہ ایک عرصے تک مدرسۃ الاصلاح میں استاذ رہے، بعد میں وہ دار العلوم ندوۃ العلما میں حدیث و تفسیر کے استاذ مقرر ہوئے، پروفیسر راشد صاحب کے دادا مولانا محمد مرتضی صاحب بھی لغت و فقہ کے راسخ عالم تھے اور ندوہ میں لمبے عرصے تک استاذ رہے، اسی طرح آپ کے خاندان کے ایک بزرگ عالم مولانا حفیظ اللہ صاحب ندوہ کے منصب اہتمام پر چالیس سال تک فائز رہے، وہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں بھی تدریس سے وابستہ رہے، مولانا حفیظ اللہ صاحب شبلی نعمانی کے معاصر تھے اور انہی کی شمس العلما کے خطاب سے نوازے گئے۔

زمانہ طالب علمی میں استاذ گرامی کو کئی عہد ساز شخصیات سے کسبِ فیض کا موقع ملا، جیسا کہ سطورِ بالا میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ ان کے والدِ گرامی مولانا محمد سعید صاحب ندوی دار العلوم ندوۃ العلما میں استاذ تھے، راشد صاحب کم سنی میں ہی اپنے والد کے ہمراہ لکھنؤ آ گئے اور ندوہ میں داخل ہو گئے تھے، ان کو ندوہ کے دیگر ممتاز اساتذہ کے علاوہ مولانا علی میاں سے بھی براہ راست استفادے کا بیش بہا موقع ملا، وہ درسی کتابوں کے ساتھ مولانا کی نگرانی اور مشورے کے مطابق مربوط و منصوبہ بند مطالعے میں مصروف رہے اور علمی اشتغال اور ادبی ذوق کی تربیت حاصل کرتے رہے، تکمیلِ ادب کورس کے

لازمی جز کے طور پر انھوں نے کسی علمی موضوع پر ایک مبسوط مقالہ بھی مولانا علی میاں کی زیر نگرانی لکھا، اس لیے بجا طور پر وہ ان کے بہت عزیز شاگردوں میں سے تھے، ندوہ سے تعلیم کی با امتیاز تکمیل کے بعد وہ اس سہ رکنی تعلیمی وفد کا حصہ تھے جس کو مولانا علی میاں صاحب نے دمشق یونیورسٹی میں تعلیم کی تکمیل کے لیے روانہ کیا تھا، اس میں پروفیسر محمد اجتبا ، ڈاکٹر رضوان علی اور پروفیسر راشد صاحب شامل تھے۔ ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار یہ نادر موقع آیا تھا کہ شامی حکومت نے ہندوستان کے لیے تین تعلیمی وظائف منظور کیے تھے اور اس کی اطلاع دمشق یونیورسٹی میں لا فیکلٹی کے ڈین پروفیسر مصطفیٰ سباعی صاحب نے مولانا علی میاں کو خط لکھ کر دی اور انتخاب کی ذمے داری بھی ان ہی کو سپرد کی، اس باوقار علمی اعزاز اور ایک عرب ملک میں تحصیلِ علم کے لیے انھوں نے 1955 میں بذریعہ سمندری جہاز شہر بصرہ تک سفر کیا، وہاں سے زمینی راستے سے بغداد کا رخ کیا اور مختصر قیام کے بعد بذریعہ بس شام پہنچے اور دمشق یونیورسٹی میں بی اے میں داخلے کی کارروائی مکمل کی، یہاں ان کو مشہور ماہر لسانیات پروفیسر محمد المبارک، پروفیسر سباعی اور پروفیسر زرقا جیسے نامور اساتذہ سے تحصیلِ علم کا سنہری موقع ملا۔ شام سے واپسی کے بجائے انھوں نے مصر کا رخ کیا اور قاہرہ یونیورسٹی میں ایم اے میں داخلہ لیا۔

قاہرہ میں قیام کے دوران انھوں نے رسمی اور روایتی طور پر کلاس کی حاضری اور لگے بندھے طور طریقوں پر اکتفا کرنے کے بجائے مصر کے بڑے ادبا اور مایہ ناز محققین کی مجلسوں میں حاضر باشی کو اپنے معمول کا حصہ بنایا، ان کے ذوقِ علم کو دیکھتے ہوئے علم و ادب کے ان اساطین نے ان کی پزیرائی بھی کی۔ ان کو عربی کے ممتاز ادیب نقاد شاعر اور مفکر عباس محمود عقاد کی ہفتہ وار نشستوں میں جانے اور ان کی محققانہ گفتگو کو سننے کا شرف حاصل ہوا۔ عربی کے معروف ادیب طٰہٰ حسین کے لیکچرز میں حاضری کے مواقع بھی ملتے رہے، ہندوستان کے مایہ ناز محقق پروفیسر عبد العزیز میمن صاحب نے اپنے سفر قاہرہ کے دوران عربی زبان کے بڑے محقق محمود شاکر سے راشد صاحب کو ملوایا اور ان سے علمی استفادے کی تاکید کی، میمن صاحب کو عرب دنیا میں انتہائی احترام حاصل تھا اور وہ قاہرہ کی عربی اکیڈمی کے رکن تھے، کسی غیر عرب کو یہ اعزاز ملنا نادر نوعیت کا واقعہ ہے، اس لیے میمن صاحب کے عرب احباب بھی علم و تحقیق کی دنیا کے نمایاں ترین لوگ تھے اور راشد صاحب کا ان سے متعارف ہو جانا ان کے آئندہ علمی سفر کے لیے انتہائی خوش آئند ثابت ہوا۔ محمود شاکر صاحب کے ساتھ راشد صاحب کے بطور خاص طالب علمانہ مراسم قائم ہوئے اور ان کے دولت خانے پر بے تکلف آمد و رفت اور ان کی علمی مجلسوں میں بیٹھنے، شریک گفتگو ہونے اور علمی مباحثوں اور ان کے نہایت وسیع ذاتی کتب خانے سے پوری طرح مستفید ہونے کا موقع ملا۔

شام و مصر کے سفر، وہاں کی جامعات میں تعلیم اور ممتاز مفکرین، ادبا اور محققین سے علمی استفادے کی بدولت پروفیسر راشد صاحب کو وسعتِ فکر و نظر کی عظیم دولت حاصل ہوئی۔ علم و فکر کی دنیا میں نقل مطابق اصل کا کوئی مقام نہیں، ہر بڑا ادیب یا عالم اپنے فکری سفر کے دوران کچھ ایسے مقامات سے گزرتا ہے جہاں وہ اپنے پیشرو یا معاصرین کے مقابلے میں کچھ زیادہ دریافت کرتا ہے اور اس دریافت کی تفہیم و توضیح پر زیادہ ارتکاز کرتا ہے۔ علم و تحقیق کی بنیاد پر نقطہ نظر کا اختلاف اور مدارک کے تفاوت کی وجہ سے ذوق کا تنوع ایک مسلمہ حقیقت ہے، کسی انسان کے علمی مرتبے اور فکری گہرائی کا تعین بھی اسی بات سے ہوتا ہے کہ وہ اختلاف کو قبول کرنے کی صلاحیت اور ظرف سے بہرہ ور ہے یا نہیں۔

ہندوستانی جامعات میں مشرقی مطالعات کے شعبوں میں ایک تناسب ایسے لوگوں کا بھی ہوتا ہے جن کی طرف سے نظریاتی، جماعتی اور مؤسساتی گروہ بندیوں کا اظہار کسی نہ کسی شکل میں ہوتا رہتا ہے، بلکہ کچھ حضرات کی توانائی کا بڑا حصہ اس تنوع کے خد و خال کو اس قدر ابھارنے میں صرف ہونے لگتا ہے کہ وہ ذوق و تنوع کی دوسری اکائیوں کے ساتھ سرد مہری بلکہ سرد جنگ کا ماحول پیدا کر دیتے ہیں۔ اس تناظر میں پروفیسر راشد صاحب کے رویے اور تعامل سے ہمیشہ وسعت نظر کا ثبوت ملا، کسی بھی مسئلے میں ان کی جو بھی رائے ہوتی وہ اس کا برملا اظہار کر کے گزر جانے کا ہنر اور ظرف رکھتے تھے، ان کو ہرگز یہ اصرار نہیں تھا کہ ان کے مخاطبین اس کو قبول کریں اور ہمنوائی کا دم بھریں، ان کے وسیع المشرب رویے میں یقیناً ان کی جہاں دیدگی اور بیسویں صدی میں عربی زبان و ادب کی بلند قامت شخصیات سے براہ راست استفادے کا واضح کردار نظر آتا ہے۔

اردو داں طبقے کو نظر میں رکھتے ہوئے انھوں نے جدید عربی ادب و ثقافت کی نمائندہ شخصیات اور ان کی خدمات سے متعارف کروانے کا کام بحسن و خوبی انجام دیا۔ اس ضمن میں انھوں نے بطور خاص ان اہل قلم کا انتخاب کیا جن کے افکار کی عرب دنیا میں بڑے پیمانے پر پزیرائی ہوئی اور جنھوں نے جدید نسل کی فکر پر گہرے نقوش چھوڑے۔

عرب ممالک میں قومیت کے رجحان اور عثمانی سلطنت سے علیحدگی کے پورے پس منظر کو درست تاریخی سیاق میں سمجھنے کے لیے انھوں نے عرب قومیت کے دو علمبرداروں، عبد الرحمٰن کواکبی اور ساطع حصری پر دو مفصل مضامین لکھ کر اس اہم سیاسی مسئلے میں عرب قومیت کے طرفداروں کے نقطہ نظر کی وضاحت کی، ان دونوں تجزیاتی مضامین میں اس قضیے کو دینی یا فقہی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کے بجائے انھوں نے خالص سیاسی اور مادی منطقیت کی رو سے پیش کیا، اگر چہ یہ موضوع اتنا پیچیدہ ہے کہ اس کے تمام عوامل کا تجزیہ کرنے کے لیے انیسویں صدی سے بیسویں صدی کے اوائل تک کے عالمی منظر نامے کو باریک بینی سے دیکھنے کی ضرورت ہے تا کہ عالم اسلام کی تعلیمی پسماندگی، اقتصادی کمزوری، سماجی اور سیاسی ناہمواری اور داخلی انتشار کے ساتھ ہی جدید یورپ کی قومی تحریکوں، قومیت سے متعلق فلسفیانہ نظریات کی ہمہ گیر مقبولیت اور ان نظریات کی مشرقی ممالک میں بازگشت اور عرب ممالک میں بیرونی خفیہ مداخلت، استعماری عزائم اور منصوبہ بند دسیسہ کاری کے دور رس اثرات کا اندازہ لگایا جا سکے۔

پچھلی صدی کے دوران عرب دنیا میں تجدیدِ فکر اور اصلاح و تہذیب کے لیے طویل جد و جہد اور بیش بہا علمی و فکری رہنمائی میں شیخ محمد عبدہ، شکیب ارسلان اور شیخ رشید رضا کا اہم کردار رہا ہے راشد صاحب نے ان شخصیات پر کافی مبسوط اور تجزیاتی مقالات لکھے، اردو داں حضرات کو ان موضوعات پر ان کی تحریروں سے زیادہ پر مغز اور ہمہ گیر نگارشات نہیں مل سکتیں۔ اسی طرح استاذ محترم نے شامی ادبا اور مفکرین میں خلیل مردم بک اور کرد علی، فقہا اور قانون دانوں میں پروفیسر مصطفیٰ زرقا کے غیر معمولی علمی کاموں کا مفصل تعارف اور ان کی خدمات سے روشناس کرایا۔

ادب اور تنقید کے دو فرزانوں، عباس محمود عقاد اور سید قطب نے فکر و فن کی دنیا کو جس گہرائی اور گیرائی سے ہمکنار کیا، جوہر اور جمال کی پرکھ کا جو معیار قائم کیا استاذ محترم نے ان دونوں کی امتیازی اور کلیدی نگارشات کا باریک بینی سے جائزہ لیا تا کہ اردو والے بھی ان کے نام، کام اور مقام سے واقف ہو سکیں۔

غرض اسی طرح مولانا فراہی کے بلاغت سے متعلق افکار، توفیق الحکیم کی ڈرامہ نگاری، یحییٰ حقی کا تنقیدی و فنی شعور، محمود شاکر کا تنقیدی و تحقیقی مقام وغیرہ موضوعات پر راشد صاحب کے قلم سے بہترین مقالات

اردو میں شائع ہوئے، انھوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس سے متعلق تمام اساسی معلومات یکجا کر دیں اور اس کے سبھی اہم گوشوں کا اس خوبی سے احاطہ کیا کہ پڑھنے والے کو کسی تشنگی کا احساس نہ رہے اور اس کے ذہن میں موضوع کا ایک واضح خاکہ محفوظ ہو جائے۔ ان کی اکثر تحریروں کا مرکزی موضوع مختلف ادوار میں مختلف شخصیات کے حوالے سے ادب کی تنقید، اس کا ارتقا اور نئے رجحانات کا جائزہ رہا ہے، اس ضمن میں ان کی توجہ کا مرکز ہندوستان اور مصر و شام بطور خاص رہے ہیں. وہ اصولی طور پر تنقید میں اعتدال کے منہج پر قائم رہے اور نئے لکھنے والوں کو اسی کی دعوت بھی دی۔ اپنی کتاب 'جدید و قدیم عربی زبان وادب: اشخاص وافکار' کے پیش لفظ میں رقمطراز ہیں'' میں ہمیشہ اس بات پر قائم رہا ہوں کہ جو بھی زبان ہو اور اس کے جو بھی اصول وضوابط ہوں اس کو پوری طرح ملحوظ رکھنا چاہیے، شخصیات کے تبصرے میں جو بھی تنقیدی پہلو ہوں اس میں ہمیشہ اعتدال پسندی ہونی چاہیے، عام طور سے نوجوان لکھنے والے جن کا قلم جوش میں بہہ جاتا ہے وہ صحیح بات پیش کرنے کے بجائے چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھ جاتے ہیں اور تنقید میں بھی ان کا رویہ معتدل نہیں رہتا، ان کی تنقید کبھی تحقیر اور تنقیص میں بدل جاتی ہے۔''

پروفیسر راشد صاحب ہندوستانی جامعات کے ان اولین اساتذہ میں سے ہیں جنھوں نے عربی زبان کو نظر آنے اور پڑھے جانے والے سیاہ حرف کے جامد مرحلے سے اٹھا کر زبان سے ادا ہونے اور کان سے سنی جانے والی آواز کے زندہ و متحرک مرحلے تک پہنچایا، یعنی عربی کو ایک زندہ زبان کے طور پر استعمال کرنے کا رواج پیدا کیا، وہ خود بہترین عربی داں تھے، بولنے میں ان کو اہل زبان جیسی مہارت حاصل تھی، بے شمار اشعار یاد تھے جنھیں وہ موقع ومناسبت سے ایسے بہترین انداز میں پڑھتے کہ سماں بندھ جاتا، ذریعہ تعلیم کے طور پر بھی وہ عربی زبان کا استعمال کرتے تھے، ان کے اور ان کی ہم عصر پیڑھی کے چند دیگر اساتذہ سے پہلے ہندوستان کی عصری جامعات میں عربی نہیں بلکہ عربی کے بارے میں پڑھایا جاتا تھا، وہ طاق نسیاں اور کتب خانوں کی الماریوں میں سجائی ہوئی ایک کلاسیکل زبان تھی لیکن پروفیسر راشد صاحب، پروفیسر عبدالحلیم صاحب، پروفیسر اجتبا صاحب، پروفیسر منور نینار صاحب، پروفیسر زبیر احمد فاروقی صاحب، پروفیسر ضیاء الحسن صاحب، پروفیسر عبد الحق صاحب، پروفیسر احسان الرحمٰن صاحب، پروفیسر شفیق احمد خان صاحب، پروفیسر فینان صاحب اور پروفیسر سلیمان اشرف صاحب وغیرہ نے عربی زبان کو عصری جامعات میں کتاب کی جامد دنیا سے نکال کر لب گفتار سے روشناس کروایا اور پھر عربی شعبوں میں عربی ایک زندہ ومتحرک زبان کے طور پر مسلسل رواج حاصل کرتی چلی گئی۔

پروفیسر راشد صاحب عربی اور اردو میں یکساں مہارت کے ساتھ تصنیف وتالیف میں مشغول رہے، ان کے عربی مضامین معیاری علمی مجلات میں شائع ہوتے تھے، ان کے اردو مقالات کے مجموعے دو مبسوط کتابوں، 'جدید عربی زبان وبیان کے مشاہیر' اور 'جدید وقدیم عربی زبان وادب: اشخاص وافکار' کے عنوان سے بالترتیب 2016 اور 2019 شائع ہو چکے ہیں۔

تصنیف وتالیف میں ان کا اپنا مخصوص طریقہ کار تھا، انھوں نے مجھے خود بتایا تھا کہ جب وہ کسی موضوع پر قلم اٹھانے کا ارادہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے اس سے متعلق اپنی معلومات کی تجدید کرتے ہیں، اس کے لیے دستیاب علمی مراجع کا مطالعہ کرتے ہیں اس کے بعد اس موضوع پر غور وفکر کے طویل عمل کے لیے کافی دنوں کا وقت اور وقفہ رکھتے ہیں، پھر ان کتابی معلومات کے ہر پہلو کا اپنے انداز سے جائزہ لینے اور اپنی سوچ سے اخذ کردہ نتائج کی روشنی میں موضوع کے اجزاء ترکیبی کو مرتب کر لینے کے بعد حاصلِ فکر ومطالعہ کو ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں۔ اس حقیقت کا مجھے خود بھی متعدد مرتبہ ادراک ہوا کیونکہ پروفیسر راشد صاحب عام طور سے اپنے ہاتھ سے کچھ لکھنے کے بجائے اپنے بعض شاگردوں، جن میں بعض اساتذہ بھی شامل ہیں، کو اپنے گھر مدعو کرتے، کاغذ اور قلم دے کر املا شروع کرا دیتے، بہترین منطقی ترتیب سے موضوع کے مشمولات پر بولتے چلے جاتے جملوں کے تسلسل اور ان کی ساخت باہم اتنی مربوط اور معقول ہوتی کہ کسی جملے میں ترمیم یا کسی ترکیب میں تبدیلی کی ضرورت نہ پڑتی، ایسے مواقع پر عام طور سے ایک طویل نشست میں مقالہ پورا کروا کر ہی اٹھتے، استاذ محترم کے ملفوظ افکار کو ضبطِ تحریر میں لا کر مقالات کی شکل میں لانے کی سعادت کئی مرتبہ مجھے بھی حاصل ہوئی۔

ہندوستان کی عصری جامعات میں عربی زبان کی تدریس وتحقیق کا دائرہ وسیع کرنے میں جن اساتذہ کا نمایاں کردار ہے ان میں پروفیسر راشد صاحب کا نام سر فہرست ہے، انھوں نے دینی مدارس کے فارغین کو عصری تعلیم کے دھارے سے جوڑنے کے لیے ہندوستان کے بڑے دینی اداروں کی اسناد کے علمی اعتراف اور منظوری کی کامیاب کوشش کی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بڑے مدارس کے فضلا کو داخلے کی سہولت مہیا ہوئی، اسی کے ساتھ جامعہ ملیہ اسلامیہ، مدراس یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی اور دیگر جامعات میں بھی یہ خوشگوار سلسلہ شروع ہوا۔

عربی زبان وادب کی تدریس وتعلیم اور تحقیق میں نمایاں کردار کی پزیرائی اور اعزاز کی خاطر پروفیسر راشد صاحب کو 1994 میں صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے ایوارڈ سے نوازا گیا۔

> **میں ہمیشہ اس بات پر قائم رہا ہوں کہ جو بھی زبان ہو اور اس کے جو بھی اصول و ضوابط ہوں اس کو پوری طرح ملحوظ رکھنا چاہیے، شخصیات کے تبصرے میں جو بھی تنقیدی پہلو ہوں اس میں ہمیشہ اعتدال پسندی ہونی چاہیے، عام طور سے نوجوان لکھنے والے جن کا قلم جوش میں بہہ جاتا ہے وہ صحیح بات پیش کرنے کے بجائے چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھ جاتے ہیں اور تنقید میں بھی ان کا رویہ معتدل نہیں رہتا، ان کی تنقید کبھی تحقیر اور تنقیص میں بدل جاتی ہے۔**

راشد صاحب کے علمی نقوش کی تابندگی سے بھی کچھ زیادہ تابناک ان کی سیر چشمی اور علم کے وقار کی حفاظت ہے۔ اس متاعِ بے بہا کی قدر دانی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ سود وزیاں کی لغات سے اختلاف کی اخلاقی اور ظرف مندانہ ہمت اور حوصلے کا مظاہرہ کیا جائے۔ میں نے ان کو عظیم اہل علم کے ساتھ نیاز مند اور دوسری وجوہات کی بنا پر نمایاں افراد سے روگرداں اور بے نیاز دیکھا، ان کی یہ ادائے درویشانہ دل میں ان کے مقام کو بہت بلند کر گئی۔

پروفیسر راشد صاحب کو تدریسی خدمات سے سبکدوش ہوئے پچیس سال مکمل ہو رہے تھے، ہم اس موقع کو جشنِ سیمیں کا نام دے کر خوش ہونے اور شکر ادا کرنے کی تیاری میں تھے کہ دو ہفتے کی شدید علالت کے بعد 2 مئی 2021 بمطابق 19 رمضان المبارک انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا، اور کورونا وبا کی قہر سامانیوں کے درمیان ہندوستان میں عربی زبان سے وابستہ وسیع تر خاندان کے اس رکن رکین کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

■

Prof. Abdul Majid Qazi
Dept of Arabic
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

سی موہن

ادب کے سفیر
مدن لال منچندہ

ممتاز قلمکار مدن لال منچندہ جو پچھلی 7 دہائیوں سے اردو، انگریزی اور ہندی تینوں زبانوں میں تصنیف و تالیف کا قابل ستائش کام کرتے آرہے تھے، اچانک ایک مئی 2021 کو اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

منچندہ کا انداز تحریر الگ تھا، سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں تجسس کو بنائے رکھنے کی ایک قوت تھی۔ معمولی سے معمولی واقعہ یا موضوع کو جاننے، سمجھنے اور پرکھنے کا ان کا نظریہ بالکل الگ تھا۔ تحریر کے لیے مناسب اور موزوں الفاظ کا انتخاب اور انھیں دلچسپ پیرائے میں پرونے کے آرٹ میں ان کے قلم کو مہارت حاصل تھی۔ منچندہ جی کے مضامین اور کہانیوں کو پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے انھوں نے اپنی تحریرو ں میں ہمارے احساس اور تجربوں کو شامل کردیا ہو۔

مدن لال منچندہ کی پیدائش 15 مئی 1924 کو ان کے آبائی گاؤں متور میں ہوئی جو موجودہ پاکستان کے راولپنڈی ضلع میں ہے۔ والد آر ایل منچندہ نے ان کا نام ودیا ساگر رکھا جو ان کی ماں تارا کو بھی پسند تھا، لیکن خالہ کے کہنے پر مدن لال رکھ دیا گیا اور پھر یہی ان کی پہچان بن گیا۔ ان کی ابتدائی تعلیم راولپنڈی کے سناتن دھرم اسکول سے شروع ہوئی، جو بعد میں پنجاب یونیورسٹی سے ملحق سناتن دھرم کالج کے نام سے مشہور ہوا۔ اسی مشہور کالج سے انھوں نے اردو میں بی اے آنرس کی ڈگری حاصل کی اور اس کے بعد ناگپور یونیورسٹی سے انگریزی زبان و ادب میں ایم اے کیا۔

لکھنے کا شوق اسکول کے دنوں سے ہی تھا۔ اس کا سہرا منچندہ جی اس سرزمین کو دیتے ہیں جہاں ان کی پیدائش ہوئی اور اس اسکول کو جہاں انھوں نے تعلیم حاصل کی اور سب سے زیادہ اپنے وِدوان اور قابل استاد کو جنھوں نے رہنمائی اور تربیت کی، ان کی کتاب 'ریالٹی دی لائٹس' میں شامل ان کی تحریر 'دی آئیڈیل ٹیچر' انہی استاد کی خاص صلاحیتوں کی عکاسی ہے۔

قلم سے ان کی محبت کا رشتہ دنوں دن اور مضبوط ہوتا گیا اور پھر ان کا جنون بن کر زندگی کی آخری سانس تک قائم رہا۔ برطانوی سامراج کے دوران سینٹرل آرڈی نینس ڈپو جبل پور میں ان کی تعیناتی کا پہلا دن تھا۔ ڈپو میں انتظامی شعبے اور اسٹور کی ذمے داری کسی دیا جائے، یہ فیصلہ لینے کے لیے انگریزی میں ایک مضمون لکھنے کو کہا گیا۔ عنوان تھا 'فرام سٹی ٹو سی او ڈی'۔ منچندہ جی کے مضمون نے انگریز افسران کو اتنا متاثر کیا کہ انھیں ان کی صلاحیت کی بنیاد پر انتظامی شعبے ہی نہیں بلکہ انتظامی افسر کی حیثیت سے تقرر کر کے داخلی مراسلت پر دستخط کرنے کا پاور بھی عطا کردیا۔ اس فیصلے سے ان کے شوق کو اور مہمیز ملی۔

ایک ادیب کے طور پر انھوں نے اپنا سفر اردو کہانیوں اور مضامین سے شروع کیا جو کئی برسوں سے اردو کے معروف رسائل جیسے شمع، سشما، بانو، کھلونا، سفینہ، ندیم، افکار اور آجکل میں شائع ہوئے۔ ان کے مضامین اور کہانیوں میں انسانی رشتوں اور جذبات کو مرکزیت کے علاوہ عام آدمی کو ایک نئی سوچ دینے اور اسے اخلاقی اقدار کے تئیں باشعور کرنے اور سماج کو بہتر سمت دینے کا مقصد ہے۔ ماہنامہ آجکل اردو میگزین میں ان کا آخری مضمون 'یادوں کی مہک' نومبر 2020 کے شمارے میں شائع ہوا جو اردو کے مشہور شاعر نریش کمار شاد سے ان کی ایک دلچسپ ملاقات کے بارے میں ہے۔

ان کی کتاب 'چراغ آرزو' 21 کہانیوں کا مجموعہ ہے جو زندگی کے متنوع پہلوؤں اور اس کے مستحکم اقدار کو بیان کرتا ہے۔ کتاب کی کہانی 'سفید کوے' کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''جہیز کے تحفوں میں رکھی ایک خوبصورت گھڑی شادی والے گھر سے غائب ہوجاتی ہے۔ آنٹی تبسم نے ٹالنا چاہا، لیکن مہمانوں کے زور پر گھڑی کے غائب ہونے کی بات بتانی پڑی۔ سبھی ایک دوسرے کو شک کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ میں نے چاروں طرف دیکھا کہ کہیں لوگ میری طرف تو نہیں دیکھ رہے ہیں۔ پوری تسلی ہوجانے پر میں نے دھیرے دھیرے چلنا پھرنا شروع کردیا۔ اپنے دل کو تسلی دینے کی غرض سے میں نے ایک بار کھانسا بھی، اچانک مجھے اپنی شلوار کے ایک کنارے کے اوپر اٹھے ہونے کا احساس سا ہوا اور میں گھبرا کر بیٹھ گئی۔

''بی رضیہ تمھیں کچھ معلوم ہے؟''

ایک انجان آواز ابھری۔

''نہیں تو''

میں نے کچھ گھبراہٹ کے عالم میں جواب دیا:

''اجی رضیہ بیچاری سے کیا پوچھتے ہو۔ ہماری رضیہ تو ایک اچھی بیٹی ہے۔''

میری ممی نے میری معصومیت کا اعلان کرتے ہوئے کہا:

''میری جان میں جان آئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ کمبخت گھڑی کا الارم میری شلوار کی تہوں سے گھٹی گھٹی آواز میں چیخ اٹھا۔ تو میں کانپ اٹھی۔ سب کی نظریں میری طرف تھیں اور میری ممی کی آنکھیں انگارے برسا رہی تھی۔ باہر موسلا دھار بارش ہورہی تھی لیکن میں ڈوب مرنے کے لیے چلو بھر پانی کو ترس رہی تھی۔ شرم سے میری نگاہ اوپر نہ اٹھتی تھی۔ میں دائیں بائیں جھانک رہی تھی، کھڑکی سے سامنے چھت پر بیٹھے ہوئے کوے بھی مجھے سفید دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے پروں کی سیاہی سے کہیں زیادہ سیاہ میرا یہ کارنامہ تھا۔''

ان کہانیوں کے مجموعے کا ہندی اور انگریزی ایڈیشن 'ڈیپ آشاؤں کا' کے عنوان سے اپریل 2020 میں شائع ہوا ہے۔

منچندہ جی کو ان کی کتاب 'کاروان اردو' کے لیے 2010 میں اردو اکادمی ایوارڈ دہلی سے نوازا گیا۔ یہ ادبی اور سماجی مضامین کا انتخاب ہے۔ کتاب کے پہلے مضمون 'یاد ایک رنگین شام کی' میں سابق صدر، ڈاکٹر شنکر دیال شرما کی تقریر کا یہ حصہ بہت دلچسپ ہے:

''جب میں صدر تھا، میں نے پاکستان کے سفیر سے کہا تھا کہ اردو ہماری زبان ہے اور اس کا رتبہ دوسری ہندوستانی زبانوں کے برابر ہے۔ اب ایک بار پھر میں منچ سے سبھی سامعین ہندو مسلم سکھ اور سبھی مذہب کے لوگوں کو کہتا ہوں کہ اردو کو زندہ رکھنا ہماری ذمے داری ہے۔''

اردو ادب کے کئی اہم پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس میں عام آدمی کی سماجی زندگی سے متعلق موضوعات پر بھی مضامین شامل ہیں۔ کتاب کے ایک مضمون 'آپ کے بچے کو کن کتابوں کی ضرورت ہے' سے ایک اقتباس:

''بچے کی تعلیم تو اس کی پیدائش کے ابتدائی مہینوں سے شروع ہوجاتی ہے۔ ماں کی لوریاں تو اس کا پہلا سبق ہیں۔ ماں کی پچکار، جھنجھنے کی آواز، روتے ہوئے بچے کو خاموش کرادیتی ہے۔ مختلف آوازوں میں تمیز کرنے کی قوت کے ساتھ ساتھ اس کی قوت مشاہدہ بھی ترقی کرنے لگتی ہے۔ وہ ماں کے مسکراتے چہرے اور اس کے بدلتے ہوئے تیور کو پہچاننے لگ جاتا ہے۔ ماں کا چہرہ اس کے لیے کتاب کا ورق ہے، چھوٹی عمر کے بچوں کو اکثر اپنی حفاظت کا خیال مقدم رہتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ جن باتوں یا

تصویروں سے بچوں کے دل میں خوف پیدا ہوا ان سے احتراز واجب ہے۔ جنوں اور پریوں کی کہانیاں جن سے ڈر پیدا ہونے کا احتمال ہو، اس عمر کے بچوں کے لیے ٹھیک نہیں۔

تلاش کرنے سے ہر موضوع پر آپ کو بے شمار کتابیں مل جائیں گی لیکن کون سی کتاب آپ کے بچے کے لیے اس کی عمر کے مطابق ٹھیک ہے اور اس میں کون سی اچھی ہے اس کا فیصلہ اور ذمے داری یقیناً آپ پر ہے کیونکہ کتابیں ایک دوسرے سے اتنی مختلف ہوتی ہیں جتنی ہیرے جواہرات سے کنکر۔"

'کاروان اردو' کے کچھ اور مضامین اس طور پر ہیں۔ امیر خسرو کا اجتہاد، اردو کی قدیم داستانیں، اردو ادب اور عصری آگہی، اردو ڈرامے کا ارتقا، اردو شاعری میں حب الوطنی کے اثرات، اردو شاعری اور برسات، ادبی ذوق، شوہر کی قسمیں، نئی دلہن، نئے مسئلے، یہ غلط فہمیاں، آپ کو آرام کی سخت ضرورت ہے۔

اردو کی طرح انگریزی میں بھی ان کے قلم نے انھیں تحریر وتصنیف کے میدان میں مضبوطی سے قائم کیا۔ مدن لال منچندہ نے مختلف موضوعات پر مضامین، کہانیاں لکھیں جنھیں انگریزی کے اہم روزنامے اور مؤقر مجلّات جیسے ہندوستان ٹائمز، ٹائمز آف انڈیا، انڈین ایکسپریس، پائنیر، امرت بازار پتریکا، فری پریس جرنل، اورینٹ، لنک، دی السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا نے شائع کیا۔

:Glimpses of Modern Urdu Literature

یہ انگریزی میں ان کی سب سے اہم تصنیف ہے۔ اس میں اردو ادب کی تقریباً ہر صنف شامل ہے۔ یہ بھی ممتاز انگریزی اخبارات اور مجلّات میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس میں اردو کے ممتاز شاعروں، ادیبوں کو ان کی تحریر اور امتیازات سے ہم آہنگ رکھنے والے مناسب عنوان کے ساتھ، ان کی شاعری، چنندہ اشعار اور ان کے معانی کی تشریح، آسان ترجمے کے ساتھ دی گئی ہے تاکہ قاری آسانی سے سمجھ سکے۔

اس کتاب میں اردو ادب سے متعلق ان کی اہم تخلیقات ہیں جنھیں انھوں نے اپنی ذہنی لیاقت اور تحقیق کی بنیاد پر لکھا ہے۔

کتاب میں شائع مضامین کی تفصیل حسب ذیل ہے: ہیومرس انٹرپریٹیشن آف غالب، غالب اینڈ ذوق دی انکمپریبل رائیولس، پوئٹ ہوگیو اردو اِٹس فرسٹ لیڈی لو، احسان دانش: دی پوئٹ آف دی آپریسڈ، فیض احمد فیض پوئٹری، مارکس دی ڈان آف نیو ایج اِن اردو پوئٹری، جوش ملیح آبادی: دی پوئٹ آف ریوولیوشن، ساغر

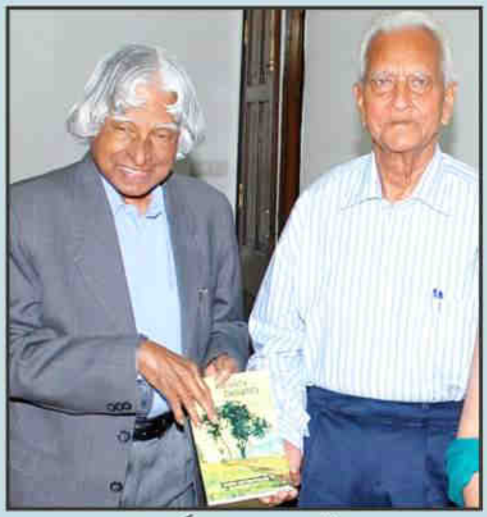

نظامی: اے نیشنل پوئٹ، فراق امپیکٹس آن اردو پوئٹری، جگر مرادآبادی: دی اسانچ ٹریڈیشنلسٹ، نریش کمار شاد: دی پروگریسیو ٹریڈیشنلسٹ، کیفی اعظمی دی ریڈ روز آف اردو پوئٹری، ساحر لدھیانوی: پوئٹ اینڈ تھنکر، ساحر اینڈ نیوکلیر ہولوکاسٹ، سلام مچھلی شہری: این انتھرپلنگ، لری سسٹ، کرشن موہنس پوئٹری، اے گلو آف اٹیلکچولزم، اسٹوری آف اسٹوری: این انکاؤنٹر وِد پی این ڈار، کرشن چندر اینڈ ہز آرٹ سوشیالسٹک ریلزم، اے رائٹر وِد ڈفرینس، ریمبلر اِن اردو فکشن، وہیئر کریٹسرم فیلس، لو اِز دی اِی ٹرنل پیشن، اسٹوری اسپنر اور ایلیٓ پکچرس۔

انگریزی میں لکھی گئی اس کتاب سے اردو ادب کے بارے میں جاننے کے خواہش مند ان لوگوں کو بہت فائدہ ہوگا جو اردو نہیں جانتے۔

'ریالٹی ڈیلائٹس' منچندہ جی کی یہ کتاب حقیقی زندگی کے واقعات کی عکاسی کرنے والی مختصر کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں عام لوگوں کے ساتھ ساتھ سماج، کھیل، ادب اور قومی تعمیر کے میدان میں اعلیٰ کارنامہ دینے والے لوگ بھی شامل ہیں۔ کہانیاں دلچسپ اور فکر انگیز ہیں۔ ان کا مقصد لوگوں میں زندگی کی مثبت قدروں کو قائم کرکے بہتر سماج تشکیل دینا ہے۔ اس کتاب کا اجرا سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام نے کیا۔

پری شیکس میموریز: مضامین کا یہ مجموعہ ان مقامات سے متعلق ہے جہاں کا دورہ خود مصنف نے کیا تھا یا ان اہم سیاسی قائدین، ممتاز ادیبوں اور قلمکاروں پر ہے جن کی ادبی صلاحیت کے تعین قدر کا موقع مصنف کو حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ کتاب کے مضامین اجتماعی مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کتاب میں شامل ان کی تحریر 'ڈاکٹر کلام کے ساتھ ایک یادگار شام' کا ایک اقتباس:

"میری کتاب ریالٹی ڈیلائٹس' کے اجرا کے بعد ڈاکٹر کلام نے مجھ سے سوال کیا "سر آپ کیسے لکھتے ہیں؟" ایک پل میں مجھے یہ سوال میرے اپنے بچپن کے دنوں میں لے گیا۔ میں اپنی ماں کے گود میں ایک بچے کے روپ میں چمکتے گھوڑوں کے کھلونوں کو دیکھ کر مست تھا اور بنجارہ سے یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس نے اتنے پرکشش گھوڑے کے کھلونے کیسے تیار کیے۔ زیادہ کچھ نہیں ہم صرف آٹے کا پیسٹ تیار کرتے ہیں اور گھوڑے بنانا شروع کردیتے ہیں۔ اس کا آسان سا جواب تھا۔ مگر میرے متجسس ذہن کو مطمئن کرنے کے بجائے اس نے میری حیرت میں اور اضافہ کردیا۔ آج ایک بار مجھے لگا کہ میں الجھے ہوئے راز کا جواب دینے کے لیے چوراہے پر کھڑا ہوں، سیدھے لفظوں میں کہیں تو قلمکار صرف اپنے قلم کو کاغذ پر رکھتا ہے اور لکھنا شروع کردیتا ہے۔ لیکن یہ کم لگا۔ میں نے ایک مناسب جواب کے لیے خلا میں دیکھا، مگر بغیر کسی کامیابی کے۔ اچانک مجھے یاد آیا جو قلمکار کو ایک چھوٹی کہانی بنانے کے لیے انسپائر کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی چبھن اس کی آتما میں حلول کرگئی ہو یا طنز جس نے اس کی ذہنی دنیا کو منہدم کردیا ہو یا ایک چبھن جس کا استعمال وہ ان لوگوں پر کرنا چاہتا ہے جنھوں نے اسے اتنی شدت سے محسوس نہیں کیا۔ یہ جواب مناسب محسوس ہوتا ہے لیکن اسے کسی ایسے شخص تک پہنچانا عجیب ہوگا جو خود ایک مشہور اور ماہر قلمکار ہے۔ لگ بھگ ایک درجن کتابیں لکھی ہیں، خاص طور سے ونگس آف فائر (11 زبانوں میں ترجمہ)، اگنائی ٹیڈ مائنڈس جیسی کتابیں شائع ہونے کے ساتھ ہی بک گئیں۔ ایک بار پھر میرے دماغ میں یہ بات کوند گئی کہ میں ایک معمولی قلمکار ہوں اور ایک بڑے وژن والے تخلیقیت پسند شاعر کو یہ جانکاری دینا مناسب نہیں تھا جس نے دل کو چھو لینے والی نظمیں تخلیق کی ہیں۔ میں ایک بھنور میں پھنس گیا تھا لیکن یہ دیکھ کر کہ ان کی آنکھیں ابھی بھی سوال کے جواب کے لیے مجھ پر ٹکی ہوئی تھیں۔ مجھے جلدی سے یہ کہہ کر بچنے کے لیے ایک آسان راستہ مل گیا کہ عالیجناب! اسے بتانا مشکل ہے۔ ان کے مسکراتے چہرے نے اشارہ دیا۔ انھوں نے میرے جواب کو خوشگوار انداز سے قبول کرلیا تھا۔"

منچندہ جی نے ایک بھری پری ادبی زندگی کاغذ قلم کی دنیا میں لمبے وقت تک رہ کر بسر کی۔ علم کی جتنی قوت ان میں تھی اسے سمیٹ کر انھوں نے اپنی تحریر میں سمو دیا۔ یہ گنے چنے قلمکاروں کو نصیب ہوتا ہے۔ اپنے علم اور تخلیقی صلاحیت کی جو مثال انھوں نے قائم کی اسے دیکھتے ہوئے یہ کہنا کوئی غلط نہ ہوگا کہ وہ وہ دریا سا گر یعنی علم کا سمندر تھے۔

(ہندی سے ترجمہ)

■

C. Mohan
1140 Sector-21
Gurgaon-122016 (HR)
Mobile 9811467241

اقبال مجید کا تخلیقی سرمایہ

جگدمبا دوبے

اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں اقبال مجید کا نام 1960 کے بعد کی نسل میں بے حد شہرت کا حامل ہے۔ راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو وغیرہ کے بعد افسانہ نگاروں کی جو نسل آتی ہے اس میں رام لعل، اقبال متین، جیلانی بانو، عابد سہیل، رتن سنگھ، جوگندر پال اور اقبال مجید خاص ہیں۔

اقبال مجید مزاجاً غیور، حاضر دماغ، اصول پسند و بلند ذہن، گفتگو اور لہجے میں سادگی، ادبی حلقوں میں مقبول، ہمہ گیر وہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ رسالہ 'بیسویں صدی' کے سالنامہ میں ان کے متعلق رشید انجم صاحب لکھتے ہیں:

"باتوں میں نرمی، طبیعت میں گرمی، خود ستائی کا ہے گمان۔ خود نمائی ذات کی پہچان۔ ترش روئی گمان سے باہر، نرم خوئی مزاج کے اندر۔ خود کو شناخت کرتے ہیں۔ ادب کی پرورش و پرداخت کرتے ہیں۔ سکوت لب کا مفہوم جانتے ہیں۔ کون کتنا ہے اوچھا، خوب پہچانتے ہیں۔ قوت باصرہ سے ہیں محروم، کتنے تکلم ہائے متکلم کیوں میاں باندھتے ہو تمہید۔ صاف کیوں نہیں کہتے، یہ ہیں اقبال مجید!"

(بیسویں صدی نئی دہلی، فروری 2005 ص 9)

سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس، قرۃ العین حیدر وغیرہ تو ایسے نام ہیں جنھوں نے اس عہد کی پوری نسل کو متاثر کیا تھا۔ اقبال مجید نے بھی ان کا اثر قبول کیا۔ خصوصاً راجندر سنگھ بیدی کا ان پر گہرا اثر ہے۔ حالانکہ اقبال مجید نے ان افسانہ نگاروں کو جنھوں نے انھیں متاثر کیا موضوع اور بیان کے طور پر بہت کم ہی دہرایا ہے۔ جس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ان کے فن میں بتدریج تبدیلیاں آتی رہیں۔ یہاں یہ بات اور بھی واضح ہوجاتی ہے کہ ان کی افسانہ نگاری 'عدو بچا' سے شروع ہوکر 'بے صورتی کی صورتیں' اور 'کم جینے والا بچہ' تک کا تکنیکی سفر بیان اور اختصار کے اعتبار سے خاصا لمبا ہے۔ ان کے اس فنی سفر میں سیدھے سادے بیانیہ افسانے بھی ہیں۔ جس میں ان کا متنوع انداز موجود ہے اور 'خدا عورت اور مٹی' اور 'ملک یاقوت کا نوحہ' جیسے تمثیلی اور استعاراتی افسانے بھی شامل ہیں۔

اقبال مجید نے جس دور میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا ہے یہ وہ دور تھا جب افسانے کے تخت پر کرشن چندر، بیدی، منٹو اور عصمت وغیرہ کی حکومت تھی۔ ایسے لوگوں کے درمیان اپنی شناخت پیدا کرنا بلاشبہ مشکل کام تھا لیکن اقبال مجید نے اپنے فن، طرز ادا نگی اور زبان و بیان کی سادگی کی وجہ سے قارئین کے ذہنوں پر اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔ اس ضمن میں سہیل اختر صاحب لکھتے ہیں:

"52 اور 53 کے درمیان اقبال مجید اپنی (اس وقت تک کی) زندگی کے بہترین افسانے لکھے جن میں سے چند تو اسی زمانے میں مختلف ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہوکر شائع ہوئے۔ کئی ایک افسانے ہندوستان اور پاکستان سے نکلنے والے مختلف رسالوں کے 'سال کے بہترین افسانے' یا 'سال کا منتخب ادب' کے ناموں سے انتخاب میں بھی شامل ہوئے۔" (کتابی سلسلہ ارتکاز نمبر 25 ص 244)

اب اقبال مجید کے افسانے رفتہ رفتہ منظر عام پر آنے لگے۔ قاری اور اڈیٹر نے جب ان کے افسانوں کی تعریف کی تو ان کی حوصلہ افزائی ہوئی اور نئے جوش و خروش کے ساتھ اپنے نظریات افسانے میں شامل کیے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ایک افسانہ 'عدو بچا' لکھا جو ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہوا۔ اس ضمن میں اقبال مجید رقم طراز ہیں:

"اس دہائی میں ہم نے اپنا وہ افسانہ بھی لکھا جس نے پہلی بار اس وقت کے ادیبوں اور ناقدوں کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا 'عدو بچا'۔ سب سے پہلے یہ افسانہ کمال احمد صدیقی نے سنا اور وہ مجھے ڈاکٹر محمد حسن کے پاس لے گئے جو اس وقت لاٹوش روڈ پر ایک معمولی سے مکان میں قیام پذیر تھے۔ میں نے ان کو بھی سنایا۔ پھر انجمن ترقی پسند

مصنفین کے جلسے میں جہاں ہمارا اکثر آنا جانا رہا کرتا تھا، پڑھنے کا موقع ملا۔'' (کتابی سلسلہ 'ارتقا' نمبر 25، ص 258)

منشی پریم چند نے حقیقت نگاری کی ابتدا تو بہت پہلے ہی کردی تھی لیکن دنیائے افسانہ نگاری میں رومانوی انداز کے افسانوں کا بھی بول بالا تھا۔ حقیقت نگاری سے دور دنیائے تخیل آباد کی جارہی تھی۔ رومانی فضا، طویل مکالمے، خوبصورت لفظیات اور طویل منظر کشی افسانوں میں شامل تھی۔ اقبال مجید کا عنفوان شباب تھا، یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب انسان جذباتیت اور رومان انگیزی کی طرف خود مائل ہوجاتا ہے۔ اس وقت کے افسانوں اور ان کی شہرت سے وہ بھی متاثر ہوئے۔ چنانچہ اقبال مجید احتشام حسین صاحب سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ اقبال مجید خود لکھتے ہیں:

''ادب کے بارے میں ایک بنیادی رویہ اور مزاج بنانے میں ہماری نسل کے لکھنے والے ساتھیوں پر احتشام صاحب کا بڑا احسان ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ انھوں نے ہمیں آر پار دیکھنا سکھایا۔ آر پار دیکھ پانا ایک دم سے نہیں ہو پاتا۔ پھر ادب میں ایک نظر میں اور ایک بار میں آر پار دیکھ پانا اور بھی مشکل ہوتا ہے کیونکہ ہر عہد ادب کو اپنے دور کی پالیٹکل کیمسٹری سے غسل دینے کی لازمی بدعت کے ہاتھوں مجبور ہے۔'' (کتابی سلسلہ 'ارتقا' نمبر 25، ص 261)

اقبال مجید کے ملازمت میں آجانے اور مصروفیت بڑھ جانے کے بعد بھی ان کے افسانوں پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ اس زمانے میں انھوں نے جو قابل ذکر افسانہ لکھا وہ ''دو بھیگے ہوئے لوگ'' ہے۔ اسی عنوان سے ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس میں ان کے 15 افسانے شامل ہیں۔ ان کا یہ مجموعہ 1970 میں نصرت پبلشرز لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اسی زمانے میں ایک اور قابل ذکر افسانہ 'پیٹ کا کیچوا' لکھا لیکن یہ افسانہ سب سے پہلے اردو میں نہ شائع ہوکر ہندی میں کلکتہ کی میگزین 'گیان اودے' میں شائع ہوا جس کے ایڈیٹر اس وقت رمیش بخشی تھے۔ اس کے بعد اردو میں اسے الہ آباد کی میگزین 'شب خون' میں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے شائع کیا۔ پھر تو یہ افسانہ انگریزی زبان میں تو شائع ہوا ہی لیکن اس کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ ہوکر شائع ہوا۔ اس کے چند دنوں بعد ان کے افسانے 'پوشاک' کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ جیسا کہ اقبال مجید صاحب خود رقم طراز ہیں:

'' 1970 اور 1983 کے درمیان تو کئی افسانے لکھے لیکن جو مقبولیت اور شہرت 'پوشاک' کو ملی وہ اوروں کو نہ مل سکی۔'' (کتابی سلسلہ 'ارتقا' نمبر 25، ص 268)

یہ افسانہ بعد میں روسی زبان میں ترجمہ ہوکر ماسکو کی ایک انتھالوجی میں شامل ہوا۔ اس کے بعد ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ 'ایک حلفیہ بیان' 1980 میں نصرت پبلشرز لکھنؤ سے شائع ہوا جس میں 16 افسانوں کو شامل کیا گیا ہے۔ افسانہ 'پوشاک' بھی اسی مجموعے میں شامل ہے۔ ان کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ 'شہر بدنصیب' 1997 میں معیار پبلی کیشنز نئی دہلی سے شائع ہوا۔ اس میں شامل سبھی افسانوں کی تعداد 15 ہے۔ اس افسانوی مجموعے کو اقبال مجید نے اپنی شریک حیات عصمت اقبال کے نام کیا ہے۔ ان کے چوتھے افسانوی مجموعے 'تماشا گھر' میں کل بارہ افسانے ہیں جو کہ 2003 میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا۔ اپنے اس مجموعے کو انھوں نے اپنے بیٹے ارشد اقبال عرف رومی کے نام کیا ہے۔

اس کے علاوہ ان کے مختلف افسانوں کے دیگر زبانوں ہندی، مراٹھی، انگریزی اور روسی میں ترجمے بھی ہوئے جو کہ ادبی دنیا میں کافی مقبول ہوئے۔ اس کے بعد ان کی دو کہانیاں ساہتیہ اکادمی کے انگریزی جریدے Indian Literature میں منتخب ہوکر شائع ہوئیں۔ بین الاقوامی اشاعتی ادارے Penguin کی جانب سے محمد عمر میمن کی ادارت میں شائع ہونے والی اردو کے جدید افسانوں کی Anthology(1991) میں ان کے افسانے 'پیٹ کا کیچوا' کا انتخاب ہوا اور ترجمہ کرکے شائع کیا گیا۔ اقبال مجید اس ادارے کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتے تھے اور سوچتے تھے کہ کیا کبھی میری لکھی ہوئی چیز بھی یہ ادارہ اسی شان سے شائع کرے گا جیسا کہ شائع کرتا ہے۔ ان کی یہ آرزو 1990 میں پوری ہوگئی۔ جیسا کہ انھوں نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے:

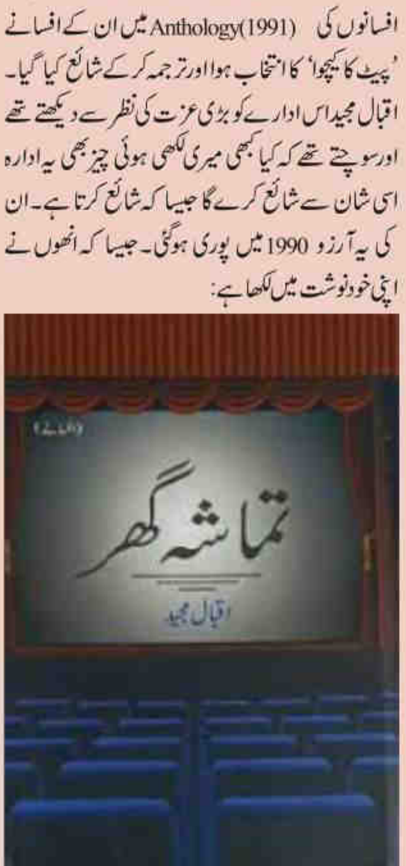

''ہمیں کیا خبر تھی کہ ہماری یہ آرزو 1990 میں پینگوئین کے ذریعے چھاپی گئی اس انتھالوجی سے پوری ہوجائے گی جو محمد عمر میمن کی ادارت میں The colour of nothingness کے نام سے آج برصغیر اور یوروپ وغیرہ میں سب کے ہاتھوں میں ہے اور جس میں ہمارے افسانے 'پیٹ کا کیچوا' کا زبردست ترجمہ بھی براجمان ہے۔''
(کتابی سلسلہ 'ارتقا' نمبر 25، ص 269)

اپنی اس تخلیق کے شائع ہونے سے اقبال مجید بے حد خوش ہوئے۔ اس خوشی کا اظہار انھوں نے اپنی خود نوشت میں کیا ہے۔ واشنگٹن (امریکہ) سے جدید اردو افسانے پر شائع ہونے والی انتھالوجی The tale of the old fishermant میں ان کے ایک افسانے کا انتخاب ہوا اور ترجمہ کرکے شائع کیا گیا۔ اس طرح ان کے افسانوں کو اردو زبان وادب کے ساتھ ساتھ دیگر زبان وادب کو جاننے والے لوگوں کو بھی پڑھنے کا موقع حاصل ہوا اور لوگوں نے ان کے افسانے کو بے حد پسند بھی کیا۔

اقبال مجید کے شاہکار افسانوں میں عدو چچا، ٹوٹی چمنی، آئینہ در آئینہ، دل چارہ گر، پیٹ کا کیچوا، میرے بعد، ایک رات ایک دن، دو بھیگے ہوئے لوگ، پوشاک وغیرہ ہیں۔ ان افسانوں سے ان کے گہرے سیاسی وسماجی شعور اور ترقی پسند سوچ وغیرہ کی عکاسی ہوتی ہے۔ کردار نگاری، جزئیات نگاری اور پلاٹ پر ان کی بھرپور گرفت ہے۔

دنیائے ادب میں اقبال مجید صرف افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ ناول نگار بھی ہیں۔ یہ بات دیگر ہے کہ ان کے ناولوں کی تعداد صرف دو ہے۔ ان کے دونوں ناول ملازمت سے سبک دوشی اختیار کرنے کے بعد شائع ہوئے۔ ان کا پہلا ناول 'کسی دن' جنوری 1998 میں نیا سفر پبلی کیشنز الہ آباد سے شائع ہوا۔ 'نمک' اقبال مجید کا دوسرا ناول ہے۔ اسے مارچ 1999 میں نیا سفر پبلی کیشنز الہ آباد سے شائع کیا گیا۔ ان کے ان دونوں ناولوں میں ناول نگاری کی بہترین تصویر ملتی ہے۔

اقبال مجید کے افسانے موضوع، زبان وبیان اور تکنیک کے سبب اپنے معاصرین میں اپنا الگ مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے منفرد استعاراتی اور تمثیلی انداز بیان سے اردو افسانے کو ایک نئی شکل عطا کی۔ ان کے افسانوں کی ایک خاص پہچان یہ ہے کہ افسانے میں علامت اور استعاراتی یا تجریدی انداز بیان ترسیل کا مسئلہ پیدا نہیں کرتا اور قاری سے افسانہ نگار کا رشتہ قائم رہتا ہے۔ انھوں نے مختلف علامتوں اور استعاروں مثلاً غم وغصہ، شک، بے اعتمادی، خوف جیسے نفسیاتی عوامل سے کام لیتے ہوئے فکشن کے بیانیہ

میں ابہام سے کام نہ لے کر اسے خوبصورت موڑ دیا ہے۔

اقبال مجید اپنے اطراف کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات پر جو بھی لکھتے ہیں اس میں سچائی ہوتی ہے، خلوص ہوتا ہے۔ ان کا مشاہدہ کافی تیز ہے۔ ان کے لکھنے کا انداز ایسا ہے کہ قاری کو لگتا ہے کہ سب کچھ اسی پر گزر رہی ہے۔ ان کو بات کہنے کا طریقہ معلوم ہے اور یہ انداز زندگی کی بسیط معلومات اور طویل تجربے پر مبنی ہے۔

ان کے افسانے کا ہر استعارہ اور ہر علامت وسیع تہذیبی اور سماجی حوالے کے ساتھ ساتھ معنویت رکھتی ہے جو کہانی کے کینوس کو محدود موضوعی حوالے سے نکال کر پورے عہد پر محیط کر دیتی ہے۔ ان کے افسانوی فن کے متعلق مہدی جعفر صاحب رقم طراز ہیں:

''بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال مجید کا فن افسانوی ذہنی تربیت اور سعی کا عمل دخل ہے۔ شعوری طور پر شامل کیا ہوا ڈرامائیت کا عنصر اس سلسلے میں ان کی مدد کرتا ہے۔ ان کے افسانوں کی زیادہ تر بنت خارجی دنیا کے حقائق، ان سے متعلق شعور، تفکر اور احساس پر قائم ہے۔ ان حقائق کو فنکار داخلی حسی کیفیات مثلاً غم وغصہ، تردد، ہچکچاہٹ یا غمناکی سے متصادم کرتا ہے اور قاری کو ایک نئی صورت حال میں ڈال دیتا ہے جو اکثر استعاراتی یا مہملیت کی صورت حال ہوتی ہے۔''

(فلیپ: شہر بدنصیب، اقبال مجید)

جدید افسانے پر ایک الزام یہ عائد ہوتا ہے کہ ابہام کہانی پن میں رکاوٹ ڈالتا ہے لیکن ان کے افسانوں میں یہ خامی نہیں بلکہ خوبی و پہچان ہے۔ اقبال مجید نے اپنے مخصوص اسلوب سے کام لیتے ہوئے جدید ٹیکنک اور روایتی انداز سے ایک نئی دنیا آباد کی۔ ان کے فن کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ انھوں نے ذاتی تجربے اور مشاہدے کو قاری کا تجربہ بنا کر اسے اپنی فکر کی گہرائی عطا کی ہے۔ ان کے متعلق پروفیسر سید محمد عقیل رضوی صاحب لکھتے ہیں:

''ان کی تحریر کے ایک ایک جملے میں زندگی کے کتنے ہی تجربے لپٹے ہوتے ہیں اور پھر دور حاضر کی عیاریاں، چالاکیاں، دھوکے دھڑی کے ساتھ ساتھ زندگی کا ایک رنگ محل بھی ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔ وہ کلاسیکی تہذیب سے لے کر آج صارفیت تک کی ایسی تصویریں پیش کرتے ہیں کہ بس دیکھتے رہ جایئے۔ یہ سلیقہ انھیں ان کی اس کمائی ہوئی زندگی سے ملا ہے جس میں مدتوں انھوں نے بادیہ پیمائی کی ہے اور اسی وجہ سے ان کی کہانیوں اور ناولٹ میں یہ بالکل منفرد رنگ ہے۔ کاش اقبال مجید 'کسی دن' اور 'نمک' جیسی دو چار مزید تخلیقات پیش کرتے

اور ان میں کوتاہ قلمی نہ ہوتی تو اردو فکشن کے رنگ محل میں ایک انوکھے انداز کا اضافہ ہوتا جو اس 'کہانی' اور 'مکڑ جال' تحریروں کے دور میں کلاسکیت، فن اور ادب کی تلاش میں گھومنے والوں کے لیے ایک پناہ گاہ بنتا۔''

(پشت، کسی دن، اقبال مجید)

اقبال مجید کا ادبی سفر طویل ضرور ہے لیکن اس سفر میں انھوں نے راہ کے گرد و غبار کو اپنا ہم سفر نہیں بننے دیا۔ انھوں نے انتہائی عرق ریزی اور باریک بینی سے جن خیالات اور افکار کو جگہ دی ان میں معنی آفرینی، ندرت بیان اور انتخاب کا شعور ان کی شبیہ کی پہچان بن کر ابھرے۔ ان کے ذہنی ارتقا اور فکری عرفان میں جذبات کی شورش نہیں بلکہ تخیلات کے بطن سے طلوع ہوتی بشارت پائی جاتی ہے۔ انھوں نے فکری سرمایہ ضرور جمع کیا لیکن اس کا انبار نہیں لگایا۔ ان کے یہاں جو کچھ بھی ہے ایک بیش قیمت ادبی سرمایہ ہے جس سے موجودہ نسل نے تو استفادہ کیا ہی ہے اگلی نسلوں میں بھی اس کی پہچان قائم رہے گی۔

اردو ادب میں اقبال مجید کے افسانے اس لیے بھی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ ان میں ان کے پہلے مجموعہ 'دو بھیگے ہوئے لوگ' سے اب تک زبردست تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے جس میں ان کا تخلیقی رویہ اور زندگی کے درپیش مسائل کا اظہار ایک نئی فضا ہموار کرتا نظر آتا ہے اور اس اظہار میں وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لاتے ہیں۔ ان کے متعلق پروفیسر شارب ردولوی کا خیال ہے:

''اقبال مجید ان لکھنے والوں میں ہیں جنھوں نے افسانے کو ایک بلیغ استعارہ بنا دیا۔ ان کے یہاں قدیم سے بھی انحراف ہے اور جدید سے بھی انحراف۔ ان کا بیانیہ لغوی معنوں میں بیانیہ نہ ہوتے ہوئے بھی ایک اندرونی تسلسل سے پیوست ہے۔ اقبال مجید کے فکشن کی ایک خصوصیت اس کی سماجیات ہے۔ میرا خیال ہے کہ اپنے عہد، اس کے تضادات، اس کی کمزوریوں اور اس کے مطالبات بڑی شدت کے ساتھ ان کے افسانے اور ناول میں سامنے آتے ہیں۔ اقبال مجید کے فکشن کا ہر استعارہ اور ہر علامت وسیع تہذیبی اور سماجی حوالے اور معنویت رکھتی ہے جو کہانی کے کینوس کو محدود موضوعی حوالوں سے نکال کر پورے عہد پر محیط کر دیتی ہے۔ اقبال مجید کے یہاں جو کرب اور جدید حسیت ہے اس نے ان کے فکشن کو انسانی نفسیات اور جدید فکر کا آئینہ بنا دیا ہے۔''

(کتابی سلسلہ 'ارتقا' نمبر 25، ص 206)

اقبال مجید کے فن میں سماجیات اور عصری مسائل، تہذیبی، سماجی و سیاسی پس منظر میں بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں جن میں ان کی فکری بصیرت، استعاروں اور علامتوں کے مخصوص اظہار اور معنویت کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ انسانی نفسیات کو بھی انھوں نے جدید حسیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کا ہر افسانہ ایک مخصوص ردعمل کی توسیع ہے جو ملک و قوم، سیاست کی بالادستی، عام زندگی کا کرب اور مسائل کو سامنے لاتا ہے۔ موجودہ دور میں ٹوٹتے ہوئے رشتے، آج کی مصروف ترین زندگی اور اس سے جڑے ہوئے واقعات ردعمل کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ان کے متعلق ڈاکٹر محمد علی صدیقی صاحب رقم طراز ہیں:

''لوگ کہتے ہیں کہ اقبال مجید نظریاتی طور پر کافی کھلے ڈھلے نظر آتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس رائے میں کافی حد تک صداقت ہے۔ شاید وہ اپنی تخلیقات کے مضمراتی پیغام (Massage) اور اپنے نظریے میں مطابقت تلاش کرنا نہیں چاہتے۔ وہ اب اپنے سماج کے اندر ہونے والی تبدیلیوں کے مشاہدے میں اس قدر مستغرق ہیں کہ ان کے لیے ان تبدیلیوں کی تخلیقی عکاسی ہی نظریہ بن گئی ہے۔ جس طرح ایک تخلیقی کیمرہ مین کی Lens میں اس کا وجود، اس کی فکر اور اس کا ذہن یکجا اور یکسو ہو جاتا ہے۔''

(کتابی سلسلہ 'ارتقا' نمبر 25، ص 190)

ایک قابل اور دیدہ ور ذہن اور نباض قلمکار زندگی کے ہر زاویے کو گہری نگاہ سے دیکھتا ہے اور پرکھتا ہے۔ واقعہ چاہے معمولی ہی کیوں نہ ہو، ایک ادنیٰ کیڑے کی موت سے زندگی کے لیے جد و جہد بظاہر عام آنکھ کے نزدیک بہت حقیر شے ہے۔ مگر قلم کار اسے موضوع بنا کر اپنے قلم سے وہ رنگ آمیزی کرتا ہے کہ پڑھنے والا افسانہ

نگار کے افکار اور خیالات کے تنوع سے نہ صرف واقف ہوتا ہے بلکہ اس کے اندر یہ سوچ بھی ابھرتی ہے تعجب ہے، یہ ادنیٰ ہستی بھی کتنی معنی خیز ثابت ہوئی۔

اقبال مجید میں فسانہ گوئی کی پوری قدرت اور فکر انگیزی کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ وہ واقعاتی متعلقات کی جستجو میں وقتِ نظر سے کام لیتے ہیں۔ سادگی اور سادہ بیانی ان کے مزاج کا حصہ ہے۔ سادگی، سادہ کاری اور سہل الفہم طرز فکر میں معنویت کی تہہ داری وہ بیدی ہی کی طرح پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

ناول میں فنکار اپنے خیالات کو پھیلا کر پیش کرتا ہے اور اس اعتبار سے اسے اظہار خیال اور زبان و بیان کو وسعت کے ساتھ ادا کرنے کی آزادی ہوتی ہے۔ پلاٹ، واقعہ نگاری، کردار نگاری اور مکالمے ناول کی تکنیک میں اہم رول ادا کرتے ہیں جس کی وجہ سے اقبال مجید اپنے ناول میں شعوری طور پر افسانے سے زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ زبان و بیان پر ان کی قدرت تہذیبی، ثقافتی اور ماحول، ناول کی فضا کو ایک تازگی عطا کرتے ہیں اور یہاں ان کی انفرادیت زیادہ نکھر کر سامنے آتی ہے۔

اقبال مجید کے دو ناول 'کسی دن' اور 'نمک' ہیں۔ ان دونوں ناولوں میں آزادی کے بعد کی سیاست، اس میں در آنے والی بدنیتی، خودغرضی، بدعنوانی اور غنڈہ گردی، سب ہی کچھ کردار اور واقعات کے حوالے سے دونوں ناولوں کا خمیر بنتے ہیں۔ ان کا سیاسی کمٹمنٹ بڑا واضح اور قطعی ہے اور ان کے افسانوں سے ناول تک اور ان کے ڈراموں میں بڑے تواتر کے ساتھ جاری و ساری رہتا ہے۔ ناول 'کسی دن' کے ضمن میں پروفیسر علی احمد فاطمی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''پورے ملک میں سیاسی، سماجی، تہذیبی اور اخلاقی اقدار بدل چکے ہیں جہاں پوری ایمانداری سے بے ایمانی ہو رہی ہے۔ پوری بے شرمی سے سیاست اور تشدد کا برہنہ کھیل ہو رہا ہے جہاں رشتوں کا تقدس، نیکی کی قوتیں انسانی و اخلاقی قدریں سب پامال ہو کر طاقت، دولت اور صارفیت کا حصہ بن رہی ہیں یا بن چکی ہیں اور ان سب کا شکار ہے عام آدمی اور وہ شریف آدمی جو اپنی شرافت اور احترام آدمیت کو گلے لگائے صحت مند افکار اور روشن اقدار کے سائے میں جینا چاہتا ہے لیکن وہ یہ بھی دیکھ رہا ہے کہ پورا معاشرہ بلکہ پوری زندگی دوہرے پن اور کھوکھلے پن کا شکار ہو چکی ہے۔ چنانچہ وہ دوراہے پر کھڑا ہے۔ تبدیلی کی ایک ایسی صورت ہے کہ جس کی راہیں کھلی ہو کر بھی مسدود ہیں جس کی کوئی منزل نہیں۔

ایسی تقلیب و تغیر کو اردو کے ممتاز افسانہ نگار اور اب ناول نگار اقبال مجید کے صحت مند ذہن نے بہت قریب سے دیکھا ہے، سمجھا ہے اور اکثر و بیشتر اس کا حصہ بھی بنے ہیں کہ وہ ایک ایسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جہاں دونوں صورتیں ان کے سامنے رہی ہیں اور ان متبدل صورتوں کے اسباب کا بھی بڑی حد تک انھیں علم ہے اور شاید غم بھی، اسی لیے ان کے مضبوط و مشاق قلم نے ان صورتوں کو اپنی تمام تر جولانیوں اور تحقیقی قوتوں کے ساتھ پہلی بار ناول کی شکل میں پیش کیا ہے۔'' (عرض ناشر، کسی دن، اقبال مجید)

افسانوں کے علاوہ ان کے ڈراموں اور ناولوں کی بھی یہی خصوصیات ہیں۔ انھوں نے ایک کامیاب مصور کا رول ادا کیا ہے جس میں ہماری ماڈرن سوسائٹی، آزاد خیالی اور ایک مخصوص طبقے کی ذہنیت کی عکاسی کی ہے۔

انھوں نے کئی سال طویل اسٹیج ڈرامے لکھے جو مختلف جگہوں پر کھیلے گئے اور عوام میں کافی مقبول ہوئے۔ اقبال مجید اس وقت سیتاپور میں مدرّس تھے۔ جب 1975 میں انھوں نے اپنا پہلا اسٹیج ڈرامہ 'کتے' لکھا۔ اس ضمن میں اقبال مجید لکھتے ہیں:

''سیتاپور کے قیام کے دوران ہم نے پہلا اسٹیج ڈرامہ 'کتے' لکھا جو ایک کامیاب Social Satire تھے جسے بلرام مترا نے اپنے رسالے میں بڑے ٹھسّے سے چھاپا تھا۔ یہ ڈرامہ 74 میں لکھا گیا تھا تب سے اس کے آٹھ دس شو مختلف جگہوں پر ہو چکے ہیں۔''

(کتابی سلسلہ 'ارتقا' نمبر 25، ص 267)

ان کا طویل اسٹیج ڈرامہ 'چاندنی کا زہر' 1983 میں تیار ہوا۔ اس ڈرامے کی بھی بے حد تعریف ہوئی۔ یہ شاہ اودھ نصیر الدین حیدر کے کردار اور عہد پر ایک بہترین ڈرامہ ہے۔ ان کا دوسرا طبع زاد ڈرامہ 'گُسر پھُسنا' ہے جو کہ 1991 میں لکھا گیا۔ یہ نہ صرف اپنے عنوان کی وجہ سے ناظر اور قاری کے تجسس کا سبب بنتا ہے بلکہ وہ انسانی تجربے کو تحریک، خلش، اضطراب، اور کرب سے دوچار کرنے والی ایک بے نام حقیقت کو ایک ڈرامائی اظہار بخشتا ہے۔ یہ ڈرامہ ان کے افسانے 'حکایت ایک نیزے کی' سے قدرے تعلق رکھتا ہے۔ ان کا ایک اور ڈرامہ 'جرم اور سزا' ہے جو روسی ناول نگار داستوسکی کے ناول Crime and Punishment پر مبنی ہے۔ ان کا یہ ڈرامہ بھی کافی مقبول ہوا۔ اقبال مجید کا تیسرا طبع زاد ڈرامہ 'تکیہ' ہے جو سنہ 1993 میں منظر عام پر آیا۔ یہ مختلف جگہوں پر کھیلا گیا اور ناظرین نے اسے بے حد پسند کیا۔ یہ ڈرامہ بھی ان کے افسانے 'سکون کی نیند' سے قدرے تعلق رکھتا ہے۔ یہ ڈرامہ روایتی ڈرامائی اسباب کے ساتھ کھیلا جانے والا ایک ڈرامہ ہے۔ اقبال مجید دوران طالب علمی کنھیا لال کپور کی معروف تحریر 'غالب ترقی پسندوں میں' کی ہدایت کے فرائض انجام دیے۔

اقبال مجید نے طویل اسٹیج ڈراموں کے علاوہ ریڈیو ڈرامے اور فیچر بھی تحریر کیا ہے۔ ان کے تحریر کردہ ریڈیو کے کئی ڈرامے اور فیچر خصوصی قومی نشریات میں شامل ہوئے۔ اپنے ریڈیائی ڈراموں اور ڈاکومنٹری فیچروں کے متعلق اقبال مجید لکھتے ہیں کہ:

''ہم نے جتنا وقت کہانیاں لکھنے پر صرف کیا ہے اس سے شاید کچھ زیادہ وقت ریڈیائی ڈراموں اور ڈاکومنٹری فیچروں کو لکھنے پر خرچ کر چکے ہیں یہ ریڈیائی ڈرامے آج ہوا میں تحلیل ہو چکے ہیں ڈاکومنٹری فیچروں کے قومی مقابلوں میں ملنے والی رقمیں ہم کھا چکے ہیں اور ان پر دی گئی توصیفی سندیں ہم نے فریم کرا کے دیواروں پر ٹانگ لی ہیں۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں ملا ہمیں انھیں وقت دے کر۔'' (کتابی سلسلہ 'ارتقا' نمبر 25، ص 269)

جب 3 دسمبر 1984 کی رات بھوپال میں یونین کاربائڈ کے زہر نے شہر میں موت کا سیلاب برپا کیا تو اقبال مجید اس وقت وہاں آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام پروڈیوسر کے عہدے پر تھے اور اس وقت بھوپال میں موجود بھی تھے۔ دو سال تک اس دردناک حادثے پر قلم نہ اٹھا سکے۔ 1987 میں ریڈیو کے لیے انھوں نے اس حادثے کو لے کر ایک فیچر تحریر کیا جس کا عنوان 'کاش اخبار جھوٹ بولتے ہوں' تھا۔ اس کے لیے انھیں قومی سطح کا اوّل انعام دہلی سے دیا گیا اور سب نے ان کی اس کوشش کی بے حد تعریف کی۔

ریڈیو ڈرامے اور فیچر کے ساتھ ساتھ اقبال مجید کی دلچسپی ٹیلی ویژن میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان کا ٹی۔ وی۔ پلے 'اب اور نہیں' لکھنؤ ٹی وی سے نشر ہوا جس میں انھوں نے خود ہدایت کاری کے فرائض کو بخوبی انجام دیا۔ یہ ٹی۔ وی۔ پلے ناظرین نے کافی پسند کیا اور اقبال مجید کی بے حد تعریف ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے بھوپال کے ٹی۔ وی۔ مرکز کے لیے اصلاحی فلم ''ہرفن مولیٰ'' تحریر کیا اور اس فلم کی ہدایت کاری اور پیش کش کو بھی بخوبی انجام دیا۔ اس اصلاحی فلم کو بھی لوگوں نے کافی پسند کیا اور ان کی فنکاری کی خوب تعریف ہوئی۔

■

Dr.Jagdamba Dubey
Asst.Professor-Deptt.of Urdu
Halim Muslim P.G.College
Kanpur-208001 (UP)
Mob.: 9415280915

فرقان احمد سردھنوی

آشفتہ چنگیزی کی غزلیہ شاعری کا

تنقیدی جائزہ

آشفتہ چنگیزی اپنی مختلف آواز اور لب و لہجے کے ساتھ جانے جاتے ہیں۔ آشفتہ چنگیزی نے غزل اور نظم دونوں صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ لیکن یہاں آشفتہ چنگیزی کی غزل گوئی کے حوالے سے گفتگو کریں گے۔

شاعری در اصل محسوسات کی مرہون ہے ایک حساس طبیعت انسان خصوصاً ایک شاعر کسی چیز کو روا روی میں نہیں لیتا وہ کسی چیز کو دیکھتا ہے تو اس کی مشاہداتی حس جاگ پڑتی ہے اور وہ اس محسوس کی ایک واضح شکل احاطۂ تحریر میں لے آتا ہے۔

الاؤ ٹھنڈے ہیں لوگوں نے جاگنا چھوڑا
کہانی ساتھ ہے لیکن کسے سنائیں گے

اس شعر میں شاعر نے محسوس کیا ہے کہ دورِ حاضر میں کسی کے پاس اتنا وقت نہیں کہ کسی کی آپ بیتی سن سکے۔ اس کی نظروں میں وہی منظر گھوم گئے جب لوگ الاؤ کے پاس بیٹھ کر لمبی لمبی کہانیاں سنا کرتے تھے۔ شاعر کی ذات آج بھی اپنے ماضی کی طرف گھوم رہی ہے۔ الاؤ علامت ہے جاگنے کی شعر بڑے سلیقے اور عمدہ پیرایے میں کہا گیا ہے۔ شعر کی زبان صاف اور سادہ ہے۔ شعر میں ماضی کا کرب بھی ہے اور تہذیب کے شکست و ریخت کا بیان بھی معنی خیز ہے۔

تمام جنگ کی تیاریاں مکمل ہیں
بہے گی شہر میں نہرِ فرات بھی اک دن

مذکورہ شعر کی ہئیتِ لفظی سے پتا چلتا ہے کہ آشفتہ چنگیزی حال کی جنگی تیاریوں میں مستقبل کی تباہی کا منظر دیکھ رہے ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ یہ جنگی تیاریاں یہ خطرناک ترین جنگی سامان تباہ کاری کا پیش خیمہ ہے۔ ان کا یہ احساس کرب ناک اور دور رس نتائج کا حامل ہے۔ نہرِ فرات بغداد کی ایک نہر کا نام ہے۔ جہاں معرکہ کربلا پیش آیا اور بہتر (72) اہلِ بیت کو اس نہر کے کنارے شہید کر دیا گیا تھا۔ اس مقام کی نحوست کی منظر کشی کرتے ہوئے آنے والے دور کی کربناک تصویر شعری قالب میں ڈھالی گئی ہے اس میں تلمیح کا پہلو موجود ہے۔ آشفتہ چنگیزی تاریخی دستاویز پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔ شعر کا بڑا کمال یہ ہے کہ مضمون میں کسی قسم کا الجھاؤ نہیں ہے۔ نہرِ فرات سے شعر میں معنویت کے ساتھ وسعتِ بیکراں آ گئی ہے۔ جس کی تشریح کے لیے کئی سو صفحات درکار ہیں۔

جانے کیا افتاد پڑی
خواب میں اس کو دیکھا ہے

کہاوت ہے کہ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ یعنی جب کوئی چاہنے کی حد تک چاہنے لگتا ہے تو اس کی ذرا سی تکلیف کو بھی روح محسوس کرتی ہے۔ اسی کیفیت کو آشفتہ چنگیزی نے شعری شکل دے کر محبت اور خلوص کے فلسفیانہ احساس کو بڑے فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ یقیناً شاعرِ موصوف محسوسات کے اسیر ہیں۔ شعر فی الواقع جتنا سادہ ہے اتنا ہی دلچسپ ہے۔

اڑنے والا پنچھی کیوں
پنکھ سمیٹے بیٹھا ہے

اس شعر کی بحر جتنی چھوٹی ہے موضوع اس سے کہیں بڑا ہے۔ اتنے مختصر لفظوں میں کسی طویل موضوع کو سمو دینے کو ہی تو ''کوزہ میں دریا کو بند کرنا'' کہتے ہیں۔ اس شعر کے ذریعے شاعر دنیا کو پیغام دینا چاہتا ہے کہ صاحبِ استطاعت انسان کیوں کسی کا محتاج رہے اور کیوں کسی کی طرف حاجت مند نظروں سے دیکھے۔ اپنی صلاحیت و قدرت کو بروئے کار لائے اور سطحِ گردوں پر چھا جائے اپنے میسر ذرائع کا بھرپور استعمال کرے بقول علامہ اقبال ''اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے''۔ موضوع بہت خوبصورت اور اپنے اندر ایک پیغام سمیٹے ہوئے ہے۔ شعر کی خوبی یہ ہے کہ بہت ہی مختصر لفظوں میں ایک جامع پیغام کا مظہر ہے۔ اس کو آشفتہ کا کمالِ شعری نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے۔

اکھڑتے جا رہے ہیں سارے خیمے
طنابیں کتنی ڈھیلی ہو گئی ہیں

یہ شعر آشفتہ چنگیزی نے خلیل الرحمٰن اعظمی کی یاد میں کہا ہے۔ اس کے ذریعے بظاہر شاعرِ موصوف نے اعظمی کے گزر جانے کو شدت سے محسوس کیا اور اپنے دلی تاثرات کو الفاظ کا قالب عطا کر دیا اور اپنے دلی درد کو کچھ کم کر لیا۔ لیکن شعر کی معنویت پر غور کیا جائے تو یہ شعر شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے بزرگوں اور اساتذہ کو خیموں سے تشبیہ دینا وسعتِ ظرف و نظر اور سعادت مندی کی دلیل ہے جس سے شاعر کے ظرف عالی کا پتا چلتا ہے۔ وقت کو طنابوں سے تشبیہ دینا اور اساتذہ کو خیموں کے مشابہہ لکھنا تشبیہات کا عمدہ استعمال ہے۔

اتنی بارش ہی بھیج دنیا میں
ڈوب کے سارے لوگ مر جائیں

بسا اوقات ایک شاعر اپنی دنیا اور اپنے ماحول کی بے رخی سے اتنا اثر لیتا ہے اور ایسی کیفیات کا شکار ہو جاتا ہے کہ

اسے اپنی زندگی بار لگنے لگتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ یہ دنیا اور اس کے لوازمات آسمانی آفتوں کا شکار ہو جائیں۔ مذکورہ بالا شعر ایسی ہی کیفیات کی دین ہے۔ شعر کے تخلیقی محرکات کا سبب شاعر کے اجتماعی لاشعور میں پیوست وہی واقعات ہیں جن کا تعلق انبیائے کرام کی ذات سے وابستہ ہے اور انھوں نے اپنی قوموں سے تنگ آکر ان کے حق میں بددعا کی تھی۔ یہ شعر انھیں تحریکات کا آئینہ دار ہے۔

جو مڑ کے دیکھا تو ہوجائے گا بدن پتھر
کہانیوں میں سنا تھا سو بھوگنا ہے مجھے

شاعر کا احساس ان کوائف کی نشاندہی کر رہا ہے جن کی بدولت انسان کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اس کے تجربات اس کو خبر دیتے ہیں کہ اس دنیا میں رہنا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ ذرا سی چوک بڑے خسارے کا سبب بن سکتی ہے۔ دوسرا شعر تجربہ کارانہ ذہن کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اس شعر میں شاعر کے مشاہدات نے شاعر کی رگِ احساس کو زندہ رکھنے کا مشورہ دیا ہے۔ بدن پتھر کا ہو جانا ایک علامت ہے مصیبتوں کے حاوی ہونے کی لفظ بھوگنا شعر کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہا ہے۔ انھیں احساسات کے ساتھ شعر میں اسعد بدایونی کی طرح اساطیری رنگ اور داستانی روغن تحلیل ہے۔

سبھی کچھ تو دریا بہا لے گیا
تجھے اور کیا چاہیے آسماں

شعر میں معنویت ہے، مضمون صاف ستھرا ہے۔ شاعر نے ان حوادث کی طرف اشارہ کیا ہے جب انسان مسلسل مشکلات کا شکار رہتا ہے۔ مشکلات کے علاوہ اس کے پاس کوئی اثاثۂ زندگی نہیں بچتا تو اس کے ہونٹوں پر کلماتِ شکوہ آجاتے ہیں اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اب تو سب کچھ ختم ہو گیا ہے اب اور کیا بچا ہے جو اے آسماں تجھے پیش کیا جائے۔ دراصل آشفتہ چنگیزی احساس کے شاعر ہیں اور ان کا احساس ہی ان کو حادثات کی وادی کا پتا دیتا ہے اور وہ اپنے محسوسات کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرنے کے فن سے واقف ہیں۔

جنوں کے قصوں پہ بچوں نے چونکنا چھوڑا
کہاں ہیں لوگ جو جی جان سے گزرتے ہیں

اگلے زمانے میں جنونِ شوق کے قصے منظرِ عام پر آتے رہتے تھے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ عہدِ رفتہ کے لوگ وفا پرست اور محبت آشنا تھے ان کا خلوص انھیں ہر قسم کے ایثار و قربانی کی ترغیب دیتا تھا اور وہ جان تک دینے میں بھی تامل نہیں کرتے تھے۔ لیکن آج صورتِ حال دوسری ہے لوگ جذبۂ محبت سے بے بہرہ اور خلوص و وفا سے نا آشنا

ہیں۔ اپنے دور کی تصویر دیکھ کر بچوں کو اگلے زمانے کے جنوں خیز قصوں پر یقین نہیں آتا اور وہ کسی حادثے پر نہیں چونکتے مذکورہ شعر دورِ حاضر کا پوری طرح عکاس ہے۔

طلوع ہوتا تھا بانگوں سے مرغ کی سورج
پرند پنجروں میں قرآں کا ورد کرتے تھے

شاعر کو عہدِ گزشتہ کی عظمت کا بے حد پاس ہے اور وہ اس زمانے کی پاکیزگی کو ذہن کے پردوں میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ اس شعر کی وضاحت یہ ہے کہ اگلا دور بہت ہی پاکیزہ اور اگلے لوگ بہت ہی خدا پرست اور اخلاص پرور تھے۔ سورج آج بھی مرغانِ سحر کی بانگوں کے ساتھ طلوع ہوتا ہے اور طائرانِ خوش الحان آج بھی اس کی حمد و ثنا کے گیت گاتے ہیں اور اس کی ربوبیت کا اقرار کرتے ہیں۔ بہر کیف شعر برائے شعر خوب ہے۔

موسموں سے دشمنی مہنگی پڑی
ورنہ سارے راستے ہموار تھے

مندرجہ بالا شعر میں یہ تاثر ملتا ہے کہ انسان خود ہی اپنی راہیں مسدود کر لیتا ہے۔ آج کے دور میں کسی سے دشمنی کرنا اپنے راستے میں کانٹے بچھانے کے مترادف ہے۔ مضمون معمولی ہے زبان مضمون کے عین مطابق صاف ستھری ہے۔ اس کے باوجود شعر میں صداقت ہے۔ زبان استعاراتی ہے۔ موسم اور راستے کا تعلق بڑی خوبی سے ظاہر کیا گیا ہے۔

ہوائیں تیز تھی یہ تو فقط بہانے تھے
سفینے یوں بھی کنارے پہ کب لگانے تھے

شاعر تجربہ کار ذہن کا مالک ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بسا اوقات انسان عمل کی راہ میں کوتاہی اور غفلت سے کام لیتا ہے اور معمولی سی مشکل کو سبب بنا کر عمل کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔ مذکورہ بالا شعر میں ایسے ہی حادثے کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اندازِ بیاں معنی خیز اور فلسفیانہ فکر کا آئینہ ہے۔ شعر کی خوبی یہ ہے کہ شاعر کوتاہی عمل کا شاخسانہ عامل کے سر نہیں ڈالتا۔ بلکہ موافق حالات کو کوتاہی عمل کا جواز ملتا ہے۔ شاعر فطرتِ انسان کا گہرا مشاہدہ رکھتا ہے۔

لوٹ جاؤ زمیں پہ آشفتہ
کوئی دم خم نہیں خلاؤں میں

شاعر کی تحقیق کا ماحصل یہ ہے کہ اپنی دنیا اور اپنے جہاں سے بہتر کوئی جگہ نہیں لوگ خلاؤں کو سر کرنے کی بات کر رہے ہیں۔ جب کہ خلاؤں کے دامن میں ہمارے کرۂ ارض سے بڑھ کر کوئی حسین جگہ نہیں ہے۔ اس شعر میں اپنے وطن سے محبت کا مواد ملتا ہے۔ آشفتہ چنگیزی کی زبان نہایت سادہ اور پراثر ہے۔

دیواریں اتنی اٹھائیں کہ سانس گھٹتی ہے
کوئی تو راستہ رکھنا تھا آنے جانے کا

شاعر کا دل آج کے ماحول سے پریشان ہے وہ دیکھ رہا ہے کہ آج کا انسان اتنا سنگ دل ہو گیا کہ پسِ ترکِ تعلق کی کوئی گنجائش بھی رسم و راہ کی نہیں چھوڑتا ایسے ماحول میں کسی احساس پرور دل کو حالات کی کربناکی کا احساس نہ ہو یہ تو ممکن ہی نہیں۔ شاعر جانتا ہے کہ کم از کم رسم و راہ کے دروازے تو بلند نہ کیے جائیں۔ عہدِ حاضر کے لوگوں کے اس جاں گسل رویے کو چنگیزی نے اچھے الفاظ عطا کیے ہیں دیواروں کی تخفیف کھٹکتی ہے دیواروں کو دیواریں لکھنا ضعفِ تالیف کے سوا کچھ نہیں۔

ابھی تو راہ میں کتنے ہی صحرا باقی ہیں
خیال تک نہیں آتا ہے گھر بسانے کا

شعر اچھا ہے بڑے عمدہ پیرائے میں کہا گیا ہے۔ مضمون بھی مناسب ہے۔ تجرباتی فکر کا حامل یہ شعر شاعرانہ ترکیب سے کہا گیا ہے۔ شاعر کا تجربہ ہے کہ گھر بسانے کے لیے بہت سے مراحل طے کرنے پڑتے ہیں درپیش مسائل و مراحل سے فراغت کے بعد ہی گھر بسانے کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔ مذکورہ خیالات کے مطالعے سے شاعر کی تجربہ کارانہ طبیعت کا پتا چلتا ہے۔ شعر نہایت سادہ اور پراثر ہے۔

مدت گزر گئی ہے یہی سوچتے ہوئے
بھولیں کسے کسے! کسے رکھیں شمار میں

شاعر ربطِ باہمی کو بہت اہم جانتا ہے اور آپسی جان پہچان کو سماجی اور انسانی ضرورت جانتا ہے۔ ایسی صورت میں کسی کو یاد رکھنا اور کسی کو بھول جانا انسانی فطرت کے منافی ہے لفظ مدت کے استعمال نے شعر کو بہت بلندی عطا کر

دی ہے۔ایک پل کے فیصلے کو ایک مدت کے بعد بھی طے کر پانا مشکل ترین مسئلہ ہے۔ ایسے مضامین کو تاثراتی انداز میں پیش کرنا ہی قادرالکلامی ہے۔

بھوت پیپل پہ اب نہیں رہتے
ورنہ کتنوں کو ہم ڈرادیتے

شاعر اپنے ماضی سے جدا رہنے کی سعادت کو بھولنا نہیں چاہتا۔اس کو عہد رفتہ میں بسنے والے انسانوں کی شرافت ومحبت، خلوص واحترام اور صداقت وسادہ دلی کے مناظر وکوائف پر ایک تحقیقی دسترس حاصل ہے۔کتنا معصوم اور سادہ دل انسان تھا اس دور کا پیپل پر بھوت کی کہانی کو صحیح مانتا تھا اور پیپل کی حدود میں جاتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ اس کے برعکس سائنسی دور کے نوعمر بچے بھی ان باتوں پر یقین نہیں رکھتے۔آشفتہ چنگیزی تاریخی معلومات سے بھی کافی دل چسپی رکھتے ہیں اور ان کی نگاہ دور بین مختلف موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔داستانی رنگ کا یہ شعر اپنے اندر ایک معصوم کیفیت رکھتا ہے۔

اونچی اڑان کے لیے پر تولتے تھے ہم
اونچائیوں پہ سانس گھٹے گی پتا نہ تھا

شاعر کے تجربات ومشاہدات نے یہ آگاہی عطا کی ہے کہ انسان خوب سے خوب تر کی تلاش وجستجو میں سرگرداں رہتا ہے اور اونچائیوں کی آخری حدود تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔کہیں وہ اس حقیقت سے ناآشنا ہے کہ حدِ کمال کے بعد زوال کی سرحد شروع ہو جاتی ہے اور ایسی ہر صورت بہرکیف تکلیف دہ ہوتی ہے انسان اس منزلِ کمال کو بھی تکلیف کی جگہ سمجھنے لگتا ہے۔اس خیال کو شاعر نے شعری قالب دے کر اپنے فنِ کمال کا لوہا منوایا ہے۔حالانکہ مضمون فرسودہ ہے لیکن نئی تکنیک سے پیش کیا ہے۔جو اثر آفرینی سے خالی نہیں۔

تیرے جیسا کون ملے گا
سوچ رہے ہیں گھر لوٹ آئیں

بہت ہی مختصر زمین میں کہا گیا عظیم شعر ہے۔مضمون سے قطع نظر شعر کی خوبی یہ ہے کہ تھوڑے سے لفظوں میں ایک طویل مضمون کو بڑی چابکدستی سے شعری پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔شعر کے مضمون سے کردار کی عظمت کا پتا چلتا ہے جو شاعر کا ذاتی وصف بھی ہو سکتا ہے۔بہرکیف مضمون کی پاکیزگی میں کوئی شبہ نہیں ہے۔شاعر کو اپنی غلطی کا احساس ہے۔وہ نادم ہے اس کے شعور اور بصیرت کا تجزیہ محبوب کی وفاداری کا محاسبہ کر رہا ہے۔

ساتھ کہاں تک دیں گی آخر
ماؤں کی معصوم دعائیں

مذکورہ بالا یہ شعر بھی خوب ہے مضمون کو بہت وسعت دی جا سکتی ہے۔مختصراً یہ کہ شاعر اس شعر میں یہ بتانا چاہتا ہے کہ ماں کی دعاؤں کی بھی ایک حد ہے انساں اگر گناہوں اور بداعمالیوں کی دلدل میں گرتا ہی چلا جاتا ہے تو ماں کی دعائیں بھی بے اثر ہو جاتی ہیں اور جزا وسزا کی بندشیں لاگو ہو جاتی ہیں۔شعر شاعر کے تجربات کا نچوڑ ہے چنگیزی اپنی بات کو بڑی خوبی سے کہہ گئے ہیں۔جس سے ان کی شاعرانہ عظمت کا پتا چلتا ہے۔

جن کے اڑنے کا ہے قلق اب تک
اپنے ہاتھوں میں ایسے طوطے تھے

یہ شعر شاعر کی جدت طرازی کا آئینہ ہے مضمون بھی اچھوتا ہے۔شعر کی تکنیک قابلِ داد ہے شاعر کو ان نعمتوں کے ضائع ہونے کا احساس ہے جو زندگی کے لیے بڑی اہم تھیں۔حاصل شدہ وسائل کو طوطے سے تشبیہ دی گئی ہے خوبی یہ ہے کہ طوطا عشرت کی علامت ہے۔ویسے شاعر موصوف نے بہت کم استعارات اور تشبیہات سے کام لیا ہے۔

جب بچھڑتے تھے وہ ملنے کی دعا کرتے تھے
ہم عجب لوگوں کی بستی میں رہا کرتے تھے

اس شعر کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر موصوف ربط باہم اور اخلاص ووفا کے قائل ہیں۔ان کا تجربہ ہے کہ دورِ حاضر میں بھی لوگ ایک دوسرے سے بچھڑتے ہیں تو از راہِ خلوص دوبارہ ملنے کی دعا کرتے ہیں۔شاعر کے خیال میں دنیا ابھی مخلص لوگوں سے خالی نہیں ہوئی شاعر کا مشاہدہ فکر ان کی شاعری سے نمایاں ہے۔شعر سچا اور اچھا ہے۔

پچھلی مسافتوں کے نشاں دیکھتے چلیں
روشن ہے بزم شعلہ رخاں دیکھتے چلیں

شاعر اپنی عمر کے اس آئینے میں دیکھتا ہے جہاں دلنواز مناظر اس کی دل لگی کا سامان ہوا کرتے ہیں۔ان ہی کیفیات کو بڑی سادگی اور شستگی سے پیش کیا گیا ہے۔شعر پر جمالیاتی رنگ غالب ہے۔جو روایتی شاعری کا آئینہ دار ہے۔لگتا ہے شاعر روایت کی پاکیزہ روش کو نہیں چھوڑ پا رہا ہے۔

لگتا ہے کہ چنگیزی صنائع اور بدائع کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے کے قائل نہیں۔جو کہنا ہے عوامی زبان میں کہنا ہے۔یہ بھی ایک شاعرانہ وصف ہے۔

ہمارے نقش مٹانا بہت ہی مشکل ہے
ہزار دور ہوں آشفتہ یاد آئیں گے

شعر میں شاعرانہ تعلّی کا شبہ ہوتا ہے شاعر اپنی پروقار شخصیت اور خداداد صلاحیتوں سے واقف ہے اور یہ جانتا ہے کہ دنیا ہمیں چاہ کر بھی نہیں بھلا سکتی۔ہماری ذات صدیوں پر محیط

ہے۔دنیا ہر دور میں ہمارے کمالات کا لوہا مانے گی۔صاف گوئی شعر کا ذاتی وصف ہے۔مضمون شاعر کے یقین کا مظہر ہے۔زبان نہایت سادہ ہے۔شعر میں کلاسیکی انداز پایا جاتا ہے۔آشفتہ چنگیزی کے کلام میں شوکتِ لفظی اور بے جا تکلفات کا شائبہ بھی نہیں زبان سادہ اور برجستہ ہے۔

قصہ مختصر آشفتہ چنگیزی کے غزلیہ مطالعے سے یہ اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ وہ جو بات کہتے ہیں بالکل صاف اور سادہ لب ولہجے کے ساتھ کہتے ہیں۔ان کے یہاں نہ صنائع بدائع کا دخل اور نہ ہی تراکیب کی اختراع۔وہ اپنے تجربات ومشاہدات کو پیش کرنے کے لیے محض پرشوکت لفظوں کا انتخاب کرتے ہیں۔جو صنائع بدائع اور تراکیب سے اکثر پاک ہوتے ہیں۔لیکن آشفتہ چنگیزی کا سب سے بڑا فنی کمال اور شعری شعور یہی ہے کہ علم بدیع کے فقدان کے باعث بھی ان کے کلام میں تاثر، سحرانگیزی اور رقت قائم رہتی ہے۔ان کا کلام بے جان، بوجھل اور پژمردہ سا دکھائی نہیں دیتا۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے صنعتوں کی بھول بھلیوں اور تراکیب کی الجھنوں میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی۔الفاظ کے تفحص سے وہ اپنی واردات قلبی اور لاشعور کی پرتوں سے اٹھنے والے مواد کو شعری قالب میں ڈھالنا بخوبی جانتے ہیں۔سپاٹ یک رخی لہجہ اور سادہ الفاظ بھی دل کو مسحور ومسرور کرتا ہے اور یہی ان کی انفرادیت کی دلیل ہے۔

■

Dr. Furqan Ahmed Sardhanvi
Near Deepak Furniture
Mohalla: Boodha Babu
Sardhana
Distt: Meerut (UP)
Mob.: 9927141402

عبدالرحمن

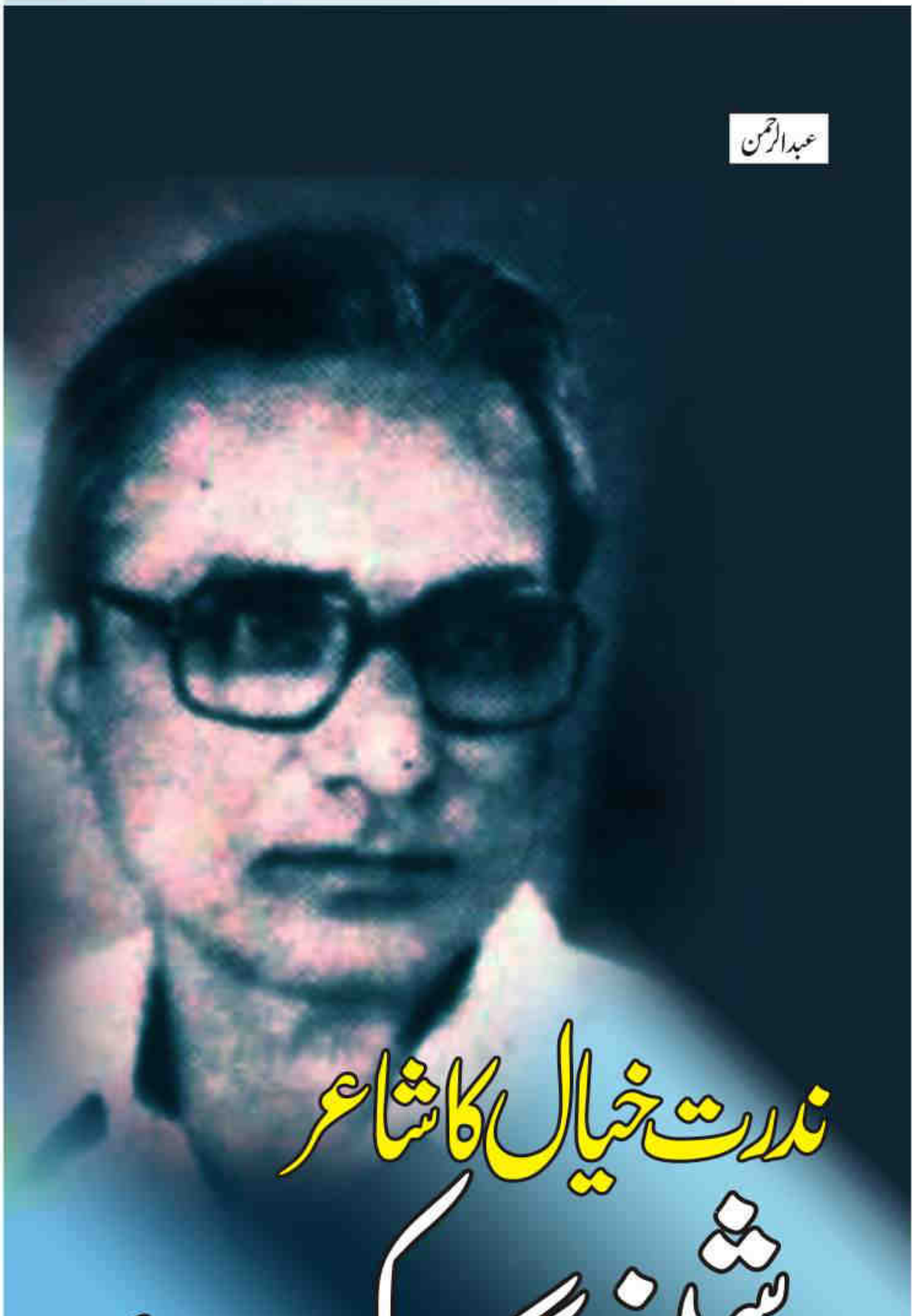

ندرت خیال کا شاعر شبنم گورکھپوری

اتر پردیش کے مشرق میں راپتی ندی کے کنارے پر واقع ضلع گورکھپور اپنے وسیع دامن میں ادبی تاریخ کے انمول جواہرات چھپائے کہکشاں کی صورت ادبی افق پر روشن اور تابندہ ہے۔ مجنوں، فراق، پریم چند، مہدی افادی، اصغر گونڈوی، ریاض خیرآبادی، سلام سندیلوی، پروفیسر عبدالحق، پروفیسر محمود الٰہی، شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر شاہد حسین، پروفیسر قاضی افضال، پروفیسر قاضی جمال، عمر قریشی، ملک زادہ منظور احمد وغیرہ چند ایسے ہی روشن اور قابل ذکر اسمائے گرامی ہیں جن کی روشنی سے گورکھپور میں اردو ادب کی فضا منور اور تابناک ہے۔ انھیں مشہور ادبا میں شبنم گورکھپوری کا نام بھی شمار ہے۔

شبنم صاحب سے پہلی ملاقات پر میں ان کی ادبی حیثیت سے قطعاً ناواقف تھا۔ اس وقت میں نویں یا دسویں کا طالب علم تھا۔ شبنم صاحب انگریزی زبان پر دسترس رکھتے تھے۔ بچوں کو پڑھانا ان کے مشاغل میں تھا۔ میں نے بھی خود کو ان کے سامنے انگریزی پڑھنے کے لیے پیش کیا۔ مجھے یاد ہے انھوں نے مجھے صرف Present Indefinite Tense پڑھایا تھا لیکن یہ ہنر سکھا دیا کہ آگے پڑھنا کیسے ہے۔

شبنم گورکھپوری کی قربت نے میرے شعری ذوق کو پنکھ عطا کیے۔ بہت دنوں تک ان کی محفل میں میری حیثیت صرف ایک سامع کی رہی لیکن دھیرے دھیرے میری گویائی کو ان کی بزم میں اہمیت حاصل ہونے لگی۔ میرے تئیں ان کا رویہ تاعمر دوستانہ رہا۔ مگر میرے لیے وہ ہمیشہ استاد رہے، مخلص، مشفق اور مہربان استاد جنھوں نے زندگی کے تمام تجربے خواہ وہ کتنے ہی ذاتی کیوں نہ ہوں مجھ سے Share کیے۔

شبنم گورکھپوری کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے کھاتے، پیتے محفل میں، مسجد میں ان کی زندگی کو میں نے بہت قریب سے دیکھا۔ بہت سی محرومیوں کے باوجود ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار کبھی نہیں محسوس کیے۔ اپنی زندگی میں وہ اپنے والد صاحب سے بہت متاثر تھے۔ ان کے والد ایک مذہبی شخص تھے۔ شبنم گورکھپوری اکثر اپنے والد کی باتیں کرتے۔ انھیں اپنے والد کی شخصیت پر ناز تھا۔ والدین کی تربیت ہی کا اثر تھا کہ شبنم گورکھپوری اعمال و کردار کے اعتبار سے بلندی کی معراج پر فائز تھے۔ شبنم گورکھپوری کی شخصیت کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر فہمیدہ لکھتی ہیں:

''خاندانی اثرات اور اسلامی تعلیمات نے انھیں متین اور سنجیدہ بنا دیا۔ طبیعت بہت سیدھی پائی تھی۔ بات کرنے کا انداز ہلکا پھلکا، لہجہ نہایت سنجیدہ، گفتگو کرتے وقت لبوں پر ہلکی پھلکی مسکراہٹ۔ یہ ان کی ادائے خاص شامل تھی۔ جب کبھی ادبی موضوع پر گفتگو کرتے تو دلیلوں کے ساتھ..... تلخ اور ترش بات پر چراغ پا نہیں ہوتے بلکہ آہستہ اور نرم روی سے جواب دیتے۔ علم و فضل کے مرتبے پر فائز ہونے کے باوجود سب سے خاکسارانہ انداز میں ملتے تھے..... مفاد پرستی، حرص و ہوس سے اپنا دامن داغ دار نہیں کرتے۔''

شبنم گورکھپوری کے بقول انھوں نے پہلی مرتبہ آل انڈیا مشاعرہ جو کہ ان کے شہر گورکھپور میں منعقد ہوا تھا، شرکت کی۔ سنہ 1957 میں منعقد گورکھپور کے اس مشاعرے میں

متعلقہ عہد کے مشہور ومعروف شعراء کرام تشریف رکھتے تھے۔ مشاعرے کی نظامت مشہور ناظم مشاعرہ عمر قریشی صاحب فرما رہے تھے۔ شبنم گورکھپوری سب سے جونیئر تھے۔ ان کے کلام سے مشاعرے کا آغاز ہوا۔

میرے رونے پہ رویا ابر ہنسنے پر ہنسی بجلی
فضاؤں پر اثر انداز ہے دیوانگی میری

شعر پر صدر مشاعرہ جگر مرادآبادی چونکے، نوجوان شاعر کی جانب نگاہِ تحسین ڈالی اور شعر مکرر پڑھوایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جگر مرادآبادی کا ترنم مشاعرے کا وقار ہوتا تھا۔ جگر مرادآبادی نے نوجوان شاعر کو پاس بلایا، سر پر ہاتھ پھیرا، دعائیں دیں اور فرمایا 'تمہارا مستقبل روشن ہے۔'

ایک اور مشاعرے میں شعری بھوپالی کی صدارت میں نوجوان شاعر شبنم گورکھپوری نے غزل کا شعر۔

اب شکوہ کر کے آپ سے پچھتا رہا ہے دل
للہ سر اٹھایئے گھبرا رہا ہے دل

شبنم گورکھپوری اپنے عھد کے شعرامیں منفرد شھرت رکھتے تھے۔ ان کی اس شھرت میں ان کی غزلوں کے ساتھ ساتھ ان کے ترنم اور مسحور کن آواز کا بھی دخل تھا۔ جگر مراد آبادی شاعر کے ساتھ ساتھ ترنم میں یگانہ حیثیت رکھتے تھے۔ شبنم گورکھپوری دھیرے دھیرے رنگ جمانے لگے تھے۔ انھیں جگر مراد آبادی کے بدل کے روپ میں دیکھا جانے لگا تھا۔ شومی بخت کہ معالج نے شب بیداری کو ان کی صحت کے لیے مضر قرار دے دیا، اس طرح مشاعرے کے اسٹیج سے شبنم گورکھپوری کا تعلق ھمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا۔

پڑھی تو مشاعرے کے کنوینر نے دست بستہ گزارش کرتے ہوئے کہا کہ شبنم صاحب جتنی بھی غزلیں یاد ہوں پڑھ دیجیے۔

(کلیات شبنم گورکھپوری، مرتبین: ڈاکٹر مشیر احمد، اشفاق احمد عمر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2014ء، ص 358,359)

شبنم گورکھپوری اپنے عہد کے شعرا میں منفرد شہرت رکھتے تھے۔ ان کی اس شہرت میں ان کی غزلوں کے ساتھ ساتھ ان کے ترنم اور مسحور کن آواز کا بھی دخل تھا۔ جگر مرادآبادی شاعر کے ساتھ ساتھ ترنم میں یگانہ حیثیت رکھتے تھے۔ شبنم گورکھپوری دھیرے دھیرے رنگ جمانے لگے تھے۔ انھیں جگر مرادآبادی کے بدل کے روپ میں دیکھا جانے لگا تھا۔ شومیِ بخت کہ معالج نے شب بیداری کو ان کی صحت کے لیے مضر قرار دے دیا، اس طرح مشاعرے کے اسٹیج سے شبنم گورکھپوری کا تعلق ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا۔

شبنم گورکھپوری کو P.hD نہ کر پانے کا تا عمر ملال رہا۔ ان کا ذہن تعلیم وتعلم سے مناسبت رکھتا تھا مگر تیرہ نصیبی کہ انھیں محکمۂ ریل سے محاسبی کے منصب سے سبکدوش ہونا پڑا۔

شبنم گورکھپوری یعنی ایک بہترین مترجم، عمدہ شاعر، شاندار مکتوب نگار کی (موصوف کی مکتوب نگاری کے تمام پہلو پردۂ خفا میں ہیں۔ راوی کو بہ زبان مکتوب نگار خود خوبصورت، شستہ وشگفتہ اور سادہ وسلیس خطوط کی سماعت کا شرف حاصل ہے) ان کی تہہ دار شخصیت مادی عہد کی گوناگوں چیرہ دستیوں کا شکار ہو کر رہ گئی۔ اس طرح انھیں ان کی زندگی میں وہ شناخت اور پہچان نہ مل سکی جس کے وہ اصل حقدار تھے۔

نرم ولطیف جذبات کے حسین و دلکش شاعر شبنم گورکھپوری کی شخصیت اور تخلیقات کا قدر شناسی سے محروم رہ جانا شاعر کے ساتھ زیادتی اور ادب کے ساتھ ظلم کے مترادف ہے۔ مجنوں، فراق، محمود الٰہی اور سلام سندیلوی کے بعد جن اہل قلم نے اردو کے ادبی حلقوں میں گورکھپور کی نمائندگی کا ذمہ فخر سے اپنے کاندھے پر برداشت کیا ان میں شبنم گورکھپوری کا نام ادب واحترام کے ساتھ ذکر کیے جانے کے لائق ہے۔

غزل ایسی صنف شاعری ہے جس میں لاتعداد امکانات پوشیدہ وموجود ہیں۔ حیات وکائنات کے تمام موضوعات کا احاطہ کرنے اور انھیں چند لفظوں میں ادا کرنے کا ملکہ اگر کسی صنف کو حاصل ہے تو بلاشبہ وہ غزل ہی ہے۔ غزل نے شاعری میں جمالیت کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ جذبات واحساسات کی مختلف کیفیات و واردات کا بیان مختصر الفاظ میں پیش کیا ہے۔

شبنم گورکھپوری کا شعری سفر 'دل سے دل تک' کا ہے۔ ان کی پوری زندگی رومان سے عبارت ہے اور یہی جذبہ ان کی بیشتر شاعری میں بھی جھلکتا ہے۔ صنف غزل سے اپنی پسندیدگی کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اصناف سخن میں غزل مجھے اس لیے پسند ہے کہ اس میں آہستہ آہستہ بہنے والے دریا کی لہروں سے ابھرتا ہوا سنگیت ہے۔ جس میں اوس بھی ہے اور نرمی بھی، کیف بھی ہے اور مستی بھی۔ غزل ادب کی اونچی چٹان سے گرا ہوا وہ جھرنا ہے جس کی آواز میں نہ جانے کتنی معصوم دوشیزائیں اپنے ریشمی بال کھولے ڈوبتی ابھرتی نظر آتی ہیں۔ غزل ایک خوشبو ہے جو ذہنوں کو مہکاتی ہے اور دلوں کو تڑپاتی ہے۔ غزل ایک کسک ہے جو نئے پرانے زخموں کو چھیڑتی بھی ہے اور مرہم بھی لگاتی ہے۔ اس میں روح کو چھو لینے والی ایک ناقابل بیان لذت ہے۔ یہ ایک مہکتا ہوا پھول ہے جس پر خیالات کی شبنم ٹپکتی ہے اور لفظوں کے موتی بکھرتے ہیں۔ غزل میں حسن مسکراتا ہے، عشق پہلو بدلتا ہے اور دھڑکنیں انگڑائیاں لیتی ہیں۔ یہ حالات حاضرہ کی عکاس بھی ہے اور فطرت کی ترجمان بھی۔ اس میں صدیاں کروٹیں لیتی ہیں، لمحے مچلتے ہیں اور وقت جاگتا رہتا ہے۔

غزل میرا پیار ہے
غزل میری محبوبہ اور
غزل میری زندگی کا حسین شاہکار

(مشمولہ کلیات شبنم، مرتبین: ڈاکٹر مشیر احمد، اشفاق احمد عمر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2014)

شبنم گورکھپوری کی غزلیہ شاعری تغزل کی رنگینی، عشق کے متواتر بیانات، اس کی مختلف کیفیات اور عشقیہ جذبات کی گرمی سے عبارت ہے۔ انھوں نے جو کچھ کہا اس میں اتنی سلاست، روانی اور برجستگی ہے کہ خیالات براہِ راست دلوں میں جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ ان کی پہلی غزل کے چند اشعار بطور مثال پیش کرتا ہوں ملاحظہ کیجیے۔

کاغذ پہ قلم تیرا رک رک کے چلا ہوگا
جب پہلے پہل تو نے خط مجھ کو لکھا ہوگا
جس پیڑ کے نیچے دل ہم دونوں کے دھڑکے تھے
اس پیڑ کا سایہ بھی رومان بھرا ہوگا
ان ریشمی پلکوں پہ کچھ دیپ جلے ہوں گے
جب میری محبت کا احساس ہوا ہوگا

شبنم گورکھپوری نہایت حساس اور دردمند دل رکھنے والے خوددار اور وضع دار شخص تھے۔ جن کا واسطہ بعض دفع زندگی کی تلخ حقیقتوں اور محبت کی سفاکیوں سے بھی پڑتا ہے۔ وہ اس سے نظریں چرانے کی بجائے اسے من وعن شعر کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ خوداعتمادی شبنم گورکھپوری کی شخصیت اور فن کے اہم جزو ہیں۔ خواہ میدانِ عشق ہو یا زندگی کی ناہمواریاں اور دشواریاں، شبنم گورکھپوری مایوسی کو کبھی قریب نہیں آنے دیتے۔ ان کی شاعری میں رنج و غم، الم وحزن، امید وبیم، فرط ونشاط کے دوش پر سفر کرتے

ہیں۔اس سے متعلق چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

اخفائے غم عشق کا اللہ رے عالم
روتا ہوں اور آنکھ مری نم بھی نہیں ہے

تیرے انتظار میں بے خبر یہی کیفیت رہی رات بھر
کبھی آنکھ تھی میری سوئے در کبھی رہ گزر پہ نظر گئی

جنوں بیدار ہو جاتا ہے آغاز محبت میں
یہ دل بیگانۂ انجام کیوں ہے ہم سمجھتے نہیں

اب شکوہ کر کے آپ سے پچھتا رہا ہے دل
للہ سر اٹھایئے گھبرا رہا ہے ....دل

ہماری آنکھوں سے اشک خونیں اگر مسلسل بہا کریں گے
غموں کی تاریک منزلوں میں دیے شفق کے جلا کریں گے
چمک اٹھیں گی سیاہ راتیں اڑے گی جب گیسوؤں کی افشاں
حیات کی ظلمتوں کو روشن یہ ننھے تارے کیا کریں گے

مری گستاخیوں پہ نہ کیجئے نظر
مجھ سے دیوانگی میں خطا ہو گئی

شبنم گورکھپوری اردو کے مایہ ناز ناقد مجنوں گورکھپوری کے شاگرد تھے اور انھیں اس بات کا فخر تھا کہ مجنوں جیسی قد آور شخصیت ان کے اساتذہ میں شامل ہے۔ نہ صرف اتنا ہی بلکہ یہ بھی کہ شبنم تخلص بھی استاد ہی نے ان کے لیے پسند فرمایا تھا۔ استاد شاگرد ایک دوسرے سے بے لوث محبت کرتے تھے۔اسی جذبۂ محبت سے سرشار شبنم گورکھپوری استاد سے ملنے کے لیے کراچی جا پہنچے، جب کہ ڈاکٹر نے انھیں شب بیداری کے ساتھ ساتھ سفر نہ کرنے کی سخت ہدایت کر رکھی تھی۔اپنے اس شاگرد کے حوالے سے استاد (مجنوں گورکھپوری) کا خیال ہے:

''مسیح الزماں (شبنم گورکھپوری) میری زندگی کے اس نصاب کی نمائندگی کرتے ہیں جس کی میں آج تک اپنی حرکات وسکنات اپنی زبان اور قلم سے تبلیغ کرتا رہا ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ وہ ایک سچے اور اچھے شاعر ہیں۔

میں ایک سے زائد بار کہہ چکا ہوں کہ شعر بنیادی طور پر غزل ہوتا ہے یعنی دو ہموار اور ہم زبان مصرعوں میں ایک مکمل احساس یا خیال کے اظہار کا نام غزل ہے مسیح الزماں کا یہ مجموعہ (پھول اور شبنم) میرے خیال کی تائید میں شہادت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔''

(مشمولہ: کلیات شبنم گورکھپوری: مرتبین: ڈاکٹر مشیر احمد، اشفاق احمد عمر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 2014 ص 88)

ایجاز غزلیہ شاعری کا حسن ہے اور اس کا اعجاز سمجھا جاتا ہے۔ شبنم گورکھپوری نے چھوٹی بحروں کے انتخاب سے ایسے شاہکار اور عمدہ نمونے اور خیالات ادا کیے ہیں جنھیں پڑھ کر جی خوش ہو جاتا ہے، چھوٹی بحروں کی یہ غزلیں بھرپور موسیقیت، ترنم اور نغمگی سے پر ہیں۔ شبنم نے ذیل کے اشعار میں مختلف موضوعات مختصر الفاظ میں بحسن خوبی ادا کیا ہے ملاحظہ کیجیے۔

کیسے کٹیں غم کے لمحات　　ناگن بن گئی کالی رات
ایک حقیقت سو افسانے　　ایک محبت لاکھوں بات

وہ محبت تھی جو فسانے میں　　اب کہاں رہ گئی زمانے میں

دیکھ کے رکھیے پاؤں زمیں پر　　ہر ذرّہ بے جان نہیں ہے

شبنم گورکھپوری نے غزلوں کے علاوہ نظم، حمد، نعت، منقبت اور قطعات پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ جذبۂ وطن، ہند کے نوجوانو، شجاعت کی قسم میں ملک سے محبت اور وطن دوستی کا جذبہ نظر آتا ہے جب کہ احساس، نغمۂ عشق، عالم تنہائی، پیکر حسن، یاد ماضی، محبوب غزل، سحر ہونے تک اور لمحۂ جدائی میں عشق ومحبت کی کیفیات کا بیان ملتا ہے۔ان کے قطعات بھی محبت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ شبنم گورکھپوری کی شاعری سے متعلق پروفیسر اصغر عباس کا خیال ہے:

''شبنم صاحب نے غزلیں اور نظمیں بھی کہی ہیں ساتھ ہی قطعات بھی اور ان سب میں جو عنصر سب سے نمایاں ہے وہ ان کی طرفگیِ ادا اور ندرتِ خیال ہے۔ یہی نہیں ان کے قطعات بھی فکر کی جدت اور فن دونوں اعتبار سے کھرے ہیں۔'' (ایضاً ص38)

پروفیسر محمود الٰہی کہتے ہیں:

''شبنم صاحب کا شمار اچھے غزل گویوں میں ہوتا ہے لیکن انھوں نے بعض دوسری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ حب الوطنی پر انھوں نے نظمیں کہی ہیں جو روایتی نہیں ہیں۔ انھوں نے نظم گوئی میں بھی نئی روش اختیار کی ہے۔'' (ایضاً ص85)

ایک شاعر کے فن کی پختگی کا اندازہ اس سے بھی کیا جاتا ہے کہ وہ مقطع میں اپنا تخلص کس فنکاری اور مہارت کے ساتھ استعمال کرتا ہے۔ بہترین مقطع وہ ہے جس پر اگر شاعر ربط یعنی علامت تخلص (　) کا استعمال نہ کرے تو تخلص کا گمان بھی نہ گزرے بلکہ مقطع تخلص لفظ کے لغوی معنی پر ہی دلالت کرے۔ متقدمین شعرا میں مومن اس فن کے استاد تسلیم کیے جاتے ہیں۔ مومن کے بعد اگر کسی شاعر نے مقطع میں اپنا تخلص فنکاری، مہارت اور چابکدستی کے ساتھ استعمال کیا ہے تو وہ بلا شبہ شبنم گورکھپوری ہیں۔ انھوں

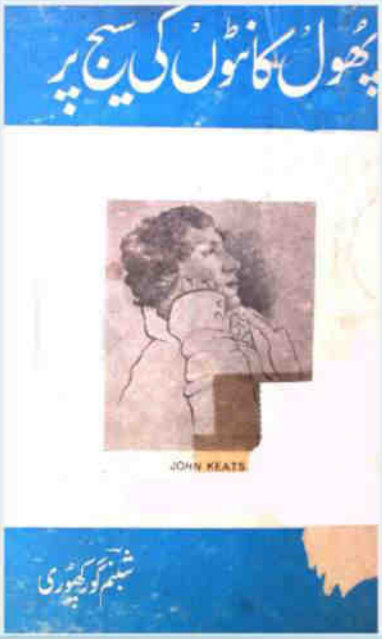

نے اپنی جودتِ طبع اور فن پر مکمل دسترس کی بنا پر ایسے عمدہ مقطعے تخلیق کیے ہیں جس کی مثال عہد حاضر تک کے شعرا میں خال خال ہی نظر آتی ہے۔ چند مثال ملاحظہ کیجیے۔

پھول پہ گرنا دیکھ کے شبنم
نکہتِ گل بے جان نہیں ہے

کانٹے تو ہیں شاداب مگر صحن چمن میں
پھولوں کے لیے قطرہ شبنم بھی نہیں ہے

کلیوں کے تبسم پہ نہ جا شبنم گریاں
ہر پھول ترے اشکوں سے تر ہے کہ نہیں ہے

شاعر کے علاوہ شبنم گورکھپوری کی دوسری مکمل شناخت مترجم کی ہے۔انھوں نے شیلی، کیٹس اور کولرج کی نظموں کے کامیاب ترجمے کیے ہیں۔ان کی خواہش تھی کہ وہ اردو کی سو غزلوں کا انگریزی میں ترجمہ کریں، انھوں نے یہ کام شروع بھی کر دیا تھا اور غالباً ستر یا کچھ زائد غزلوں کے ترجمے مکمل بھی کر لیے تھے۔ مسلسل صحت کی خرابی کے باعث یہ عمل بار بار ملتوی ہوتا رہا۔ پھر..... زندگی داغِ مفارقت دے گئی اور ان کا یہ عظیم کارنامہ منظر عام پر نہ آ سکا۔ میری ذاتی کوشش ہوگی کہ میں شبنم صاحب کی اس کاوش کو قارئین تک پہنچا سکوں یہی ایک شاگرد کا استاد کے لیے خراج ہوگا اور گورکھپور کی ادبی سرزمین کو ایک ادنیٰ خادم اردو کا تحفہ بھی۔

بخت سے کوئی شکایت ہے نہ افلاک سے ہے
یہی کیا کم ہے کہ نسبت مجھے اس خاک سے ہے

(پروین شاکر)

■

Dr. Abdur Rahman
Uttar Pradesh Rajarshi Tandon Open University
Shantipuram,
Prayagraj-211013 (UP)
Mob.:9454644599

ندوۃ المصنفین اور اس کا مشہور رسالہ برہان

محمد سراج الدین

ندوۃ المصنفین کی تاریخ رسالہ برہان کے ذکر کے بغیر ادھوری ہوگی۔ جس طرح برہان کا ذکر مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے بغیر ناقص ہے۔ ندوۃ المصنفین محض ایک اشاعتی ادارہ ہی نہیں ؛ ایک مشن اور ایک تحریک تھا۔ ندوۃ المصنفین کے قیام کے پس منظر کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ ندوۃ المصنفین کے قیام کے پس پردہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے بڑے مقاصد تھے، جنھیں وہ اس پلیٹ فارم کے ذریعے عملی جامہ پہنانا چاہتے اور قوم کو جمود و یاسیت سے نکالنا چاہتے تھے۔ یوں تو قدیم علمی سرمایے کی کمی نہیں تھی اور نہ جدید زمانے میں لکھنے والوں کی کمی تھی ؛ اگر کمی تھی تو محنت و لگن، خلوص اور جنون کی حد تک کوششوں کی کمی تھی اور قدیم سرمایے کو جدید اسلوب میں ڈھال کر زمانے کے سامنے پیش کرنے کی سخت ضرورت تھی اور اس کے لیے ایک ایسے پلیٹ فارم کا ہونا ضروری تھا جو لوگوں کے چہرے اور مسلک کو دیکھے بغیر ان کے علم و تحقیق کی قدر کرے اور صالح معاشرے کی تشکیل کے لیے ان کا تعاون بھی حاصل کرے، یہی وجہ ہے کہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کو اتحاد امت کے علمبردار کی حیثیت سے بھی جانا جاتا ہے اور ہر مکتبِ فکر میں انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی دار العلوم دیوبند سے تکمیلِ تعلیم کے بعد کچھ دنوں وہیں معین المدرسین رہے پھر ڈابھیل (گجرات) چلے گئے لیکن وہاں بھی زیادہ دن قیام نہیں رہا۔ مفتی صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی دونوں نے اب کلکتے کا رخ کیا اور وہاں کی مسجدوں میں درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ کلکتہ کے بعض اصحابِ خیر کے مالی تعاون سے مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نے اپنے رفیقِ خاص مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے ساتھ مل کر جولائی 1938 میں ندوۃ المصنفین کی داغ بیل ڈالی۔ قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"وہاں کی مرکزی مسجدوں میں دونوں نے درسِ قرآن جاری کیا، پھر وہیں کے دورانِ قیام میں 'ندوۃ المصنفین' کا خاکہ بنایا، کلکتہ کے بعض مخیّر اصحاب نے ان کی مالی مدد کی، پھر دہلی آ کر اپنے ساتھیوں مولانا سیوہاروی اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے ساتھ (جو ان دنوں مدرسہ عالیہ فتح پوری میں مدرس تھے اور انگریزی کے امتحانات بھی دے رہے تھے) اس خاکے میں رنگ بھرا۔"

(مفکرِ ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نمبر، ندوۃ المصنفین، دہلی 1987، ص: 44)

لکھنے پڑھنے اور پڑھانے کی بے پناہ صلاحیتوں کے باوجود مفتی صاحب نے ندوۃ المصنفین جیسے ادارے کا منصوبہ بنایا، قائم کیا اور اس کے انتظامی امور کے لیے خود کو وقف کر دیا اور تادمِ حیات اسے سجانے، سنوارنے میں لگے رہے۔ اسی طرح سے مولانا اکبرآبادی نے علمی معاونت اور برہان کی ادارت کے ذریعے ندوۃ المصنفین کے مشن کو وسعت عطا کی اور دنیا بھر میں اس کے پیغام کو پہنچایا اور اپنا، اپنے ادارے اور اپنی قوم کا سر بلند کیا۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ہر دو لحاظ سے ادارے کے معاون تھے، وہ مفتی صاحب کی اس تحریک میں ان کا ہاتھ بھی بنے رہے اور علمی دنیا کو اپنی وقیع تصانیف سے بھی نوازا۔ دراصل یہ تینوں اس مشن کی تثلیث تھے۔ ندوۃ المصنفین سے ان تینوں کا جسم و روح کا تعلق تھا، ان کے خلوص و محنت اور بے مثال قربانیوں ہی کا نتیجہ تھا کہ چھ دہائیوں سے زائد عرصے تک یہ ادارہ بڑی خوش اسلوبی سے چلتا رہا اور اپنے مشن میں کامیاب رہا۔

ندوۃ المصنفین کے قیام کے مقاصد عظیم تھے جنھیں مندرجہ ذیل نکات سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے:

"اغراض و مقاصد ندوۃ المصنفین

- وقت کی جدید ضرورتوں کے مطابق قرآن اور سنت کی تشریح و تفسیر کرنا۔
- وقت کے تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق فقہ اسلامی کی ترتیب و تدوین اس طرح کرنا کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول کی قانونی تشریح کا مکمل نقشہ سامنے آجائے۔
- علما اور فارغ التحصیل طلبا کے لیے ایسے شعبۂ تحریر و تقریر کا قیام جس کا نصاب موجودہ ضروریات کے مطابق ہو۔
- ملک کے ان تصنیفی، تالیفی اور تعلیمی اداروں سے خاص طور پر اشتراکِ عمل کرنا جو وقت کے جدید تقاضوں کو سامنے رکھ کر ملت کی مفید خدمات انجام دے رہے ہیں اور ایسے اداروں، جماعت اور افراد کی قابلِ قدر تالیفات کی اشاعت میں مدد کرنا بھی ندوۃ المصنفین کی ذمے داریوں میں شامل ہے اور اس ذمے داری کو پورا کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔"

(اسلامی علوم میں ندوۃ المصنفین کی خدمات: ایک مطالعہ، ڈاکٹر عبدالوارث خاں، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، 1999، ص: 11-10)

بلاشبہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نے ملک کے چوٹی کے علما، اسکالر اور قلمکاروں کو ندوۃ المصنفین کے پلیٹ فارم پر جمع کر لیا تھا اور اپنے اہداف سے بڑھ کر کام کرنے کی کوشش کی اور اپنی محنت و لگن اور خلوص کی بنیاد پر وہ کامیاب بھی ہوئے۔ مفتی صاحب نے آٹھ نو سال تک خون پسینے سے سینچ کر جس ادارے کو شجرِ سایہ دار و ثمر دار بنایا تھا وہ 1947 کے خوں چکاں فسادات کی نذر ہو گیا، قرول باغ میں قائم ندوۃ المصنفین کا سارا سرمایہ علمی بیک دم راکھ کا ڈھیر بن گیا لیکن مفتی صاحب کے عزم مصمم اور دل گردے کی ہی بات تھی کہ اسی راکھ سے دوبارہ انھوں نے ندوۃ المصنفین قائم کر لیا۔ اب یہ ادارہ قرول باغ سے جامع مسجد دہلی کے علاقے میں منتقل ہو گیا تھا اور تازہ دم ہو کر ایک بار پھر اپنی منزل کی طرف گامزن ہو گیا تھا۔

ندوۃ المصنفین نے اپنے معاونین کو ہر سال چار کتابیں مہیا کرنے کا اعلان کیا تھا لیکن 1989-1939 تک کی فہرستِ مطبوعات کو دیکھ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایک آدھ سال دو سے تین کتابوں کا سلسلہ بھی رہا مگر کئی بار ایسا بھی ہوا کہ فی سال چھ چھ سات سات کتابیں بھی یہاں سے شائع ہوئیں۔ کئی نئے لکھنے والے یہاں مصنف ہوئے اور کئی مصنفین کو یہاں سے ملک بھر میں شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اور کئی مشہور و مقبول مصنفین و محققین نے اپنا قلمی تعاون پیش کر کے اطمینان کا اظہار کیا۔ قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، مفتی ظفیر الدین مفتاحی، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا تقی الدین امینی، مولانا منت اللہ رحمانی، قاری محمد طیب قاسمی، مولانا حامد الانصاری غازی، قاضی اطہر مبارکپوری، علی میاں ندوی اور علامہ سید مناظر احسن گیلانی رحمہم اللہ وغیرہ کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل، ذکر ہیں۔ قاضی زین العابدین لکھتے ہیں:

"ندوۃ المصنفین نے ہر سال چار کتابیں اپنے معاونین کو مہیا کرنے کا اعلان کیا تھا۔ یہ کتابیں التزام کے ساتھ شائع ہوتی رہیں، اور اب حضرت مفتی صاحب

کے انتقال (1984) تک ان کی تعداد ڈھائی سو سے زیادہ متجاوز ہو چکی تھی۔ان میں حضرت مولانا سیوہاروی کی 'قصص القرآن' اور 'اسلام کا اقتصادی نظام'،مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی 'فہم قرآن'اور 'مسلمانوں کا عروج وزوال'اور مولانا بدر عالم میرٹھی کی 'ترجمان السنہ' بہت مقبول ہوئیں۔میری بھی تین کتابیں 'نبی رحمت'،'خلافتِ راشدہ' اور 'خلافتِ بنی امیہ' ابتدائی سالوں ہی میں شائع ہوئیں جو میری اولین قلمی کاوش ہیں۔'' (مفکرِ ملت...ص: 45)

اس طرح ندوۃ المصنفین نے علمی، دینی، تاریخی اور ادبی کتابوں خاص طور پر اسلامی علوم پر مشتمل کتابوں کی اشاعت و ترویج میں حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا جو رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔

ندوۃ المصنفین کو اپنے مشن کو دور تک پہنچانے کے لیے ایک رسالے کی بھی ضرورت تھی جو ذمے دارانِ ندوۃ المصنفین کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کر سکے اور کام کو وسعت دے سکے۔چناں چہ ادارے کے ساتھ اس کا ایک ترجمان بھی منصوبے میں شامل تھا اس لیے ندوۃ المصنفین اور رسالہ 'برہان' ایک ساتھ منصۂ شہود پر آئے۔'اشاریہ برہان، دہلی' سے علم ہوتا ہے کہ جولائی 1938 سے اپریل 2001 تک پورے 63 سال یہ رسالہ بغیر رکے اور بغیر تھکے جاری و ساری رہا۔ندوۃ المصنفین اور رسالہ برہان دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم رہے۔اول روز سے اس کے مدیر مولانا سعید احمد اکبرآبادی رہے۔فروری 1943 سے دسمبر 1945 تک سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں لکچرر مقرر ہو جانے کی وجہ سے ڈھائی پونے تین برسوں کو منہا کر کے وہ اپنی وفات (مئی 1985) تک برہان کے مدیر رہے۔اس وقفے میں مفتی صاحب ہی برہان کا اداریہ تحریر کرتے رہے۔مولانا اکبرآبادی کے صاحب فراش ہو جانے کے بعد مارچ 1985 سے مئی 1985 تک مولانا اظہر صدیقی نے اداریہ لکھا اس کے بعد کچھ دنوں یہ ذمے داری جمیل مہدی مرحوم نے نبھائی مگر اب باضابطہ برہان کی ادارت کی ذمے داری مفتی صاحب کے صاحبزادے عمید الرحمٰن عثمانی کے سپرد ہو گئی اور اخیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ان حضرات کے علاوہ برہان کی مجلس ادارت میں قاضی اطہر مبارکپوری،مولانا غلام محمد نورگت،ڈاکٹر معین الدین بقائی،سید اقتدار حسین،عابد رضا بیدار،غفران احمد، محمد اظہر صدیقی،حکیم محمد عرفان الحسینی،ڈاکٹر جوہر قاضی،محمود سعید بلالی جیسے علما و دانشور شامل رہے ہیں۔ 1991 سے 1995 تک حکیم عبد الحمید چانسلر جامعہ ہمدرد، دہلی برہان کے سر پرست رہے،اس کے بعد رسالے کے نگرانِ اعلیٰ حکیم محمد زماں حسینی رہے۔

(مقدمہ اشاریہ ماہنامہ برہان، دہلی،محمد شاہد حنیف،اوراق پارینہ پبلشرز، لاہور(س ن)ص: 19-17)

بقول مولانا اکبرآبادی کے کسی ادارے کی کامیابی کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔ایک اہلیت و لیاقت دوسری خلوصِ نیت۔(برہان، دہلی، جولائی 1938) مولانا ان دونوں شرطوں پر کھرے اترے اور برہان کو ایسا مقام عطا کیا کہ مجلاتی صحافت کی تاریخ میں اس کے علمی، اسلامی، تحقیقی اور تاریخی کارناموں کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

برہان کی خوش نصیبی تھی کہ اسے مولانا سعید احمد اکبرآبادی جیسا مدیر ملا جن کی ذات دین و عصر کا حسین امتزاج تھی۔ نافع قدیم اور صالح جدید کے پاسدار تھے،گروہ بندی ان کے مزاج کے خلاف تھی، وہ عالم و فاضل ہونے کے ساتھ علم پرور اور علم کے قدر شناس بھی تھے۔انھوں نے برہان کو اعلیٰ معیار کا رسالہ بنانے میں اپنی ساری صلاحیت صرف کر دی۔وہ بنفس نفیس رسالے کی ترتیب کا پورا کام انجام دیتے تھے۔اس کے ٹکر کا صرف ایک ہی رسالہ اس زمانے میں تھا اور وہ اعظم گڑھ کا معارف تھا، دونوں میں معاصرانہ چشمک بھی چلتی تھی تاہم دائرے سے آگے نہیں اور کبھی دونوں ایک دوسرے کی تعریف بھی کرتے تھے۔

'نظرات' کے عنوان سے اس کا اداریہ ہوا کرتا تھا، یہ اداریے کبھی کبھی مختصر اور اکثر طویل ہوا کرتے تھے اور حالاتِ حاضرہ کے مختلف جہات کا احاطہ کرتے ہوئے بڑے چشم کشا ہوا کرتے تھے۔ وفیات کا بھی ایک مستقل عنوان تھا جس کے تحت مولانا نے ڈیڑھ سو سے زائد مضامین لکھے۔اب ڈاکٹر تبسم صابر نے انھیں کتابی صورت دے کر شائع کر دیا ہے۔ سید اختیار جعفری کے مطابق مولانا اکبرآبادی کے وفیات پر لکھے کل 176 چھوٹے بڑے مضامین ہیں۔('اشاریہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی' سہ ماہی 'فکر و تحقیق، نئی دہلی، جنوری تا مارچ 2016) ڈاکٹر سہیل شفیق نے 1938-2001 تک کے جملہ وفیات کو مرتب کر دیا ہے جس میں تین سو سے زائد شخصیات پر لکھے مضامین شامل ہیں۔نقد و نظر کے عنوان سے تبصروں کا بھی ایک مستقل کالم تھا، اسی طرح سے کسی کتاب پر طویل تبصرے یا تبصراتی مضامین 'باب التقریظ والانتقاد' کے زیر عنوان تحریر کیے جاتے تھے۔اس سلسلے میں مولانا بڑے معتدل اور اصولی انسان تھے، وہ ایسے مواقع پر شخص کے بجائے فن پر نظر رکھتے تھے۔ان کے تبصرے بھی کتابی شکل اختیار کر چکے ہیں اور ان کے اداریوں اور سفر ناموں پر بھی تحقیقی کام جاری ہے۔ندوۃ المصنفین کی بہت سی کتابیں پہلے قسط وار برہان ہی میں شائع ہوتیں پھر کتابی شکل اختیار کرتیں۔

اُس وقت ہندوستان کا شاید ہی کوئی معتبر اردو کا محقق ہوگا جو برہان میں نہیں چھپا ہوگا۔

'برہان' دین و عصر کا خوبصورت امتزاج اور اپنے زمانے کا ایک منفرد رسالہ تھا۔معروف نقاد حقانی القاسمی لکھتے ہیں:

''برہان کی جو ادبی، مذہبی خدمات رہی ہیں ان سے اہلِ دانش و بینش بخوبی واقف ہیں۔'برہان' نے اردو زبان کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور زبان کے دائرے کو علمی و فکری اعتبار سے وسعت عطا کی۔ بہت سے اہم فکری اور ادبی مباحث کے ذریعے اردو داں طبقے کو آگاہ بھی کیا ہے اور ادب کو ایک نئی معنویت عطا کی، اسے مذہب، معاشرہ اور کلچر کے تناظر میں پرکھا اور اس کے افادی پہلوؤں کو روشن کیا۔''

(دارالعلوم دیوبند: ادبی شناخت نامہ، آل انڈیا تنظیم علمائے حق، نئی دہلی، 2006 ص: 107-106)

برہان کے امتیازات و خصوصیات پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر عفیرہ حامد لکھتی ہیں:

''یہ علمی و ادبی رسالہ تھا، اس نے مذہب، تاریخ، عمرانیات، لسانیات اور احادیث کو اپنے صفحات میں جگہ دی، 'برہان' نے اردو زبان کے مسئلے کو شرعی نقطۂ نظر سے پیش کیا اور مختلف آیات کے حوالوں سے یہ بات ثابت کی کہ کسی قوم کی تہذیب و تمدن کا تحفظ اور بقا اس کی زبان میں مضمر ہے۔...'برہان' کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس نے اردو زبان کے تحفظ کے لیے منفرد نظریے کو اپنایا اور شرعی نقطۂ نظر سے اس کی وضاحت کی اس لیے اس کی ادبی خدمات کو اس دور کا ہر رسالہ تسلیم کرتا ہے جس نے دین اسلام اور تاریخ اسلام کو اردو داں طبقے میں دوبارہ زندہ کیا۔''

(اردو ادبی رسائل کا جائزہ، مخزن، لاہور، 7 بحوالہ دار العلوم دیوبند: ادبی شناخت نامہ، ص: 107)

آج جب کہ اردو صحافت کا دو سو سالہ جشن منایا جا رہا ہے اور اخبارات و رسائل اور ان کے مدیران کو یاد کیا جا رہا ہے لیکن افسوس! دور دور تک اس عظیم رسالے کا کوئی ذکر نہیں ملتا جب کہ اہل علم و قلم جانتے ہیں کہ تریسٹھ برسوں تک مجلاتی صحافت کی دنیا میں ماہنامہ 'برہان' دہلی کا کیسا دبدبہ رہا اور اس نے صحافتی میدان میں اپنے مدلل و مثبت اسلوب اور معتدل اور نرم لہجے کے ذریعے کیسا انقلاب برپا کیا تھا۔کاش اس کا سلسلہ مزید دراز ہوتا۔

■

Dr Mohammad Serjuddin
Assistant Professor
Islamic Studies MANUU Arts and Science College, Near KSERT College
Budgam Road, Humhama
Srinagar - 190021 (J&K)
Mobile:9899189028

ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور 'سب رس' کی ادبی خدمات

ناظم علی

ڈاکٹر زور نے حیدرآباد میں علمی و ادبی سرگرمیوں کے فروغ کے لیے ایک ادبی ادارے کی ضرورت محسوس کی اور 1931 میں ادارہ ادبیات اردو کی بنیاد شیخ کندہ حیدرآباد میں رکھی، جس کا مقصد زبان و ادب کی خدمت کے علاوہ دکنی تہذیب اور ریت و رواج کی بقا تھا۔ ڈاکٹر زور دکنی ادب اور تہذیب کے عاشق تھے۔ انھوں نے یہاں کی تہذیب، تمدن اور تاریخ کو ادب کے علاوہ ادارہ ادبیات اردو کے ذریعے جاری و ساری رکھا، اس کی بقا و تحفظ کا سامان فراہم کیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے اپنی تحقیقی و تنقیدی اور تخلیقی تصانیف سے اردو زبان و ادب کو مالا مال کیا۔ انھوں نے زبان و ادب میں پہلی مرتبہ تنقید و لسانیات کو متعارف کروایا، اس کے علاوہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اردو زبان خاص کر دکنی زبان و ادب کے فروغ کے لیے جنوری 1938 سے ماہنامہ 'سب رس' جاری کیا۔ عوام اور خواص کے ادبی ذوق کی تسکین کے علاوہ ادارے کی ترقی اور کام کی وسعت کے لیے ترجمان کی شدت سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جو اپنے مقاصد اور خیالات سے اردو داں طبقے کو روشناس کرا سکے۔ اسی خیال کی عملی صورت 'سب رس' ہے۔ یہ ایک طرف معلوماتی تھا، دوسری طرف اس میں سلاست اور افادیت کا بھی خاص خیال رکھا گیا، اس لیے یہ حیدرآباد ہی میں نہیں بلکہ حیدرآباد کے باہر بھی مشہور رہا۔ اس کے پہلے شمارے کا سرورق عبدالرحمٰن چغتائی نے بنایا تھا، ایک سال تو یہ رسالہ ڈاکٹر زور کی نگرانی میں صاحب زادہ میر محمد علی خاں میکش کی ادارت اور خواجہ حمید الدین شاہد کے زیر اہتمام پابندی سے نکلتا رہا لیکن جب اس کی مانگ بڑھی تو اس کے لیے ایک مجلس انتظامی کی ضرورت محسوس کی گئی، نگراں ڈاکٹر محی الدین قادری زور تھے۔ سکینہ بیگم نے خواتین کے مضامین کی اور معین الدین احمد انصاری نے بچوں کے مضامین کی ذمے داری سنبھالی۔ 1940 تک ایک ہی سب رس نکلتا تھا جس میں بچوں کے ضمیمے کے علاوہ ایک اور ضمیمہ معلومات کا شامل کیا گیا، آگے چل کر بچوں اور معلومات کا حصہ ختم کر دیا گیا۔ 1940 سے بچوں اور طلبہ کے سب رس کے علاوہ ایک اور پرچہ سب رس معلومات کے نام سے جاری کیا گیا جس میں معلوماتی سائنسی علمی ادبی مضامین شائع ہوتے تھے۔ میر محمد علی خاں میکش کے بعد خواجہ حمید الدین شاہد سلیمان اریب اور وقار خلیل بھی مختصر عرصے کے لیے سب رس کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ڈاکٹر زور کے انتقال کے بعد نگ بھگ بارہ سال تک اس کی ادارت کے فرائض ڈاکٹر اکبر الدین صدیقی نے انجام دیے۔ سلیمان اریب کی صحافتی زندگی کا آغاز بھی درحقیقت سب رس ہی سے ہوتا ہے اور وقار خلیل سب رس سے مستقل طور پر وابستہ رہے۔ ان کے بعد ڈاکٹر مغنی تبسم اس کے مدیر رہے۔ ڈاکٹر مغنی تبسم کے انتقال کے بعد پروفیسر بیگ احساس اس ماہنامہ کے مدیر رہے۔ ان کے انتقال کے بعد پروفیسر ایس اے شکور سب رس کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ شکور صاحب کچھ انقلابی تبدیلی لائے اور سب رس میں زیادہ تر حیدرآباد دکن کے قلم کاروں کو جگہ دی جانے لگی اور یہ ڈاکٹر زور کا خواب بھی تھا کہ حیدرآباد دکن کے ادیبوں و شعرا کی تخلیقات کے لیے سب رس جاری ہوا تھا۔ اس کے پہلے شمارے میں بھی اعلان کیا گیا تھا کہ اس میں دکنی فن پارے کو جگہ دی جائے گی، یہ خوش آئند اقدام ہے۔

عام شماروں کے علاوہ سب رس کے خاص شمارے بھی شائع ہوئے۔ مارچ اپریل 1948 کو میکش نمبر نکلا جس میں ان کی حیات و شاعری سے متعلق مضامین اور نظمیں شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ میکش کا غیر مطبوعہ کلام اور خطوط بھی شائع کیے گئے میکش کا سب رس سے بہت قریبی اور گہرا تعلق رہا اور وہ اس رسالے کے پہلے مدیر رہے، سب رس نے ان کی خدمات کے اعتراف اور خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے اس نمبر کا اہتمام کیا۔ سب رس نے اپریل 1949 میں ایک خاص نمبر نواب سالار جنگ مرحوم شائع کیا جس کا جلد نمبر 12 شمارہ نمبر 4 میں نواب سالار جنگ بہادر کی زندگی اور کارناموں پر روشنی ڈالی گئی اس کے جملہ صفحات 64 ہیں۔

سب رس نے ڈاکٹر زور کے انتقال پر 1962 ماہ اکتوبر نومبر دسمبر نمبر شائع کیا، اس خاص نمبر میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی شخصیت فن اور ادبی کارناموں خصوصاً لسانیاتی خدمات پر مضامین شائع کیے گئے ان پر مضامین لکھنے والوں میں نصیر الدین ہاشمی، سید حرمت الاکرام، ڈاکٹر گیان چند جین وغیرہ شامل تھے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر زور کی تخلیقات، مضامین خطبات، خطوط، نظمیں اور غزلیں شائع ہوئیں۔ سب رس نے مندرجہ بالا خاص نمبرات کے علاوہ جنوری 1971 میں سالنامہ جاری کیا۔ اس میں دکنی شعرا اور دکنی زبان پر مضمون شائع ہوئے۔ اس سالنامہ کے نگراں اور مرتب پروفیسر سید علی اکبر اور محمد اکبر الدین صدیقی تھے۔ یہ 128 صفحات پر مشتمل ہے۔ متذکرہ بالا نمبرات کے علاوہ سب رس کے کئی بیش بہا گرانقدر نمبر شائع ہوئے جن میں بشیر النسا بیگم، قلی قطب شاہ نمبر، غالب نمبر قابل ذکر ہیں۔ نجیب اشرف ندوی، نواب عنایت جنگ اور نصیر الدین ہاشمی کے انتقال پر ان کے بارے میں خاص نمبر شائع کیے گئے۔ اس کے علاوہ سب رس کے خاص نمبرات گوشے، سالنامے ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہوئے اور ہر نمبر کے بارے میں ملک کے اہم سب ہی رسائل و جرائد میں مبصرین نے ان پر اظہار خیال کیا، جناب طیب انصاری اپنی تصنیف حیدرآباد میں اردو صحافت شائع شدہ جون 1980 میں سب رس کی خدمات کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

"علمی اور ادبی نقطۂ نظر سے 'سب رس' کی اشاعت بے حد اہمیت رکھتی ہے تحقیق کے میدان میں سب رس خضر کا فرض انجام دیتا ہے۔ یہ باب الداخلہ ہے جہاں ہر ادیب اور محقق کو ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ سب رس ہمیشہ سے موقتی تحریکوں سے محفوظ رہا ہے، لیکن ہر نئے رجحان کو اس میں جگہ ملی ہے، اس رسالے کی اگر کوئی خصوصیت ہے بھی تو یہی کہ اس کے صفحات دکنی ادب کی بازیافت کے لیے ہمیشہ کھلے رہے ہیں، دکنی ادب کی بازیافت ایک تہذیب اور ایک کلچر کی دریافت ہے۔" (حیدرآباد میں اردو صحافت ص 190)

حیدرآباد کے رسائل و جرائد میں 'سب رس' کی حیثیت اس لیے بھی منفرد ہے کہ یہ زمانہ قدیم ہی سے اردو زبان و ادب کی خدمت کرتا چلا آ رہا ہے اس کے ہمعصر زمانے کے دست برد سے متاثر ہو کر اپنے وجود کو برقرار نہ رکھ سکے۔ قدامت کے لحاظ سے منفرد ہونے کے علاوہ یہ آج بھی علم و ادب کی شمع جلائے ہوئے ہے۔ سب رس ایک طرف تو علم و ادب کی خدمت کرتا رہا تو دوسری طرف ملک کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات شائع کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کے علاوہ ان مصنفین کی کتابیں بھی شائع کیں جن کے کئی مضامین سب رس

میں شائع ہو چکے تھے۔ آج کل اس میں دکنی ادب کو شائع کرنے کے لیے زیادہ توجہ دی جارہی ہے۔ اس کو ابتدا ہی سے صف اول کے ادیبوں، نقادوں اور شاعروں کا قلمی تعاون حاصل رہا۔ اس کا مطالعہ محققوں، ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور ادب کے طالب علموں کے لیے بے حد ضروری اور مفید ثابت ہوگا۔ آج بھی یہ پابندی سے آب وتاب کے ساتھ اردو کی گراں قدر خدمت انجام دے رہا ہے۔ سب رس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دکنی ادب سے متعلق مضامین اور تحقیقی مقالوں کو شائع کیا جاتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان و پاکستان کی جامعات میں جہاں جہاں دکنی پڑھائی جاتی ہے وہاں سب رس سے استفادہ بھی کیا جاتا ہے اور اس کے مضامین حوالے کے طور پر دوسرے معاصر رسالوں میں ڈائجسٹ بھی کیے جاتے ہیں۔

جناب مغنی تبسم درس وتدریس سے سبکدوشی کے بعد اس ادارے سے وابستہ ہوگئے تھے۔ اپنے آپ کو ادارے کے لیے وقف کردیا تھا۔ ماہنامہ سب رس کے معیاری اور ادبی قد کو بڑھا دیا تھا۔ آپ کی وابستگی ادبی وقار و وزن کا موجب بنی۔ آپ نے رسالہ سب رس کو نئی آب وتاب اور وسعت عطا کی۔ آپ کی ادارت ونگرانی میں تحقیقی تنقیدی اور ادبی مضامین کے علاوہ دکنی ادب سے متعلق گوشے شائع ہوئے اور خاص نمبر بھی نکلے۔ جو آج بھی دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔

پروفیسر بیگ احساس کے دور میں یہی روایت چلتی رہی، لیکن دکنی قلمکاروں و ادیب کو کم موقع دیا گیا۔ پروفیسر بیگ کے انتقال کے بعد پروفیسر ایس اے شکور نے ادارت کے فرائض کی ذمے داری سنبھالی۔ انھوں نے اگست 2021 سے سب رس میں زیادہ تر حیدرآباد دکن کے قلمکاروں کو موقع دیا ہے۔ ان کی ادارت میں چند شمارے شائع ہوئے ہیں۔ وہ بھی کیفیت وکمیت کے اعتبار سے معیاری ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو اور سب رس کے مزاج ومنہاج کا خیال رکھا جارہا ہے۔ میں یہ کہوں تو بے جانہ ہوگا کہ سب رس کے شمارے ادبی علمی مخزن کے نمونے ہیں، اسکالر استفادہ کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ اس کی مجلس ادارت میں سرپرست راجکماری اندرادیوی دھن راج گیر صدر جناب زاہد علی خاں، معتمد عمومی پروفیسر ایس اے شکور اور مجلس مشاورت میں پروفیسر گوپی چند نارنگ او رپروفیسر اشرف رفیع شامل ہیں۔ پروفیسر ایس اے شکور مدیر سب رس اکتوبر 2021 اداریے میں سب رس کے آغاز وارتقا کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

”آزادی سے قبل حیدرآباد میں اردو زبان وادب کی ترقی کے لیے جن شخصیتوں نے بڑے پیانے پر تحریک اور اشاعتی کام انجام دیے، ان میں سب سے نمایاں اور ذی وقار پروفیسر سید محی الدین قادری زور تھے۔ ان کے بے شمار ادبی کارناموں میں ماہنامہ 'سب رس' کے اجرا کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ زور صاحب کا خیال تھا کہ حیدرآباد میں ادبی ذوق کے حامل باصلاحیت تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی کام انجام دینے والوں کی کمی نہیں ہے۔ اکثر علمی گھرانوں، درگاہوں سے منسلک کتب خانوں اور عمومی لائبریریوں میں ادبی مخطوطات کے انبار موجود تھے۔ ان خزانوں میں چھپے ادبی سرمایہ کی کیفیت اور اہمیت سے عام طور پر لوگ واقف نہیں تھے، جن کو کسی قدر اندازہ تھا، اپنی معلومات قلم بند کرتے اور دنیائے ادب تک مطبوعہ اپنی تخلیقات شائع کرنے کی طرف راغب نہیں تھے۔“

اس اقتباس سے اندازہ ہوجائے گا کہ ڈاکٹر زور سب رس کو کس طرح ادبی اعتبار سے ہمہ جہت بنانا چاہتے تھے۔ وہ ادب کے تمام گوشوں پر کام کرنا چاہتے تھے اور نئے نئے تنقیدی، تحقیقی اور تخلیقی انکشافات کرنا چاہتے تھے۔ 'سب رس' سے وابستہ مدیروں نے شروع سے ہی تمام گوشوں پر مقالات و مضامین پیش کرکے اردو زبان وادب میں وقیع اضافہ کیا ہے۔ آج بھی اس کا گٹ اَپ سٹ اَپ خوب صورت اور مشمولات بصیرت افروز فکر انگیز ہوتے ہیں۔ لگ بھگ 83 سال سے زبان وادب کی ترویج میں مشغول ومنہمک ہے۔

'سب رس' کے کئی خاص شمارے اور خصوصی نمبرات وخصوصی گوشے شائع ہوئے جن کی تفصیل اس طرح ہے:

• محرم نمبر، مارچ 1938، • اقبال نمبر، جون 1938، • حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس ضمیمہ، اکتوبر 1938، • مرقع دکن نمبر، 1939، • اردو نامہ نمبر، جنوری 1940، • سالگرہ نمبر، جنوری 1940، • جنگ نمبر، فروری 1940، • ریڈیو نمبر، جنوری 1941، • ادارہ ادبیات اردو نمبر، مئی 1941، • ترقی پسند ادب نمبر، جولائی 1942، • میکش نمبر مارچ اپریل 1948، • سالار جنگ نمبر، اپریل 1949، • افسانہ نمبر، ستمبر 1949، • خاص نمبر، فروری مارچ 1954، • حیدرآباد اردو کانفرنس نمبر، جون- جولائی اگست 1954، • جشن سیمیں 25 ادارہ ادبیات اردو جنوری مارچ 1956، • صفی نمبر، مارچ اپریل 1956، • امجد نمبر، جولائی اگست 1956، • ادارہ نمبر، جنوری 1957، • خاص نمبر قلی قطب شاہ، اپریل مئی جون 1958، • محمد قلی قطب شاہ نمبر جنوری 1960، • ادارہ نمبر، مارچ 1960، • ایوان اردو نمبر، مئی 1960، • ادارہ نمبر، اپریل 1961، • ٹیگور نمبر، جون 1961، • محمد قلی قطب شاہ نمبر جنوری 1962، • ادارہ نمبر، مارچ 1962، • امجد نمبر، مئی جون 1962، • عزیز جنگ ولا نمبر، جولائی 1962، • ظفر نمبر، جنوری فروری 1963، • ادارہ نمبر، اپریل 1963، • زور نمبر، اکتوبر تا دسمبر 1963، • یوم قلی قطب شاہ نمبر، فروری 1964، • ادارہ نمبر، مئی 1965، • نصیرالدین ہاشمی نمبر، جنوری 1965، • ادارہ نمبر، جولائی 1965، • یادگار محمد قلی قطب شاہ نمبر، اپریل 1966، • ادارہ نمبر، اگست 1966، • یوم زور اکتوبر، 1966، • ادارہ نمبر، اگست 1967، • یوم قلی نمبر، جولائی 1968، • ادارہ نمبر، ستمبر 1968، • نجیب اشرف ندوی نمبر، اپریل 1969، • غالب نمبر، پہلا حصہ، ستمبر اکتوبر 1969، • غالب نمبر، دوسرا حصہ، دسمبر 1969، • ادارہ نمبر، جولائی 1970، • سالنامہ جنوری، 1971 بشیر النسا بیگم نمبر، • عنایت جنگ نمبر، اپریل 1971، • ادارہ نمبر، فروری 1972، • خاص شمارہ یوم قلی، جون 1972، • نظیر نمبر، جولائی 1972، • ادارہ نمبر، ستمبر 1972، • احتشام نمبر، مارچ 1973، • ادارہ نمبر، اکتوبر 1973، • ادارہ نمبر، ستمبر 1974، • ادارہ نمبر، جولائی 1975، • یوم محمد قلی قطب شاہ، مارچ 1976، • سالنامہ، جنوری 1977، • اقبال نمبر، نومبر 1977، • یوم محمد قلی قطب شاہ نمبر، مارچ 1977، • ادیب نمبر، ستمبر 1980، • زور نمبر، نومبر 1980، • پروفیسر علی اکبر، نمبر ستمبر اکتوبر 1983، • عالم خوندمیری نمبر، جنوری 1985، • سکینہ بیگم نمبر، ستمبر-اکتوبر 1986، • سلور جوبلی تقاریب یوم محمد قلی قطب شاہ، مارچ 1987، • محمد قلی قطب شاہ نمبر، مئی 1988، • محمد قلی قطب شاہ نمبر، ستمبر 1989، • مجاہد علی عباس نمبر، اکتوبر 1989، • ڈاکٹر حفیظ قتیل نمبر، نومبر دسمبر 1990، • ڈاکٹر سکینہ الہام نمبر، اگست 1991، • عابد علی خاں نمبر، جنوری، فروری، مارچ 1993

سب رس کے خصوصی نمبرات

یوم قلی قطب شاہ، مئی جون 1996، محبوب حسین جگر، مارچ 1998، • یوم محمد قلی قطب شاہ نمبر، اپریل 1998، • تہنیت النسا، بیگم نمبر، نومبر 1998، • زور نمبر، ستمبر 1999، • خواجہ حمیدالدین شاہد نمبر، دسمبر 2001، • غالب نمبر، فروری 2006، • عزیز احمد نمبر، نومبر 2010، • حکیم شمس اللہ قادری نمبر، جون 2011، • پروفیسر شہریار اور پروفیسر مغنی تبسم، مارچ 2012، • مہ لقا چندہ بائی، ستمبر 2012، • پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا، جنوری 2018، • گوشہ پروفیسر بیگ احساس، جنوری 2002، • ممتاز افسانہ نگار گوشہ علی باقر، جون 2007، • گوشہ سید تقی الدین قادری، نومبر 2007، • گوشہ، ڈاکٹر شاہد صدیقی، ستمبر 2008

■

Dr. Mohd Nazim Ali
Makan No.: 17.7.335, Barhaman Wari
Yaqutpura
Hyderabad- 500023 (Telangana)
Mob.:9603018825

اساتذہ کی تعلیم میں ابھرتے ہوئے رجحانات اور چیلنجز

احمد حسین

آج ہم اکیسویں صدی میں زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں ٹیکنالوجی نے برق رفتاری کے ساتھ ترقی کی ہے۔ خاص طور پر انفارمیشن ٹیکنالوجی کے شعبے میں بہت بڑا انقلاب آیا ہے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی نئی ایجاد ہماری زندگی میں شامل ہو رہی ہے۔ آج کے اس دور میں جہاں ٹیکنالوجی کے بڑھتے اثرات نے زندگی کو تیز رفتار بنا دیا ہے وہیں تعلیم کے شعبے میں بھی ٹیکنالوجی نے اپنا خاص مقام بنا لیا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کے ذرائع سے استفادہ کرتے ہوئے اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر تعلیم میں بہتری لائی جا سکتی ہے۔ خاص طور پر اساتذہ کی تعلیم میں۔ تعلیم میں نئے رجحانات اور ٹیکنالوجی کے استعمال کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اساتذہ کا ٹیکنالوجی سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اساتذہ کی تعلیم میں ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے تدریسی پیشے کو عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی تعلیمی ادارے اپنے تعلیمی اور انتظامی امور میں ٹیکنالوجی کا استعمال کر کے تعلیمی اور انتظامی امور کو بہتر اور فعال بنا سکتے ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات اور ضروریات کے زیر اثر تعلیم میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ نئے رجحانات ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ یہ رجحانات کافی حد تک ٹیکنالوجی سے متاثر ہیں۔

تعلیم اساتذہ کا تصور

نیشنل کاؤنسل فار ٹیچر ایجوکیشن (NCTE) کے مطابق استاد کسی بھی تعلیمی پروگرام کا سب سے اہم عنصر ہوتا ہے۔ وہ کسی بھی مرحلے پر تعلیمی عمل کے نفاذ میں مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ طلبا کی کامیابی کی سطح اساتذہ کی اہلیت سے طے ہوتی ہے۔ لہٰذا بنیادی طور پر تعلیم کا معیار اساتذہ کے معیار پر منحصر ہوتا ہے۔

اساتذہ کی تعلیم یا اساتذہ کی تربیت سے مراد وہ پالیسیاں، طریقۂ کار اور پروویژنس ہیں جو اساتذہ کو معلومات، مختلف طرز عمل اور صلاحیتوں سے آراستہ کرنے کے لیے ترتیب دیا گیا ہے۔ جس کی مدد سے وہ کمرہ جماعت، اسکول اور وسیع تر معاشرے میں اپنے فرائض اور ذمے داریوں کو موثر طریقے سے انجام دینے کے قابل ہوں۔

تعلیم اساتذہ کے ذریعے اساتذہ کا ایک ایسا گروہ تیار کرنا ہے جو آنے والی نسلوں کے مستقبل کو سنوارنے میں اہم کردار ادا کریں گے۔ ایک استاد کو معاشرتی نظام، مختلف اقدار اور مختلف سماجی رسم و رواج کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کے جدید طریقوں سے واقفیت ہونی چاہیے۔ تدریس ایک اقداری اور علم و دانش کا متقاضی پیشہ ہے۔ معلم اساتذہ (اسٹوڈنٹ ٹیچر) کو سخت تیاری اور ٹیچر ایجوکیٹر کو مسلسل پیشہ ورانہ فروغ اور تعلیمی پیشہ ورانہ اعانت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اساتذہ کی تعلیم میں ابھرتے ہوئے رجحانات

حالیہ برسوں میں تعلیم کے تصور میں تبدیلی آئی ہے۔ جس کی ایک اہم وجہ انٹرنیٹ اور ٹیکنالوجی ہے۔ تعلیم میں ٹیکنالوجی کا بڑھتا ہوا استعمال، بدلتے ہوئے سماجی تناظر اور اقدار میں ہونے والی تبدیلیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک مؤثر استاد بننے کے لیے صرف تعلیم کی ہی ضرورت نہیں بلکہ جدید دور کی ضروریات کو ذہن میں رکھتے ہوئے نئے رجحانات کے مطابق اساتذہ کی تعلیم میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ ان نئے رجحانات کو جاننے، سمجھنے، اور ساتھ ہی ان کے استعمال کے طریقوں کو جاننا ایک معیاری استاد کے لیے ضروری ہے چہ جائیکہ اس کا تعلق اسکول، کالج اور یونیورسٹی سے ہو۔ سب سے پہلے ہمیں تعلیم میں آنے والے نئے رجحانات کے بارے میں جان لینا ضروری ہے جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

انفارمیشن اور کمیونیکیشن ٹیکنالوجی

کمپیوٹر اور ٹیکنالوجی کا استعمال معاشرے میں وسعت اختیار کر چکا ہے جس کی وجہ سے روزمرہ زندگی میں کمپیوٹنگ کی مہارت کی ضرورت میں اضافہ ہوا ہے۔ مختلف تعلیمی سطحوں پر آئی۔سی۔ٹی کے استعمال میں اضافہ ہوا ہے۔ ہندوستان میں اساتذہ کو اب بھی اسکولوں میں آئی۔سی۔ٹی کے علمی استعمال میں مہارت حاصل کرنے کے لیے ڈیجیٹل خواندگی کی ضرورت ہے۔ اساتذہ کی تعلیم اپنے طلبا اور اساتذہ کی صلاحیتوں میں آئی۔سی۔ٹی کے استعمال کو شامل کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ آئی۔سی۔ٹی آج درس و تدریس کے عمل میں لازمی جز کی حیثیت رکھتی ہے۔ آئی سی ٹی کے ذریعے ای۔لرننگ، موبائل لرننگ، منصوبہ سبق، آن لائن بحث و مباحثہ، رہنمائی، مختلف ویبسائٹ کی تشکیل، آن لائن امتحانات، وغیرہ میں مدد ملتی ہے اور ساتھ ہی برقی کتابیں، آرٹیکل، تحقیقاتی رپورٹ، تھیسیس، وغیرہ بھی بہ آسانی دستیاب ہو جاتے ہیں۔

آئی۔سی۔ٹی کے استعمال کے جدید طریقوں میں اوور ہیڈ پروجیکٹر، ویڈیو کلپس، ریکارڈنگ، فیس بک، ٹویٹر، سلائڈ شیر، ورچوئل کلاس روم، اسمارٹ بورڈ، وائٹ بورڈ اور MOOCs وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک معیاری استاد کو ان تمام نئے رجحانات سے واقف ہونا چاہیے۔ اساتذہ کو نئے رجحانات اور ضروریات سے واقف کرانے میں تعلیم اساتذہ کا اہم کردار ہے، تعلیم اساتذہ میں ان چیزوں کو شامل کر کے معیاری اساتذہ تیار کیے جا سکتے ہیں۔ 21 ویں صدی کی تعلیم 'طلبا مرکوز تعلیم' ہے۔ طلبا مختلف ذرائع سے سیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیمی عمل میں آئی۔سی۔ٹی اور ملٹی میڈیا بہت ہی اہمیت کی حامل ہے۔ اسی لیے طلبہ کے ساتھ ساتھ اساتذہ کو بھی آئی۔سی۔ٹی کی معلومات اور تعلیم میں آئی۔سی۔ٹی کے اطلاق سے واقف ہونا بے حد ضروری ہے۔

تدریس کے جدید طریقے

موجودہ وقت میں درس و تدریس کے لیے روایتی طور طریقوں کی اہمیت نہ کے برابر ہے۔ ٹیکنالوجی کے اس دور میں ہر فرد کچھ الگ اور نئے پن کی جستجو رکھتا ہے۔ تعلیمی شعبے میں بھی ٹیکنالوجی کا استعمال کر کے کچھ

الگ اور جدید تدریسی طریقوں کو فروغ دیا گیا ہے اور دیا جا رہا ہے۔ تعلیم میں جدید طریقوں کا استعمال کر کے درس و تدریس کے عمل کو طلبا اور اساتذہ دونوں کے لیے آسان اور دلچسپ بنایا جا سکتا ہے۔ مختلف آلات مثلاً: کمپیوٹر، اوور ہیڈ پروجیکٹر، ویڈیو، ڈاکیومنٹری وغیرہ کا استعمال تدریس کے عمل کو دلچسپ اور پر اثر بناتا ہے۔ جدید تدریسی طریقوں کا استعمال کرتے ہوئے مختلف اہم تصورات کو نئے انداز میں پیش کرنا اور مختلف سرگرمیوں میں شامل ہونے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کر کے طلبا کی تخلیقی صلاحیت کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ طلبا کو اپنے تجربات اور تصورات پیش کرنے کی پوری آزادی دی جاتی ہے۔ طلبا کو نئے تصورات قائم کرنے میں ایک استاد جدید تدریسی طریقوں کا استعمال کرتے ہوئے اُن کی مدد اور رہنمائی کر سکتا ہے۔ وقت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے تعلیم میں بہت سے جدید تدریسی طریقے وجود میں آئے ہیں:

ریئل ورلڈ ٹیچنگ: اس طریقہء تدریس میں طلبا کے ذاتی تجربات، ان کی روز مرہ زندگی کے حالات اور آس پاس موجود مختلف اشیا وغیرہ سے مثالیں دے کر اکتساب کو آسان اور عام فہم بنایا جاتا ہے تاکہ طلبا آسانی اور دلچسپی سے مختلف تصورات کو سمجھ سکیں۔

رول پلے کا طریقہ: طلبا کی پوشیدہ مہارتوں کو فروغ دینے کے لیے رول پلے طریقہء تدریس ایک بہترین طریقہ ہے۔ اس سے طلبا کے ذہن میں کشادگی، شخصیت میں نکھار اور دلچسپی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

اسٹوری بورڈ ٹیچنگ: رڈیارڈ کپلنگ (Rudyard Kipling) نے بالکل درست کہا ہے کہ ''اگر تاریخ کو کہانی کی شکل میں پڑھایا جائے تو اسے کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا۔' کہانی کے ذریعے کسی بھی مضمون اور تصور کو مرحلہ وار اور واضح طور پر سمجھایا جا سکتا ہے۔ اساتذہ اس طریقے کا استعمال کر کے طلبا کی دلچسپی کو برقرار رکھتے ہوئے تدریس کو آسان بنا سکتے ہیں۔ اس طریقہ کار کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں طلبا کو براہ راست شامل کیا جاتا ہے، اور انھیں جوش و خروش کے ساتھ اپنے تصورات کو بھی پیش کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔

گیمی فیکیشن: kapp کے مطابق '' گیم پر مبنی میکانزم، جمالیات اور کھیل کی سوچ کا استعمال کرنے، لوگوں کو شامل کرنے، عمل کی تحریک، سیکھنے کو فروغ دینے اور مسائل کو حل کرنے کے لیے ہے۔'' گیمی فیکیشن محض کھیلوں کا تصور ہے، جس کے ذریعے درس و تدریس کے عمل کو دلچسپ اور آسان بنایا جاتا ہے۔ یہ طریقہ رسمی اور غیر رسمی طور پر طلبا کی حوصلہ افزائی کرنے کے ساتھ ساتھ سیکھنے کے عمل کو بہتر بناتا ہے۔

اساتذہ کے لیے یہ ضروری ہے کے وہ درس و تدریس کے نئے اور دلچسپ طریقوں سے واقفیت حاصل کریں۔ اور اس کے لیے لازمی طور پر تعلیم اساتذہ کے پروگرام میں ان طریقوں کو شامل کیا جانا چاہیے کہ تاکہ معلم اساتذہ ان طریقوں اور نئے رجحانات سے بخوبی واقف ہو جائیں۔ اور تدریسی پیشے میں جانے کے بعد درس و تدریس کے عمل میں ان طریقوں کا استعمال کریں۔

کولیبوریٹیو لرننگ: باہمی تعاون کے ساتھ سیکھنا ایک ایسا نظام ہے جس میں دو یا دو سے زیادہ افراد مل کر سیکھتے ہیں، آپس میں ایک دوسرے سے اپنے تجربات اور تصورات کو شیئر کرتے ہیں۔ طلبا مختلف اہم موضوعات پر ایک دوسرے سے سوشل میڈیا کے ذریعے اپنی معلومات شیئر کرتے ہیں اور اپنے خیالات بھی پیش کرتے ہیں۔ باہمی تعاون زندگی کا ایک اہم حصہ ہے اسے تعلیمی نصاب میں بھی شامل کیا جانا چاہیے۔ اس سے طلبا میں دوسروں کی مدد کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا اور اپنی ذمے داری کا احساس ہوگا۔ ساتھ ہی معاشرتی اقدار کا فروغ ہوگا۔

ایکشن ریسرچ (عملی تحقیق): روایتی لیکچر سننے والے نظام سے درس بہت آگے نکل گیا ہے۔ آج اساتذہ صرف لیکچرر نہیں بلکہ رہنما ہیں، طلبا صرف سننے والے نہیں بلکہ علم کے متلاشی ہیں۔ تعلیم دونوں فریقوں کے لیے زیادہ انٹرایکٹو اور تجرباتی بن چکی ہے۔ اس کے علاوہ اساتذہ کے استعمال کے لیے دستیاب تکنیکوں کے ساتھ تدریسی صلاحیتیں بھی تیار ہوئی ہیں۔ خوش قسمتی سے ہمارے پاس موجودہ زمانے کے مطابق ایک طریقہ ہے جو ایک استاد کو اپنی تعلیم کے ان پہلوؤں کو دیکھنے میں مدد کرتا ہے جن میں بہتری کی ضرورت ہے، وہ طریقہ عملی تحقیق ہے۔ خاص طور پر کمرہ جماعت میں جب ایک استاد طلبا کو مختلف تصورات سے واقف کرانے کی کوشش کرتا ہے تو ریسرچ اس میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ جو اساتذہ نصاب کی کتابوں پر انحصار کرنے کے بجائے تعلیم کے موضوعات پر اپنی تحقیق کرتے ہیں، وہ طلبا کو علم سکھانے میں زیادہ موثر ہو سکتے ہیں۔ ایکشن ریسرچ بنیادی تحقیق کے مقابلے زیادہ مخصوص ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایکشن ریسرچ موجودہ صورت حال پر کی جانے والی تحقیق ہے۔ جو اساتذہ کو اپنی کلاس کو واقعتاً کس چیز کی ضرورت ہے اس پر سرگرم تحقیق کرتی ہے۔ ایکشن ریسرچ ایک پریکٹیشنر ریسرچ ہے۔ جس کے ذریعے اساتذہ اپنی تدریسی ضروریات کی تحقیق کر کے اپنی صلاحیتوں میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

تعمیریت پر مبنی لرننگ: تعمیریت بنیادی طور پر مشاہدہ اور سائنسی مطالعے پر مبنی نظریہ ہے۔ جو یہ بتاتا ہے کہ افراد کیسے سیکھتے ہیں۔ اس نظریے کے مطابق طلبا چیزوں کا تجربہ کرنے اور ان تجربات پر غور کرنے کے ذریعے دنیا کے بارے میں اپنی سمجھ اور علم کی تعمیر کرتے ہیں۔

تعمیراتی اکتساب کا نظریہ ایک ایسا فلسفہ ہے جو طلبا کی منطقی اور تعمیراتی نشو و نما میں مددگار ہے۔ جب ہمیں کسی نئی چیز کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو ہمیں اپنے سابقہ نظریات اور تجربے کے ساتھ اس سے صلح کرنی پڑتی ہے۔ ہر فرد یا طالب علم اپنے اپنے علم کے متحرک تخلیق کار ہیں۔ کلاس روم میں، سیکھنے کا تعمیری نظریہ متعدد مختلف تدریسی طریقوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ عام طور پر اس کا مطلب طلبا کو زیادہ علم سیکھنے کے لیے فعال تکنیکوں کا استعمال کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ طلبا اپنے تجربات پر غور و فکر کریں، ان پر ایک دوسرے سے بات کریں اور یہ دیکھیں کہ ان کی تفہیم میں کس طرح تبدیلی آ رہی ہے۔ اس میں استاد کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔ استاد اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ وہ طلبا کے پہلے سے موجود تصورات کو سمجھتا ہے۔ اور اس کی نشاندہی کرنے کے لیے مختلف سرگرمیوں کی رہنمائی کرتا ہے اور پھر ان پر روشنی ڈالتا ہے۔

ٹیچر پرفارمنس اپریزل: جس طرح طلبا کی تعلیمی تحصیل اور دیگر کارکردگی کی جانچ کی جاتی ہے جو کہ طلبا کو آگے بڑھنے اور بہتر کرنے کے لیے حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ اسی طرح ایک استاد کی کارکردگی کی جانچ یا اندازہ قدر 'ٹیچر پرفارمنس اپریزل' کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ اساتذہ کی کارکردگی کا اندازہ قدر کرنے کا مقصد اساتذہ کو یہ بتانا ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریاں کس طرح پوری کر رہے ہیں، اس میں کیا خامیاں ہیں اور کیا بہتری لائی جا سکتی ہے۔ کارکردگی تعلیمی اداروں کے ذریعے طے شدہ معیارات پر مبنی ہوتی ہے۔ اساتذہ کا ان معیارات سے واقف ہونا ضروری ہے۔ کارکردگی کے معیارات (standards) اساتذہ کو شروع میں ہی بتا دیے جاتے ہیں تاکہ وہ ان معیارات سے بخوبی واقف ہونے کے ساتھ ہی ان سے رہنمائی حاصل کریں۔ پرفارمنس اپریزل کے ذریعے اساتذہ کے کمزور یا منفی اور مضبوط یا مثبت پہلوؤں کو جان کر ان کی رہنمائی کی جا سکتی ہے۔

مذکورہ بالا نکات تعلیم میں آنے والے نئے رجحانات ہیں، جن سے واقفیت حاصل کرنا موجودہ وقت کی ضرورت ہے، اور خاص طور پر اساتذہ کو ان رجحانات سے لازمی طور پر واقف ہونا چاہیے۔ ان تمام رجحانات کو براہِ راست تعلیم اساتذہ میں شامل کرنے سے اساتذہ لازمی طور پر اسے سیکھ سکتے ہیں۔ اور اپنے تدریسی عمل کو دلچسپ بنا سکتے ہیں۔

اساتذہ کی تعلیم میں آنے والے چیلنجز

اساتذہ کی تعلیم میں آنے والے کچھ اہم چیلنجز:

مندرجہ ذیل ہیں:

طلبا اساتذہ (زیر تربیت معلم) کا ناقص تعلیمی پس منظر: بیشتر امیدواروں میں تعلیمی پیشے کا انتخاب کرنے سے پہلے تدریسی پیشے کے تئیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کا تعلیمی پس منظر مضبوط ہوتا ہے۔ کچھ طلبا اپنے مطلوبہ کورس میں داخلہ نہ لے پانے کی وجہ سے ٹیچر ایجوکیشن پروگرام میں داخلہ لے لیتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ ناقص کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

مخصوص مضمون کی معلومات میں کمی: اساتذہ کا تربیتی پروگرام بنیادی مضمون کے علم پر زور نہیں دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے طلبا اساتذہ کی بنیادی مضمون پر اچھی مہارت نہیں ہو پاتی۔

ناقص طریقۂ تدریس: ٹیچر ایجوکیٹر تربیتی ادارے میں اکثر روایتی طریقوں کا استعمال کرتے ہیں۔ جدید کلاس روم مواصلاتی آلات سے ان کی واقفیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ جس کی وجہ سے طلبا اساتذہ نئے طریقوں سے واقف نہیں ہو پاتے ہیں۔

ناکافی تجرباتی تحقیق: تعلیم اساتذہ میں تحقیق کو کافی حد تک نظر انداز کیا گیا ہے۔ جو تحقیق ہوئی ہیں وہ اعلیٰ معیار کی نہیں ہیں۔ اس کی ایک اہم وجہ ہے کہ کسی بھی تحقیق سے پہلے تعلیم اساتذہ کا صحیح مطالعہ نہیں کیا جاتا ہے۔

پریکٹس ٹیچنگ کا مسئلہ: پریکٹس ٹیچنگ، تعلیم اساتذہ پروگرام کا سب سے اہم حصہ ہے۔ یہ درس و تدریس کے سلسلے میں ہر قسم کے وسیع تر انتظامات کی ترغیب دیتا ہے۔ اکثر اوقات دیکھا گیا ہے کہ طلبا اساتذہ (زیر تربیت اساتذہ) تدریس کے کام میں فعال یا سنجیدہ نہیں ہوتے۔

درس و تدریس کی نگرانی کے مسائل: درس و تدریس کے دوران نگرانی کا مقصد طلبا اساتذہ (زیر تربیت اساتذہ) کے تدریسی عمل میں مختلف تکنیک اور صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے ان کی تدریسی سرگرمی میں بہتری لانا ہے اور کمرۂ جماعت کے حالات کا سامنا کرنے کے لیے ان میں اعتماد پیدا کرنے میں مدد فراہم کرنا ہے۔ ساتھ ہی اس کا مقصد اسباق کی منصوبہ بندی کرنا، مشمولات کو منظم کرنا، مناسب اشارے تیار کرنا اور دیگر متعلقہ مہارتوں کی نشو ونما کرنا ہے۔ لیکن موجودہ صورت حال یہ ہے کہ منصوبہ سبق کو سطحی طور پر جانچ لیا جاتا ہے اور اس موضوع کے ماہر کی طرف سے کوئی بحث یا رہنمائی نہیں کی جاتی۔

طلبا اور اساتذہ کی ناواقفیت: اساتذہ کی تربیت کے موجودہ پروگرام طلبا اساتذہ (زیر تربیت اساتذہ) کو قابلیت پیدا کرنے کی مناسب مواقع فراہم بھی نہیں کرتے اور نہ ہی بہتر رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ اکثر اوقات یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ تربیتی کورس کے منتظمین اسکولوں کے موجودہ مسائل سے واقف نہیں ہوتے ہیں۔ لہٰذا اساتذہ کے کام کے نظام الاوقات اور ایک تربیتی ادارے میں اساتذہ کی تیاری کے لیے ڈھالنے والے اسکول کے مابین بہتر تعلقات ہونے چاہیے۔

پیشہ ورانہ ترقی کے لیے سہولیات کا فقدان: زیادہ تر پیشہ ورانہ پروگرام معمول کے مطابق اور ناقابل تصور انداز میں منعقد کیے جاتے ہیں۔ ملک میں اساتذہ کی مختلف تنظیم آپس میں باہمی تعاون نہیں پیش کرتی ہیں۔

آئی۔سی۔ٹی اور ای۔لرننگ: مختلف تعلیمی سطحوں پر آئی سی ٹی کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ اساتذہ اس تکنیک کے استعمال کے طریقے سے بخوبی واقف نہیں ہیں۔ موجودہ وقت کی بڑھتی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے آئی۔سی۔ٹی کو اسکولوں میں شامل کیا جانا چاہیے۔ اساتذہ کے تربیتی کورس میں بھی ٹیکنالوجی کو شامل کرنا ضروری ہے تاکہ اساتذہ آئی۔سی۔ٹی کے استعمال سے واقف ہوکر اپنی تدریس کے عمل میں استعمال کر سکیں۔

ضرورت کے تجزیہ کی عدم موجودگی: وقت کی ضرورت کے حساب سے معاشرے میں کیا تبدیلی آئی ہے اور کن چیزوں کی مانگ میں اضافہ ہوا ہے؟ لوگ کس طرح کی تعلیم حاصل کرنے میں دلچسپی دکھا رہے ہیں؟ ان سارے موضوعات اور ضروریات کا تجزیہ وقتاً فوقتاً ہونا چاہیے۔ جبکہ ایسا نہیں ہے۔ تعلیم اساتذہ ایک ہی سمت میں آگے بڑھ رہی ہے۔ اساتذہ کی تربیت موجودہ دور کی مانگ کے مطابق ہونی چاہیے۔ بھارت جیسے وسیع اور متنوع ملک میں کوئی بھی ایک ہی قسم کا ماڈل یا کورس کے کامیاب ہونے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ اسی لیے ضرورت پر مبنی تربیتی پروگرام ہونے چاہیے۔

تجاویز:

ٹیکنالوجی سے متعلق قومی تعلیمی پالیسی (2020) میں مختلف تجاویز پیش کی گئی ہیں:

قومی تعلیمی پالیسی کے مطابق آنے والے وقت میں تمام سطحوں پر تعلیمی ٹیکنالوجی کے استعمال میں اساتذہ کو ماہر بنانے کے لیے اساتذہ کی تیاری سے متعلق سبھی تعلیمی پروگراموں میں ٹیکنالوجی پر منحصر وسائل کے استعمال سے متعلق عملی تربیت کو شامل کیا جائے گا۔ اس کے تحت connectivity سے متعلق مسائل کو حل کرنا، آلات کی دیکھ بھال اور ان کا استعمال، اور الیکٹرانک وسائل کا استعمال وغیرہ سکھاتا جائے گا۔ تاکہ تعلیمی ٹیکنالوجی کے لیے دستیاب محدود رقم اور توانائی کا مناسب استعمال ہو سکے۔ اساتذہ کو تربیت اور امداد کے ذریعے پوری مہارت دی جائے گی۔ جس سے کہ وہ کمرہ جماعت اور تعلیمی اداروں میں مناسب ٹیکنالوجی کے استعمال کے ذریعے مختلف سرگرمیوں کی رہنمائی کر سکیں۔ اوپن ایجوکیشن ریپوزیٹری کے ویڈیوز کا استعمال سبھی مضامین سے متعلق اساتذہ کی تربیت کے لیے کیا جائے گا۔ زیر تربیت اساتذہ کی صلاحیتوں کا اندازہ کرنے کے لیے مناسب ٹیکنالوجی پر منحصر آلات کی تعمیر کی جائے گی۔ جس سے دیگر ضروریات کے علاوہ درس و تدریس اور اندازۂ قدر کے عمل کو بہتر بنانے میں مدد ملے گی۔

اس کے علاوہ ذیل میں درج تجاویز پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے:

اساتذہ کی تعلیم میں مختلف طریقۂ تدریس کی تعلیمی نظام کی بدلتی ضروریات اور دلچسپی کے مطابق تشکیل نو کی جانی چاہیے۔ مختلف شعبۂ جات میں درس و تدریس سیکھنے کے عمل میں بہتری لانے کے لیے خصوصی پروگرام مثلاً: سیمینار، ورکشاپ، کانفرنس، پروجیکٹ اور بحث و مباحثے کا باقاعدگی سے انعقاد کیا جانا چاہیے۔ تربیتی پروگرام میں ایسے افراد کو ہی داخلہ دینا چاہیے جو واقعی درس و تدریس میں دلچسپی اور قابلیت رکھتے ہوں اور ساتھ ہی اس پیشے کے تئیں وفادار ہوں۔ اساتذہ کی تربیت کے دوران انھیں درس و تدریس اور خاص طور پر ٹیچنگ پریکٹس سے متعلق تمام معلومات واضح طور پر دینی چاہئے۔ مثلاً: منصوبہ سبق کیسے بنانا ہے، طلبا سے کس طرح پیش آنا ہے، درس و تدریس کے عمل کو کس طرح طلبا کے لیے دلچسپ بنانا ہے اور جدید طریقۂ تدریس کا استعمال وغیرہ۔

اختتام:

تعلیم اساتذہ پروگرام میں بہت سارے مسائل ہیں لیکن بہت سارے سرکاری ادارے جیسے: NCTE، NCERT، NAAC، NEUPA وغیرہ اساتذہ کے تعلیمی اداروں میں وقتاً فوقتاً پینل معائنہ کر کے ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اب ہر ادارے کے لیے لازم ہے کہ وہ NAAC کے ذریعے منظوری لے ورنہ اس کی وابستگی منسوخ کر دی جائے گی۔

کوٹھاری کمیشن نے صحیح کہا ہے کہ "The destiny of India is being shaped in its classrooms." اس میں کوئی شک نہیں کہ تعلیم ملک و قوم کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔ لیکن اساتذہ کے معیار سے تعلیم کا معیار بہت حد تک طے ہوتا ہے۔ لہٰذا، اساتذہ کی تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے بہت ساری کوششیں کی گئیں اور اب بھی کی جا رہی ہیں۔

■

Ahmad Husain
Asst. Prof., College of Teacher
Education Bhopal, MANUU, MHK Road,
ITC Campus Near Rafiquia School
Bhopal - 462001
Mob.: 9630569810 / 6205188608

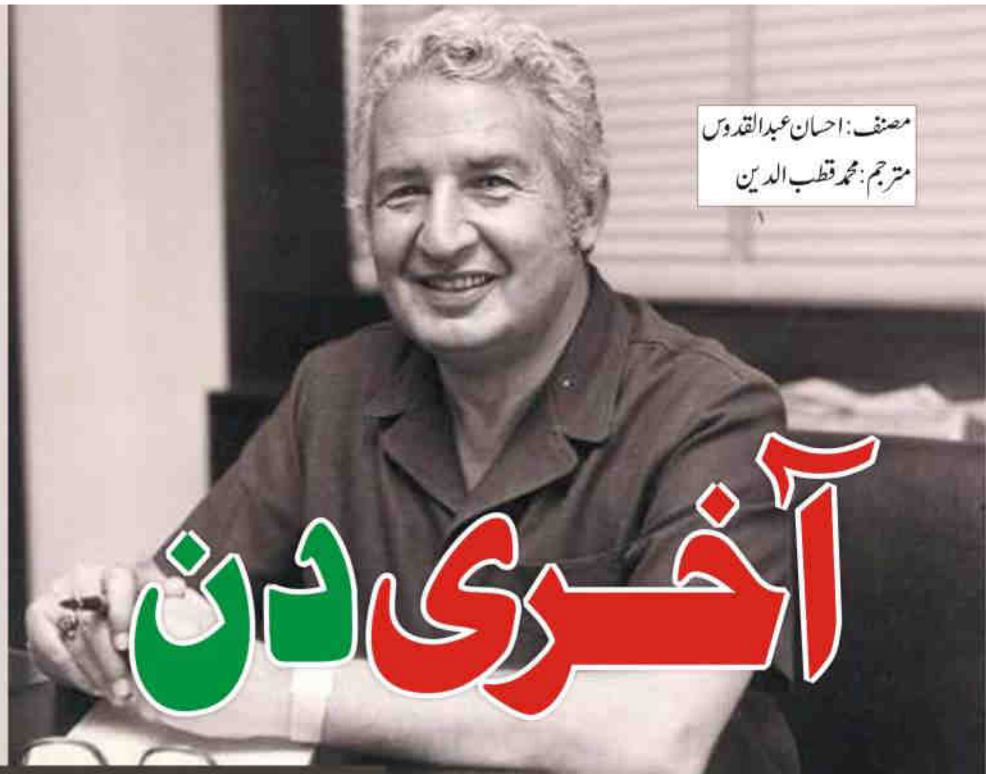

آخری دن

مصنف: احسان عبدالقدوس
مترجم: محمد قطب الدین

آزادی اور محبت کے علم بردار، احسان عبدالقدوس (1919-1990) بیسویں صدی کے مشہور مصری افسانہ نویس اور ناول نگار ادیبوں میں سے ایک ہیں۔ موصوف کی پیدائش مصر کے دارالسلطنت قاہرہ میں ہوئی۔ 'مدرسہ خلیل آغا' میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد 'جامعہ فوأد الأول' سے مزید علمی استفادہ کیا اور 1942 میں قاہرہ یونیورسٹی کے فیکلٹی آف لا سے ایل ایل بی (LLB) کی ڈگری حاصل کی۔

طبیعت میں صحافتی رجحان کے غلبے کے مدنظر، مصر سے شائع ہونے والے ہفت روزہ 'روز الیوسف' کے ایڈیٹوریل بورڈ سے منسلک ہوئے اور اپنے سیاسی و سماجی مضامین کی وجہ سے بہت جلد عالم عرب میں مقبولیت حاصل کی۔ مصری مؤقر اخبار 'الأھرام' اور 'الأخبار' میں بھی ایڈیٹر کا فریضہ انجام دیا۔ 1944 میں انھوں نے عربی فلموں کے لیے اسکرپٹ لکھنا شروع کیا، ساتھ ہی ساتھ عربی افسانہ نویسی اور ناول نگاری کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چند برسوں میں ہی وہ عالم عرب کے ایک بڑے صحافی، سیاسی مفکر، صاحب طرز انشا پرداز، افسانہ نویس اور ناول نگار کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ بایں وجہ احسان عبدالقدوس کے قلم کا جادو عربی جگت میں سر چڑھ کر بولتا ہے اور وہ حقیقی پیار، آزادیِ نسواں اور سیاست کے موضوع پر سلیس زبان میں قلم اٹھانے والے بیباک عربی ادیب کے طور پر جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ عربی زبان و ادب کے خوشہ چینوں کے لیے ان کا طرز نگارش قابل تقلید ہے۔

احسان عبدالقدوس نے چھے سو سے زائد افسانے اور ناول قلم بند کیے، جن میں سے اکثر فلموں، ڈراموں اور سیریلز کی شکل میں بھی ناظرین سے داد تحسین حاصل کر چکے ہیں اور متعدد غیر ملکی زبانوں میں بھی ان کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ جس کے سبب موصوف کی تحریروں کو نہ صرف عالم عرب بلکہ عالمی ادب میں بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، ان کے مشہور افسانوں میں: 'صانع الحب' (پیار کا کاریگر) 'بائع الحب' (پیار کا سوداگر) 'الوسادۃ الخالیۃ' (خالی تکیہ) 'النظارۃ السودا' (کالا چشمہ) 'بنت السلطان' (بادشاہ کی بیٹی) اور 'التجربۃ الأولی' (پہلا تجربہ) قابل ذکر ہیں۔ پیش نظر افسانہ 'الیوم الأخیر' (اردو ترجمہ) احسان عبدالقدوس کے افسانوی مجموعے 'التجربۃ الأولی' سے ماخوذ ہے۔

مجھے سوئٹزرلینڈ جانے کا اتفاق ہوا۔

میرے والد بیمار تھے، ان کا علاج وہاں ہونا طے پایا تھا، اہل خانہ نے فیصلہ کیا کہ ان کی تیمارداری کے لیے میں ہی ان کے ساتھ جاؤں، میرے شوہر نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ممکن ہے اس لیے کہ کوئی ان سے مشورہ ہی نہیں کرتا تھا۔

میں اور میرے والد کا قیام سوئٹزرلینڈ کے ایک چھوٹے سے شہر میں ہوا جو 'لوگا نو جھیل' (Lake Lugano) کے ساحل پر واقع تھا۔ وہ نہایت خوب صورت اور پرسکون شہر تھا، گویا وہ جنت کا ٹکڑا تھا۔ سرسبز و شاداب جنگلات نے اسے اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔ پہاڑ اس کے اوپر سے جھانک رہا تھا اور جھیل اس کے قدموں میں تھی۔

یوروپ کا یہ میرا پہلا سفر تھا۔ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ یوروپ اتنا خوب صورت ہوگا۔ اس کی خوب صورتی نے میری رگوں میں زندگی دوڑا دی۔ میرا دل کھل گیا اور میرے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ بکھر گئی جو میرے چہرے کو نگلے جا رہی تھی۔ میرے ارد گرد تازہ ہوا تھی۔ سڑکیں 'آرکڈ' (Orchid) اور 'گلیڈیولس' (Gladiolus) کے پھولوں سے سجی ہوئی تھیں۔ میں خوشی سے اڑنے والی تھی۔ میرے والد کی حالت اتنی خراب نہیں تھی کہ میں ہر وقت ان کے پاس رہتی، اس لیے صبح سویرے ان کی ضروریات کو پورا کر کے میں شہر کی سیر کو نکل پڑتی۔ میرا جی کرتا تھا کہ شہر کو میں اپنی آنکھوں میں بسا لوں، اس کی ہر چیز کو رکھ لوں، اس کی سڑکوں اور دکانوں کی تمام چیزیں نگل جاؤں۔ یوروپ کی دکانوں میں رکھے سامان کے کیا کہنے! (اس کا تصور) عقل سے پرے ہے... ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا میں کسی جادوئی دنیا میں ہوں... مجھے یوں لگ رہا تھا گویا میں مصر کے غار "علی بابا" کی سیر کر رہی ہوں۔ میں خود کو بھول چکی تھی۔ اسی عالم کیف میں، میں اپنے پورے شہر کو چھان مارا۔ اب بے اختیار میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھرنے لگی۔ میں اکثر اپنے آس پاس اپنی پسندیدہ چیزوں کو تلاش کرتی۔ اسی کیفیت میں، میں ہمارے قیام والے ہوٹل کے قریبی کافی ہاؤس میں جاتی۔ حالانکہ کافی ہاؤس میں بیٹھنا ایک تعجب خیز امر تھا! کیوں کہ اس سے قبل کبھی بھی میں کافی ہاؤس میں نہیں بیٹھی، مگر اب کافی ہاؤس

کانپتے ہاتھوں سے دکانوں میں رکھی چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ پھر اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں تو ایک نادار لڑکی ہوں، مجھے اپنی ناداری کا اب تک کبھی اس طرح احساس نہیں ہوا تھا۔ درحقیقت اس وقت میں نادار ہوں، اس لیے کہ یوروپ کی تمام دکانوں کا سامان خریدنے کے لیے میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔

اس جنت نشان شہر میں میرے کافی دن گزر گئے۔

شہر کی ہر ایک شاہراہ کو میں نے پہچان لیا۔ ہر دکان اور اس کی ہر چیز سے واقف ہو گئی... بلکہ شہر کے کافی لوگوں سے جان پہچان بھی ہو گئی اور ان کی بولی بھاشا کے بہت سے الفاظ ادا کرنے لگی۔ جب بھی میں ان سے ملتی تو وہ خوش ہوتے اور میرا نام لے کر مجھے پکارتے۔

پھر میرا جی اُوب گیا... چند ہی دنوں میں، میں نے

میں بیٹھنا ایک عام سی بات ہو چکی تھی۔ اب میرے لیے نہ تو یہ کوئی باعث تعجب بات تھی اور نہ ہی کوئی انوکھی چیز۔

پھر (اچانک) احساس تنہائی مجھے ستانے لگا اور میرا من کرنے لگا کہ کاش میری سہیلیاں بھی میرے ساتھ ہوتیں تاکہ وہ سب میری اس جنت کو دیکھتیں جس میں اس وقت میں رہ رہی ہوں۔ لمحات یوں ہی گزرتے جا رہے تھے، مجھے اب فکر ستانے لگی کہ وطن واپسی کے بعد میں اپنی سہیلیوں سے کیسے ملوں گی۔ چنانچہ ان کو سنانے کے لیے یہاں کی بڑی بڑی کہانیاں محفوظ کرنے لگی۔ سہیلیوں کا خیال جھٹک کر اب مجھے کسی مرد کی سنگت کی تمنا ہونے لگی، کاش میرے ساتھ کوئی مرد ہوتا، جس کے ساتھ میں باغوں میں گھومتی، جھیل میں تیرتی، وہ میرے ساتھ کافی ہاؤس میں بیٹھتا اور ہم ایک ساتھ شاپنگ کرتے۔ میری آرزو ہرگز یہ نہ تھی کہ وہ مرد میرا شوہر ہوتا... نہیں ... ہرگز نہیں ...! بلکہ میری خواہش تھی کہ وہ کوئی ایسا مرد ہوتا جس سے میں محبت کرتی ...!!

کافی ہاؤس میں بیٹھ کر میں نوجوان لڑکے لڑکیوں کے اس جھنڈ کو ٹکٹکی لگا کر دیکھتی رہتی جو جھیل کے کنارے (بے فکری کیف و سرمستی میں) گھومتا رہتا تھا۔ ہر لڑکی کسی لڑکے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے رہتی اور میں بس مسکراتی رہ جاتی۔ (کبھی کبھی) اس قافلۂ عشق کو دیکھ کر اس طرح مسکراتی گویا میں اس کی جانب بڑھ رہی ہوں...

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں ہر اس نوجوان لڑکے کو دیکھنے لگی جو اپنی بانہوں میں کسی نوعمر لڑکی کو لے کر چلتا، میں بھی اپنے لیے ایسی ہی تمنا کرنے لگتی... یا میری تمنا ہوتی کہ کاش میں وہ خوش نصیب دوشیزہ ہوتی۔ اب میری یہ تمنا ایک مخصوص قسم کے غصے میں تبدیل ہونے لگی۔ مجھے غصہ آنے لگا۔ ہاں... غصہ... غصہ... ہر محبت کرنے والی لڑکی پر... ہر اس دوشیزہ پر جو کسی نوعمر لڑکے کے ساتھ گھومتی... میرے جی میں آتا کہ میں دوشیزہ پر حملہ کردوں اور اس کے بالوں سے ہی اسے پکڑ کر باندھ دوں اور نوجوان لڑکے کو اس سے چھین لوں۔ اب میں اکثر جھیل کے کنارے گھوم رہے بے فکر نوجوان جوڑوں کے منظر کے خوب صورت مطلب کو بگاڑنے لگی اور خود سے کہنے لگی: ''شاید لڑکا، لڑکی کو فریب دے رہا ہے... شاید لڑکی سے جھوٹ بول رہا ہے... اسے تو صرف اس کا جسم چاہیے ...'' مجھے احساس تھا کہ میں حسد کی آگ میں جل رہی تھی... میں سمجھتی تھی کہ اپنے سامنے کی خوب صورتی کے (خوب صورت) مفہوم کو میں بگاڑ رہی ہوں۔

مجھے پتہ تھا کہ مجھے کیا چاہیے...

میں اپنی من پسند چیز کے لیے (ہی تو) لڑ رہی تھی... میں دانستہ نہیں لڑ رہی تھی ... بلکہ (بے اختیار اور) غیرارادی طور پر کسی (غیبی) طاقت کے زیر اثر لڑنے پر مجبور تھی۔ وہ (غیبی) طاقت تھی اس طویل عمر کی جسے میں پہلے تو پیار سے خالی ایک دوشیزہ اور پھر شوہر کی محبت سے محروم ایک بیوی کی حیثیت سے گزار رہی تھی۔

جس ہوٹل میں ہمارا قیام تھا اس کے بغل والے کمرے میں ایک اطالوی شخص بھی قیام پذیر تھا، وہ ادھیڑ تھا، شاید چالیس کے لپیٹے میں ہوگا، اس کے سر کے بال کہیں کہیں سے سفید تھے... مگر ہٹا کٹا، خوب صورت اور خوش وضع... (تھا)، مجھے دیکھ کر دور سے ہی مسکراتا...

میں اس کی مسکراہٹ کو نظر انداز کرتی اور دل ہی دل میں کہتی: ''یہ صحیح نہیں ہے کہ میں دور سے آنے والی مسکراہٹ کا جواب دوں۔''

مگر وہ شخص اپنی اس حرکت سے باز نہ آیا بلکہ جب بھی ہمارا آمنا سامنا ہوتا، یا ہم ڈائننگ ہال میں جمع ہوتے وہ میری جانب دیکھ کر مسکرانے لگتا۔ اس کی آنکھوں میں (بلا کا) استقلال اور ثبات تھا، جیسے وہ اپنی من پسند چیز سے (اچھی طرح) باخبر ہے۔

(تاہم) اس کی مسکراہٹ سے تہذیب اور لطافت عیاں تھی۔ (کبھی کبھی) اس میں شرمیلا پن بھی جھلکتا۔ گویا وہ اس طرح مجھے (اپنی شرافت کا) یقین دلا رہا تھا۔

مگر میں اس کی آنکھوں اور مسکراہٹ کو (مسلسل) نظر انداز کرتی رہی....

ایک دن ہماری ملاقات لفٹ میں ہوگئی... اس (وقت لفٹ) میں بس ہم دو ہی تھے۔ اس نے ادب سے میرے سامنے سر جھکا لیا اور ایسی سریلی آواز میں بولا گویا گٹار کی آواز ہو:

''صبح بخیر''

میں نے (بھی) احتراماً سر خم کردیا اور خاموش رہی...

میں دور ایک کنارے میں کھڑی رہنا چاہتی تھی...

اس شخص نے فرانسیسی زبان میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے پوچھا:

''میڈم! کیا آپ اسپین سے ہیں...؟''

اس کی طرف سے اپنی آنکھیں پھیرتے ہوئے میں نے تیز لہجے میں جواب دیا:

''نہیں...!''

اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا:

''تو کیا فرانس سے...؟''

میں نے جواب دیا:

''نہیں...!''

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا تاکہ مجھے بولنے کا موقع دے... یا میں اسے بتاؤں کہ میں کہاں کی باشندہ ہوں... مگر میں خاموش رہی اور اس سے اپنی آنکھیں پھیر لی۔

اس نے پھر پوچھا:

''اب (آپ کے) والد محترم کی طبیعت کیسی ہے؟''

اس طرف دیکھے بغیر زور زور سے زمین پر پیر پٹختے ہوئے میں نے جواب دیا:

''الحمدللہ!''

لفٹ رک گئی۔ میں (تیزی سے) باہر نکل آئی۔ میرے پیچھے وہ شخص بھی باہر نکل آیا اور میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ پھر کپکپاتے ہونٹوں پر مسکان بکھیرتے ہوئے کہنے لگا:

''سچ تو یہ ہے کہ میں جانتا ہوں کہ آپ مصری خاتون ہیں، میں نے ہوٹل مینیجر سے دریافت کرلیا تھا... میں آپ سے تصدیق کرنا چاہتا تھا اور کچھ بات بھی کرنا چاہتا تھا۔ آپ کا کیا خیال ہے، شہر کے باہر منعقد ہونے والے گھوڑ دوڑ کے مقابلے کو دیکھنے کے لیے میرے پاس دو ٹکٹ ہیں۔ (یہ) میری خوش نصیبی ہوگی اگر آپ میری دعوت قبول کریں۔''

میں نے اس کی طرف منفی نظروں سے دیکھا اور جھٹ سے بولا:

''معاف کیجیے... شکریہ!''

میں جلدی سے بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور دروازے میں اندر سے تالا بھی لگالیا، اس خوف سے نہیں کہ وہ اندر آجائے گا بلکہ اس ڈر سے کہ کہیں میں (ہی) نکل کر اس کے پاس نہ چلی جاؤں...

میں نے لمبے چوڑے بیڈ پر خود کو ڈال لیا اور آزادی کی سانس لینے لگی۔

میں احمق ہوں...

میں نے اس کی دعوت کیوں ٹھکرائی؟

مجھے اس کی ضرورت ہے... وہ ایک شائستہ انسان لگتا ہے، بلکہ وہ اگر شائستہ نہ بھی ہو، تب بھی مجھے اس کی ضرورت ہے۔

لیکن اس کے بعد بھی (میں) مسلسل اس کو نظر انداز کرتی رہی اور اس کے سلام کے جواب میں بے التفاتی برتتی رہی...

ایک دن جب میں ہوٹل واپس آئی تو اس شخص کو میں نے اپنے والد کے پاس بیٹھا ہوا دیکھا... میں نے چاہا کہ اس کو نظر انداز کرتے ہوئے سیدھی اپنے کمرے میں چلی جاؤں... مگر میرے والد (صاحب) نے مجھے بلالیا اور اس سے ملاقات کرادی... وہ شخص مجھ سے (گرمجوشی سے) ہاتھ ملاتے ہوئے بولا:

''محترمہ! اگر آپ کو یاد ہو تو اس سے پہلے بھی ہم لوگ لفٹ میں مل چکے ہیں۔''

میں نے (بدستور) بے رخی سے کہا:

'محترمہ نہیں... بیگم...''

اس شخص نے جواب دیا:

''معاف کیجیے گا، مجھے پتہ نہیں تھا کہ آپ شادی شدہ ہیں!''

(پھر) میں اور وہ والد (صاحب) کے پاس بیٹھ گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے محسوس ہوا کہ اس کی باتیں مجھے اسیر کیے جا رہی ہیں... وہ کبھی اپنے دیس کی باتیں کرتا اور کبھی میرے وطن کی... کبھی فیشن کے بارے میں تو کبھی میوزک اور آرٹ کے متعلق باتیں کرتا... اس کی باتیں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں... (وہ) دل چسپ بھی (اتنی ہی) تھیں...

(اب) وہ شخص ہمارا دوست بن گیا... ہمیشہ ہمارے ساتھ بیٹھتا... ڈائننگ ہال میں اپنے ٹیبل سے اٹھ کر ہمارے پاس آ کر بیٹھ جاتا...

میری زندگی میں اب ایک نئی چیز رونما ہو چکی تھی۔

وہ شخص میرے وقت اور سوچ دونوں کو متاثر کرنے لگا۔

وہ صبح سویرے اپنے کام سے باہر چلا جاتا اور میں کافی ہاؤس میں جا بیٹھتی، نیز اس کی واپسی سے پہلے لوٹ کر اس کا انتظار کرتی رہتی۔

میرے ہونٹوں پر (پرانی) مسکراہٹ لوٹ آئی...

جھیل کے کنارے لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کو دیکھ کر اب میں غصہ نہ ہوتی... ''روبرٹ'' مجھے اپنے ساتھ جھیل کے کنارے سیر کے لیے بلا لیتا...

مگر میں (ہمیشہ کی طرح) انکار کر دیتی...

میں کیوں انکار کر دیتی تھی...؟

مجھے نہیں معلوم...

میں دیر رات تک اس کے متعلق سوچتی رہی... ایسا لگ رہا تھا کہ وہ پارک میں میری بانہوں میں بانہیں ڈال کر گھوم رہا ہے، مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ میرے ساتھ ہے اور ہم دونوں روپ وے (Ropeway) کے ذریعے پہاڑ پر چڑھ رہے ہیں۔ مجھے خیال آتا کہ ہم دونوں ایک ساتھ جھیل میں تیراکی کر رہے ہیں... اور اس سے بھی بڑھ کر مجھے یوں لگتا تھا کہ وہ مجھے بوسہ دے رہا ہے اور اپنے سینے سے لگا رہا ہے۔

ان سب (باتوں) کے باوجود میں اس کی پیش کش کو ٹھکرا دیتی ہوں...

میں تو یہاں آزاد ہوں... بالکل آزاد اور تنہا بھی... یہاں کوئی ایسی سوسائٹی نہیں ہے جو میرا محاسبہ کرے یا مجھے دیکھے اور میری پروا کرے... یہاں تو دوستوں اور سہیلیوں کا بھی کوئی ڈر نہیں ہے... میرے شوہر اور بچے سب مجھ سے دور ہیں۔ اڈونچر (Adventure) کی ساری سہولتیں یہاں موجود ہیں... اور روبرٹ (بھی) کسی اڈونچر سے کم نہیں... وہ سراپا پیار ہے... ہاں...! وہ پیار ہے...

اس کے باوجود میں اس کی پیش کش کو ٹھکراتی رہی...

ایک مرتبہ جب میں نے اس کی پیش کش کو ٹھکرایا تو اس نے مجھ سے کہا:

''میں چاہتا تھا کہ میں تمھارے شوہر سے ملوں اور تمھاری وجہ سے اسے مبارک باد دوں، کیوں کہ میں نہیں جانتا کہ دنیا میں کوئی ایسی بیوی ہے جو اپنے شوہر کو اس حد تک پیار کرتی ہو...''

میں اس کا مذاق اڑاتے ہوئے مسکرائی...

اسے معلوم نہیں کہ میں نے اس شوہر کو کیسے اختیار کیا؟

جب میں بارہ برس کی تھی اس وقت میرے گھر والوں نے زبردستی میری شادی کرا دی... میں اس عمر میں شادی کرنا نہیں چاہتی تھی ... میں تو اپنی پینٹنگ کی پڑھائی جاری رکھنا چاہتی تھی ... اور یوروپ جا کر اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی تھی ... مگر گھر والوں نے شادی پر اصرار کیا... اور وہ میرے اس اکلوتے خواب کو چکنا چور کرنے پر اتارو ہو گئے جس کو میں جیتی تھی... میری ایک نہ چلی... میں نے خودکشی کی بھی دھمکی دی... مگر ان لوگوں نے اس کی بھی پروا نہیں کی...

مجھے شادی کے لیے مجبور کیا گیا...

میرے دروازے پر تین تین منگیتروں کی لائن لگی تھی ... ایک نوجوان لڑکا جو ڈاکٹر تھا اور خوب رو اور کافی مال دار تھا... دوسرا انجینئر تھا اور جوانی، خوب صورتی اور مال و دولت میں پہلے والے سے کم نہ تھا... اور تیسرا شخص وزارت زراعت میں ملازم تھا، جو خوب رو نہیں تھا... بلکہ اس کی آنکھوں پر ایک موٹے فریم والا چشمہ لگا تھا اور ان دونوں سے خوب صورتی اور مال داری میں بھی کم تھا۔

پھر بھی میں نے اسی تیسرے شخص کو چنا...

میں نے ایسا کیوں کیا؟

میں نے اپنے گھر والوں کو اشتعال دلانے کے لیے ایسا کیا...

مجھے لگا کہ ایسا کر کے میں ان سے بدلہ لے رہی ہوں اور انھیں سزا دے رہی ہوں...

گھر والوں نے بڑی کوشش کی کہ میں اپنی رائے بدل دوں اور ڈاکٹر یا انجینئر سے شادی کروں... میں اپنے فیصلے پر اٹل رہی... اور میں نے سختی سے کہا کہ اگر آپ لوگ میری شادی کروانا چاہتے ہیں تو میں اسی شخص سے کروں گی...

آخر کار میرے گھر والوں نے اسی شخص سے میری شادی کرا دی...

میں گھر والوں کی پریشانی پر ایسے مسکرا رہی تھی جیسے کہ میں نے ان سے انتقام لیا ہو...

میری شادی کے پانچ برس بیت گئے ... مگر روز اول سے ہی مسلسل میں تکلیف میں رہی اور خاموشی کے ساتھ پریشانی سہتی رہی...

میرا سینہ جذبۂ انتقام سے بھر چکا تھا...

میرا بیٹا اور بیٹی جن سے اللہ تعالیٰ نے مجھے نوازا تھا، ان کے پیدا ہونے سے بھی میری تکلیف کم نہ ہوئی بلکہ وہ دونوں تو محض اس اذیت کی قیمت تھے...

ان سب کے باوجود 'روبرٹ' یہ سمجھتا تھا کہ میں اپنے شوہر کی وجہ سے اس سے محبت کرنے میں ہچکچاہٹ سے کام لے رہی ہوں۔

نہیں روبرٹ ... میں اپنے شوہر سے بالکل محبت نہیں کرتی ... میں تو صرف تم سے محبت کرتی ہوں... صرف تمھیں ہی چاہتی ہوں...

یہ مت پوچھ کہ میں تم سے بے رُخی کیوں اختیار کر رہی ہوں ... مجھے خود بھی معلوم نہیں... شاید اس لیے کہ میں تمھیں چاہتی ہوں... مگر ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ پیار کامیاب نہ ہو جائے اور عنقریب جدائی کے بعد وہ پیار میرے لیے کہیں پریشانی کا باعث نہ بن جائے... شاید میں پیار کے سلسلے میں ڈرپوک ہوں... ہاں میں بزدل ہوں... بزدل... بزدل...

میں تکلیف جھیل رہی ہوں...

اپنی مزاحمت کی وجہ سے میں تکلیف میں مبتلا ہوں... اپنے لیے مزاحمت ... روبرٹ کے لیے مزاحمت ... مزاحمت اس خوب صورتی کے لیے جو میرے گرد و پیش میں ہے... مزاحمت ہر اس چیز کے لیے جو پیار کے تبادلے پر مجھے آمادہ کر رہی ہے...

اب آخری دن آ پہنچا...

کل ہم اپنے وطن مصر لوٹ جائیں گے...

کافی ہاؤس میں بیٹھ کر میں وطن واپسی کے بارے میں سوچنے لگی...

اپنے بچوں، شوہر اور اہل خانہ کے بارے میں نہیں سوچ رہی تھی بلکہ اس ناکامی کے بارے میں سوچنے لگی جسے لے کر میں واپس لوٹ رہی تھی... میں خالی ہاتھ واپس جاؤں گی... خوب صورتی کا آخری مزہ چکھے بغیر میں واپس لوٹ جاؤں گی ... جیسے آئی تھی ویسے ہی عقل مند لوٹ

جاؤں گی...

ایک شدید بغاوت مجھے کاٹ کھانے لگی ہے...میں اپنی آزادی کا فائدہ اٹھانا چاہتی تھی...اپنی تنہائی کا فائدہ اٹھانا چاہتی تھی...میں خود سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی...میں کسی بھی حالت میں اڈونچر چاہتی تھی...بس مجھے ضرورت تھی جرأت و ہمت کی...ہمت...ہاں ہمت کی...

کافی ہاؤس میں میرے بغل کی ٹیبل پر بیٹھا ایک دوسرا شخص میری طرف دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا...وہ کافی دیر تک مجھے دیکھ کر مسکراتا رہا۔

اچانک...

غیر ارادی طور پر...

میں اس کی طرف متوجہ ہوئی اور اس کے لیے ایک بے معنی لمبی سی بناوٹی مسکراہٹ کا اظہار کیا...

وہ منھ میں سگریٹ دبائے میری جانب بڑھا...

اس نے اپنی جیب سے چاندی کے کچھ سکے نکالے اور میری کافی کی قیمت ادا کرنے کے لیے انھیں ٹیبل پر رکھ دیا...پھر اس نے بانہوں میں مجھے بھینچ لیا، سگریٹ اب بھی اس کے منھ میں تھی، اور بولا:

''میرے ساتھ چلو...''

میں نے اس کی طرف پس وپیش اور خوف کے عالم میں دیکھتے ہوئے پوچھا:

''کہاں؟''

اس نے جواب دیا:

''جلد ہی تمھیں معلوم ہوجائے گا۔''

وہ اپنی بانہوں کو میری بانہوں میں ڈال کر میری طرف دیکھے بغیر مجھے لے کر چل پڑا...پھر مجھے اپنی کار میں بٹھایا...میری سانسیں اٹک رہی تھیں...میرا سینہ پھٹا جا رہا تھا...میری آنکھیں چکاچوندھ تھیں...مجھے کچھ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا...بس اتنا معلوم ہو رہا تھا کہ میں کسی اڈونچر میں ہوں مگر یہ معلوم نہیں کہ وہ اڈونچر ہے کیا...؟

میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے کہا:

''میں جھیل کے کنارے پیدل چلنا چاہتی ہوں...''

اس نے جواب دیا:

''بعد میں...''

میں نے پوچھا:

''کیا ہم پارک جائیں گے؟''

وہ بولا:

''ابھی نہیں...''

سگریٹ اب بھی اس کے منھ میں تھی...

شہر کے اطراف میں لکڑی سے بنے ایک چھوٹے سے گھر کے سامنے اس نے کار روک دی اور باہر نکل کر آرڈر کے لہجے میں بولا:

''(باہر) آؤ...!''

مجھے کچھ تردد ہوا اور کار سے باہر نہیں نکلی...کار کے ارد گرد گھومتے ہوئے اس نے میرے لیے کار کا دروازہ کھولا اور میری کلائی پکڑ کر باہر کھینچ لیا...وہ خوف ناک طریقے سے مسکرا رہا تھا اور اس کی مسکراہٹ کے بیچوں بیچ سگریٹ جھانک رہی تھی...

وہ مجھے اس چھوٹے سے لکڑی کے گھر میں لے گیا ...میں کھڑی اُسے دیکھتی رہی اور وہ دو گلاسوں میں شراب انڈیل رہا تھا...گویا میں ایک بچی ہوں اور کسی مداری کو دیکھ رہی ہوں جو اپنا کرتب دکھانے کی تیاری کر رہا ہو...

میں نے اس کے ہاتھ سے ایک گلاس لے لیا اور شراب پینے لگی...

مجھے اس جام کی ضرورت تھی...

مجھے دوسرے پیگ کی بھی ضرورت تھی...

وہ میرے قریب آیا اور کافی زور سے اپنے سینے سے مجھے لگایا اور بوسہ بھی دیا...اس کا بوسہ بہت شدید تھا اور اس میں عجیب سی خوش بو تھی، میری عقل ہوش میں رہنے کی کوشش کر رہی تھی تاکہ اس شخص کی سرگرمیوں پر نظر رکھوں اور اس مداری کے کرتب کو دیکھوں۔شاید کہ اس کا راز فاش ہوجائے...مگر مجھے چکر آنے لگا...

میرے ارد گرد کی تمام چیزیں (جیسے) گھومنے لگیں...

شراب کا نشہ مجھ پر چڑھ چکا تھا...

وہ شخص میرے تن سے کپڑے اتارنے لگا ...شاید میں ہوش میں آچکی تھی۔

نہیں...نہیں...ہاں...میں ہوش میں تھی...نہیں ...نہیں...

زور زور سے قہقہے لگاتے ہوئے وہ شخص میرے تن سے کپڑے اتارنے لگا۔

مجھ میں اسے روکنے کی قوت نہیں تھی...

میں (اسے) نہیں روک سکی...

ہر چیز گھوم رہی تھی...

میں رونا چاہتی تھی...

پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا...

میں لڑکھڑاتے ہوئے اٹھی اور اپنے کپڑے ڈھونڈنے لگی ...مجھے (اپنی حالت سے) گھن آنے لگی...بے بسی میرے پورے وجود میں سرایت کر چکی تھی...

میں رونا چاہتی تھی...

وہ میرے پاس آیا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا، ہونٹوں میں سگریٹ دبائے ہوئے بولا:

''کتنا چاہیے؟''

میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا...

وہ دوبارہ چیخ کر بولا:

''کتنا چاہیے؟''

پھر قہقہہ لگا کر مجھے دیکھنے لگا، میں خاموش تھی اور میری آنکھوں میں گھبراہٹ تھی۔وہ میرے ارد گرد گھوما اور میرے پرس میں کچھ رقم رکھ دی...

میں چیخ پڑی...

میں پاگلوں کی طرح چیخ پڑی...

گھر سے نکل کر تیز دوڑی اور بھاگتی رہی...معلوم نہیں کتنا دوڑی...پھر میں نے خود کو ایک ٹیکسی میں پایا...

میں رو رہی تھی...

میں ہوٹل واپس آئی ...ابھی سیڑھیاں چڑھنے ہی والی تھی کہ روبرٹ مل گیا...اس نے میری طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا:

''تم کہاں تھی؟''

تھوڑی دیر تک میں کھڑی اسے دیکھتی رہی ...پھر اچانک چیخ پڑی:

''تم ...تم ...تم مجھ سے دور ہوجاؤ...تم مجھ سے دور ہوجاؤ...''

پھر میں بھاگ کر اپنے کمرے میں گئی، وہ کافی حیرانی سے میری حرکتیں دیکھتا رہا...ہوٹل میں مقیم دوسرے لوگ بھی مجھے دیکھ رہے تھے...ہوٹل کا ملازم بھی مجھے دیکھ رہا تھا...میں نے اپنے روم کے دروازے میں اندر سے تالا لگا لیا...

میں نے کمرہ اس وقت کھولا جب میرے والد (صاحب) فلائٹ کے وقت کے قریب آنے کی اطلاع دینے آئے...

میں اپنے یوروپ کے سفر کے بارے میں اپنی سہیلیوں سے زیادہ ذکر نہیں کرتی ہوں...اور نہ ہی اس کے بارے میں اپنے شوہر اور بچوں کو کچھ بتاتی ہوں...

میں اسے بھلانے کی کوشش کر رہی ہوں...

میں یوروپ کے سفر کو بالکل بھول جانا چاہتی ہوں...

■

Dr. Md Qutbuddin
Associate Professor of Arabic
Centre of Arabic and African Studies
School of Language, Literature and Culture Studies (New Building)
Jawaharlal Nehru University
New Delhi - 110067
Mob.:9999912655

خورشید عالم
مترجم: ارملا شریش

میزان

''دیدی کی طبیعت کیسی ہے؟''

''کون سی دیدی؟''

''دو چار دیدیاں ہیں کیا؟''

''میری تو دو دیدی ہیں نا۔''

''بڑی دیدی، روشنی دیدی۔''

''کیوں انھیں کیا ہوا؟ ٹھیک ہی ہوں گی۔''

''تم تو اتنی بے پروائی سے جواب دے رہے ہو، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔''

''مجھے تو کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔''

''کیا ان سے تمھاری بات چیت نہیں ہوتی؟''

''یہی سمجھ لو۔ ایک سال پہلے کسی بات پر کچھ کہا سنی ہوگئی تھی۔ وہ ناراض ہوگئیں اور میں نے بھی انھیں فون کرنا بند کر دیا تھا۔''

''شاباش، کیسے بھائی ہو؟'' ادھر سے بے رخی، طنز اور لعنت ملامت کرتی آواز جوتے کی طرح لگی۔

''میں تصور نہیں کر سکتا کہ تم دونوں بھائی بہن کے درمیان ایسی دشمنی ہو سکتی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، دیدی تو ممی سے بھی زیادہ تمھارے لیے کیا کرتی تھیں۔ تمھاری ساری ذمے داری وہی تو اٹھاتی تھیں، تمھارا کتنا آنا جانا تھا، بات کتنی بھی بڑی ہو رشتے تو نہیں ختم ہو جاتے۔ مجھے تمھاری باتیں سن کر بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔'' نربھے نے دکھی آواز میں کہا۔

''کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے خیالات اور مزاج نہیں ملتے ہیں۔ ہر روز کے بحث مباحثے سے تو بہتر یہی ہوتا ہے کہ مکالمہ ہی بند کر دیا جائے۔ آپ کو تو معلوم ہے میں سچ بول دیتا ہوں اور سچ ہمیشہ تلخ ہوتا ہے، کوئی برداشت نہیں کر پاتا ہے۔''

''تو واقعی تمھیں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ تمھیں کسی نے بتایا بھی نہیں؟''

''نہیں کسی نے کچھ بھی نہیں بتایا۔ اب آپ ہی بتا دیجیے دیدی کو ہوا کیا ہے؟''

''کینسر، دیدی کو کینسر ہے۔ ایک دن ہسپتال میں میں اپنے کسی دوست کو دیکھنے گیا تھا۔ وہ فائل لے کر اپنے نمبر کا انتظار کر رہی تھیں، تب انھوں نے بتایا تھا، بہت بری حالت تھی تب ان کی۔''

''یہ کب کی بات ہے؟''

''قریب چار پانچ ماہ پہلے کی بات ہے۔''

''چار پانچ ماہ، اور آپ نے مجھے بتایا بھی نہیں۔''

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تمھیں معلوم نہیں ہوگا۔''

''مجھے کون بتاتا؟''

''بچے۔''

''بچے سوچ سکتے ہیں کہ تمھیں معلوم نہ ہوگا۔''

''آپریشن ہو چکا تھا۔ آپریشن کے بعد چیک اپ کے لیے آئی تھیں۔ کیمو تو پہلے ہی ہوگئی تھی۔''

اسے ایسا محسوس ہوا کہ موبائل اس کے ہاتھ سے گر جائے گا۔ اس نے پاس پڑی کرسی کو کھینچا اور دھپ سے بیٹھ گیا۔ دماغ کی نسوں کو دبایا، پھر آنکھوں کو پونچھا۔

''آشی، آشی، آشی۔''

وہ اونچی آواز میں چیخا۔ بیوی دوڑتی ہوئی آئی، ''کیا ہوا، کیوں چیخ رہے ہو؟ سب ٹھیک تو ہے؟''

''کیا تمھیں معلوم ہے؟''

''کیا... کیا؟''

''دیدی کو کینسر ہو گیا ہے۔''

''اوہ...''

''اور ہم لوگوں کو پتہ تک نہیں چلا۔''

آشی کچھ دیر تک حیران کھڑی رہی۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ اس نے اپنے شوہر کو پہلی بار اس طرح تڑپتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اکثر بھی کو چیختے ڈانٹتے رہتے، یا سب کی شکایتیں کرتے نظر آتے تھے۔ ان کے مزاج میں جو خشکی اور ترشی تھی، اس سے بھی اپنی تذلیل محسوس کرتے تھے۔

''کئی بار دیدی پیڑ کے نیچے کھڑی نظر آتی تھیں۔''

''تم نے کبھی بتایا نہیں۔''

''کیسے بتاتی، تم تو ان کا نام سنتے ہی آگ ببولا ہو جاتے تھے۔''

''تو کیا وہ پیدل جاتی تھیں؟''

''میں تو کالج جاتے وقت اکثر انھیں پیڑ کے نیچے کھڑی دیکھتی تھی۔ شاید بس یا کیب کا انتظار کرتی ہوں گی۔ کبھی گاڑی روک کر بات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔''

''ستیش نے بھی نہیں بتایا۔''

''وہ تو ہم سب کے حکم کی تعمیل کرتا ہے اور شاید وہ دیدی کو جانتا بھی نہیں ہے۔ ہاں... فرماں بردار ڈرائیور، جس نے کبھی یہ نہیں بتایا کہ اس کی بڑی بہن یعنی دیدی دھوپ میں، بارش میں، ٹھنڈ میں سڑک پر کھڑی نظر آتی

تھیں۔بس سے آتی جاتی تھیں۔''

''تو کیا ان کے پاس گاڑی نہیں تھی؟''

''گاڑی تو تھی ان کے پاس۔''

''ڈرائیور نہیں آرہا ہوگا۔''

''تو کیا گاڑی اور ڈرائیور دونوں ہی نہیں تھے،لیکن کیوں؟''

''پیسوں کی کمی ہوگی۔علاج میں خرچ ہو گیا ہوگا۔ ان کے پاس پیسہ تھا ہی کتنا۔شوہر بیوی دونوں سرکاری نوکری میں۔دونوں کی تنخواہ میں دونوں بیٹیوں کو پڑھایا، شادی کی، مکان خریدا۔سبھی خانگی ذمے داریاں نبھاتی رہیں۔کوئی ایسا رشتے دار نہیں تھا،جن کے لیے انھوں نے کچھ نہ کیا ہو۔''

لینا دینا،اس کا ماتھا ٹھنکا۔جس کے لیے انھوں نے دشمنی مول لی تھی،جس کے لیے انھوں نے اسے دھوکا دیا تھا۔کیا ان لوگوں نے کوئی مدد نہیں کی ہوگی؟انھیں تو معلوم ہوگا۔اگر انھیں معلوم ہوگا تو پھر پیسوں کی پریشانی تو نہیں ہونی چاہیے۔ان لوگوں سے بھی اس کی بات چیت نہیں ہوتی ہے۔

''پھر کیسے پتہ کریں،کس سے،کس بہانے؟''

بے چینی میں گھومتا پھرتا،اُٹھتا بیٹھتا وہ پسینے پسینے ہوا جا رہا تھا۔

کاش،ماں زندہ ہوتیں تو سب کچھ پتہ چل جاتا۔ ماں سے ہی سارے بھائی بہن ملنے آتے تھے۔ماں ہی سب کی باتیں بتاتی تھیں کہ کسی کو برا بھی نہ لگے اور سبھی کو ایک دوسرے کی اطلاعات بھی مل جائیں۔آج اسے ماں شدت سے یاد آرہی تھیں۔

''اچھا ایک کام کرو... تم دیدی کی بڑی بیٹی راگنی کو فون کرو۔''

''میرا فون کرنا مناسب ہوگا؟''

''ہاں...ہاں،اس سے پتہ تو کرو۔''

آشی پرانی ڈائری میں راگنی کا نمبر ڈھونڈھنے لگی۔ شاید تین سال ہو گئے اس خاندان سے بات چیت کیے ہوئے۔ بات تو بھائیوں کے درمیان کی تھی،بھلے ہی چچازاد ہی کیوں نہ ہو۔

مسئلے کی بنیاد ایک مکان تھا۔مکان سے پہلے سب ایک ساتھ رہتے تھے،بعد میں دونوں کے درمیان بیوی بچوں کو لے کر اختلافات ہونے لگے تھے۔باتیں اکثر خانگی ہوتی تھیں۔کھانے پینے کی گھٹیا باتیں۔رہن سہن کو لے کر پسند ناپسند کی باتیں،تنازعہ رفتہ رفتہ بڑھتا گیا تھا۔ اسے امید تھی کہ دیدی اس جھگڑے میں اس کا ساتھ دیں گی۔مکان... ہاں،اس مکان کے بٹوارے میں اس نے بڑے بھائی کا ساتھ دیا تھا۔ان کے حصے میں بڑا برامدہ، گیراج، پیچھے کی دوکانیں اور باغیچہ آیا تھا اور اس کے حصے میں یہ چھوٹا سا حصہ، جس میں نہ ڈرائنگ روم تھا، نہ گیراج، نہ دوکانیں... نہ برامدے۔ایک ایک چیز الگ ہوتی گئی تھی... نل کا کنکشن،بجلی کا میٹر۔بس،ایک چیز بچی تھی، وہ تھا مکان کا شاندار ڈرائنگ روم۔اسے لگتا تھا کم سے کم یہ ڈرائنگ روم تو اس کے حصے میں آنا ہی چاہیے۔ بھائی بار بار یقین دہانی کراتے کہ وہ پارٹیشن کروا دیں گے،لیکن وہ دن کبھی آیا ہی نہیں۔ایک دوسرے کی شکایتیں پولس تک پہنچ گئی تھیں۔تب اس نے کتنی باتیں سنائی تھیں۔

''اتنا بڑا دھوکا؟''وہ ان کے شوہر پر چلا رہا تھا۔

''کس بات کا دھوکا؟''

''آپ تو نامرد ہیں،کبھی کوئی فیصلہ نہیں لے سکے۔''

''اوئے سن،زبان سنبھال کر بات کر۔بغیر کسی بات کے مجھے گھسیٹا تو زبان کھینچ لوں گا۔''ادھر سے وہ چیخ رہے تھے۔

''عجیب تماشہ ہے،مکان،پراپرٹی کے پیچھے پاگل ہو گئے ہیں۔ان کے لیے رشتوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔''

''آج سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔'' وہ دھمکی دے رہا تھا۔

''مت رکھو۔''وہ بھی زور سے چیخے تھے۔

''بے ایمان... پورا خاندان ہی بے ایمان ہے۔ ایک بار بھی نہیں سوچا کہ میرے خلاف ہو کر چین سے نہیں جی سکیں گے۔ان سب کے لیے اپنی ساری زندگی ختم کر دی،لیکن جب ان کے سپورٹ کا وقت آیا تو بدل گئے''وہ بڑبڑا رہا تھا۔

وہ ماں کے پاس جاتیں تو اس بات کا خیال رکھتیں کہ اس سے سامنا نہ ہو۔نہ ماں اس کے بارے میں بات کرتی تھیں،نہ وہ پوچھتی تھیں۔کبھی کسی نے ان کی بات سنی ہی نہیں۔وہ کیسے بتاتیں کہ وہ بڑے بھائی کے ساتھ کیوں کھڑی ہوئی تھیں۔ یہاں عدم مساوات کا کوئی اصول نہیں تھا، بلکہ یہاں ایک ضروری اور انسانی اولیت تھی۔بڑے بھائی کبھی کچھ نہیں مانگتے تھے۔خودداری سامنے آجاتی اور نوکری میں بھی ایمانداری کی مثال۔اپنے اصول اور قدروں نے انھیں محرومیوں کے درمیان رہنا اور جینا سکھا دیا تھا۔چار بچے ان کی تعلیم اور کریئر،تین لڑکیوں کی شادی۔وہ انھیں چوبیس گھنٹے کولھو کے بیل کی طرح کام کرتے نہیں دیکھ سکتی تھیں۔وہ ان کے انھیں اوصاف کی مداح تھیں۔ان کی عزت کرتی تھیں۔انھیں ترازو کا وہ پلڑا دکھائی دیتا تھا،جو ایک طرف دھن دولت سے بھرا تھا اور دوسرا اوپر خلا میں لٹکا ہوا تھا۔انھیں دونوں پلڑوں کو برابر کرنا تھا۔ہاں،ماں کی موت پر سب جمع ہوئے تھے، لیکن کسی نے کسی سے بات نہیں کی تھی،بلکہ اس نے دیدی کی طرف دیکھا تک نہیں تھا،جبکہ وہ بار بار اس کا اداس آنسوؤں سے بھرا چہرہ دیکھتی رہی تھیں۔

عجیب کھیل تھا۔جائداد کی تقسیم میں بس اس نے اتنا سا تو گناہ کیا تھا ہر طرح سے کمزور بھائی کو اس نے تھوڑا سا مضبوط بنا دیا تھا،مکان کا بڑا حصہ دلا کر۔

''اس عجیب کھیل میں ان کے لیے بھائی کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے تھے۔''بڑی سماج سدھارک بنی پھرتی ہیں،اپنا پیسہ دان دے دیں تب تو کسی کو پتہ چلے گا۔

دوسروں کی کمائی کی چیز کو بانٹ دو اور مہان بن جاؤ۔دیکھنا ایک دن ناک رگڑتی ہوئی آئیں گی۔''

وہ سنتی رہتیں۔

''اور کتنی زمین چاہیے،صبر کرنا سیکھو۔جو دیا ہے وہی کافی نہیں ہے کیا؟ سگے نہیں تو کیا ہوا،اس آدمی نے، ان کے باپ نے اس خاندان کے لیے،اس خاندان کے بچوں کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی تھی۔ ایک ایک دن اور رات کا حساب لگاؤ گے تو سات جنم بھی کم پڑیں گے۔ہم اپنا حصہ نہیں لے سکتے۔انھوں نے کوئی تفریق نہیں کی تھی،پھر تم کیسے کر سکتے ہو۔تم بھی چھوڑ دو۔ دوسرا بنگلہ ہے وہاں چلے جاؤ۔تاؤجی نے تمھاری پرورش کی ہے،بڑا کیا ہے۔''ان کی دلیلوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔اس کی ڈائری حساب کتاب سے بھری ہوتی۔ اس کا پیسہ ڈائری کے اوراق سے نکل کر اس کے ذہن میں درج ہو گیا تھا۔اخلاقیات کی چمک نے اسے چوندھیا دیا تھا۔اس نے ایسے لوگوں کی سیکڑوں مثالیں دی تھیں، جنھوں نے بڑے بڑے مکان اور بنگلے بنائے تھے،لیکن آج وہ خالی پڑے تھے۔''سنبھال سکو گے کیا؟''

روٹھی دیدی کے کچھ عکس اس کی آنکھوں کے سامنے کوند گئے۔بچپن میں سائیکل سکھاتی دیدی،اسکول بھیجتی دیدی،صبح سے شام تک محنت کرتی دیدی۔کالج سے واپس آکر سب کے لیے کھانا بناتی دیدی،شادی کے وقت رخصت ہوتی دیدی اور شادی کے بعد بھی بھاگی بھاگی آتی دیدی۔بیماری شادی،بیاہ،چھوٹی بڑی ہر تقریب میں ہاتھ بٹاتی دیدی۔جو وقت بچتا اس میں بھی وہ اس کا اور اس کے آفس کا کام سنبھالتی۔رجسٹر پر کبھی کی حاضری درج کرنا،پیسوں کا حساب کتاب رکھنا۔

غلطی،بس ان سے اتنی ہوگئی کہ جس مکان میں

دیدی کا حصہ تھا، وہ شادی کے بعد انھوں نے بڑے بھائی کے نام لکھ دیا تھا، کیونکہ انھیں لگتا تھا، تاؤجی کے تعاون کا اندازہ پتا جی کو بخوبی نہیں تھا۔ باپ نے اپنے بیٹے کے نام سب کچھ لکھ دیا تھا، لیکن جو تاؤجی تاعمران سب کی ذمے داری اٹھاتے رہے، ان کے بیٹے کے نام کچھ نہیں کیا تھا۔ انہوں نے دونوں بھائیوں میں کبھی کوئی فرق نہیں سمجھا تھا، بلکہ ان کو (تاؤجی کے بیٹے) وہ زیادہ ہی مانتی تھیں۔

''پیسہ تو ہم نے لگایا تھا، وہ بھی لاکھوں روپیہ۔''

''واپس لے لینا اور کیا؟''

''ہم نے کیا کیا نہیں کیا تم سب کے لیے، لیکن بدلے میں تم نے ہمارے ساتھ کیا کیا۔''

ہاتھ سے بازی نکل چکی تھی۔ رونی کے حساب سے انھوں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا کام کیا تھا جبکہ اس کے حساب سے انھوں نے دھوکا دیا تھا۔ اس کے لاکھوں روپئے کا نقصان کیا تھا۔

بس یہی ایک وجہ تھی جس نے ان دونوں کے درمیان نفرت، غصہ اور درد کی خاردار راہ بنا دی تھی۔ جانتی ہیں، مکان کو لے کر اس کے بہت سے خواب تھے۔ مگر وہ جانتی تھیں غیر منقولہ جائیداد رشتوں سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی۔ گھر میں چار چار گاڑیاں، جن کی قیمت ایک کروڑ سے ساٹھ لاکھ تھی۔ فارم ہاؤس، ویرہاؤس، مارکیٹ میں لگا پیسہ، بچوں کے نام فکسڈ ڈپازٹ، کلو دو کلو سونا، ہیرے جواہرات۔

''تم تو ان سب کے پیچھے اس قدر بھاگ رہے ہو، ایک دن تمھیں ان ساری چیزوں سے بیراگ ہو جائے گا۔ یہ ساری چیزیں تمھیں بے معنی لگنے لگیں گی۔'' وہ سمجھاتی تھیں۔

تب بھی وہ حقارت سے کہتا تھا، ''بغیر پیسے کے تو نمک روٹی تک نہیں آتی۔ یہ ادھیاتمیک خیالات، مساوات اور سپردگی کی باتیں، کارخیر اور نیکی کی باتیں اور اصول سب دھرے رہ جائیں گے۔ جب خود کا پیسہ جائے گا، تب پتہ چلے گا۔ کھوکھلی باتیں ہیں۔''

''ٹھیک ہے... یہی سمجھ لو۔'' ان کا ایک ہی جواب ہوتا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' آشی نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ ایک بار بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا؟ کون ساتھ میں رہا ہوگا؟ کس نے کیا کیا ہوگا۔ لڑکیاں بھی اپنی ضد میں رہتی ہیں، ماں کی لڑائی کو اپنی لڑائی بنا لیا۔''

''دیدی کے اپنے پرسنل ریلیشنز بہت رہے ہیں۔''

''پھر بھی۔''

''کیا لڑکیاں نہیں آئی ہوں گی۔''

''آنی تو چاہیے۔''

''گھر ہو کر آتے ہیں۔''

''بات کر لو۔''

''نہیں، مل کر آتے ہیں۔''

تجوری میں سے پچاس ہزار روپئے نکالے۔ راستے سے پھل اور میوے خریدے۔ نہ جانے کیوں ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ جی گھبرا رہا تھا... بات کیسے کریں گے؟ حال چال کون پوچھے گا؟ انھوں نے بات نہ کی تو، دروازہ نہ کھولا تو۔

''بہت برا ہوا۔'' آشی نے کہا۔

''بتانا تو تھا...'' رہ رہ کر ایک ہی بات زبان پر آ رہی تھی۔

''ہاں...''

سڑک پر بھیڑ تھی۔ اے سی گاڑی میں بھی عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ کالونی میں دائیں بائیں مڑ کر جانا پڑ رہا تھا۔ تین سال سے نہیں آیا تھا، اس لیے سب کچھ بدلا بدلا سا نظر آ رہا تھا۔ جو پلاٹ خالی پڑے تھے، ان پر اب مکان بن چکے تھے۔ ہر مکان کے سامنے ایک دو پیڑ لگے تھے، جس سے کالونی سرسبز و شاداب نظر آ رہی تھی۔ گاڑی دروازے کے باہر رکی۔ پڑوسن نے کھڑکی کھول کر دیکھا۔ بغل کا مکان رونی کا تھا۔ گیٹ پر تالا لگا تھا۔

گملوں میں پھول کھلے تھے، مٹی گیلی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ یہیں کہیں گئی ہوں گی۔ پڑوسن باہر نکل کر آئی۔

''آپ کون؟''

''میں ان کا چھوٹا بھائی ہوں۔''

''نمستے۔''

''دیدی کہاں گئی ہیں، کچھ آئیڈیا ہے آپ کو۔''

''آپ کو نہیں معلوم؟ وہ تو بڑی بیٹی کے پاس چلی گئی ہیں۔''

''کب؟''

''دس دن ہو گئے۔''

''ارے...''

''آیئے، اندر آیئے۔''

''طبیعت تو ٹھیک تھی؟''

''ہاں... آپریشن ہو گیا تھا۔ بڑی بیٹی آ گئی تھی۔ کیمو کے وقت چھوٹی بیٹی پاس میں تھی۔ ڈاکٹر نے جانے کی اجازت دی، تبھی گئیں۔ بڑی سمجھدار اور بہادر عورت ہیں، سب کچھ اکیلی کر لیتی تھیں۔ حالانکہ بیچ بیچ میں بیٹیوں کی دوست آ جاتی تھیں۔ ان لڑکیوں نے بھی بہت سیوا کی۔''

ایسا لگا اندر کچھ بہہ رہا ہے، گاڑھا، چپچپا سا، تیکھا اور کھولتا ہوا احساس۔

''کب واپس آئیں گی، کچھ بتایا؟''

''نہیں، لڑکیاں کافی پریشان تھیں۔ اب شاید وہیں رہیں۔ ہاں... میرے پاس مکان کی چابی چھوڑ گئی ہیں۔ مالی بھی آتا جاتا رہتا ہے۔''

''آپ کے پاس موبائل نمبر تو ہوگا؟ دراصل میرے موبائل سے سارے نمبر ڈیلیٹ ہو گئے ہیں۔'' اپنی آواز کو فطری بناتے ہوئے اس نے کہا۔

''ہمیں تو ان کی بڑی فکر رہتی تھی، لیکن ایشور نے سب کچھ ٹھیک کر دیا۔ بس وہ ٹھیک رہیں، ہم یہی پرارتھنا کرتے ہیں۔'' ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''چلتے ہیں۔ آپ سے مل کر اچھا لگا۔ آپ لوگ یہاں کب آئے؟''

''پچھلے سال۔''

''آپ نکیتا کو جانتے ہیں؟'' پڑوسن نے اس سے پوچھا۔

''ہاں، بہت اچھی طرح۔''

''کیسے؟''

''وہ میری بُوا کی لڑکی ہے۔ کزن۔''

''ہاں... وہ بھی ایسا ہی کچھ بتاتی تھیں۔''

''مجھے اچھی طرح تو نہیں معلوم، لیکن انھوں نے بتایا تھا کہ یہ مکان اپنی وصیت میں انھوں نے نکیتا کے نام کر دیا ہے۔ ایک کاپی انھوں نے پوسٹ کر دی تھی اور ایک میرے پاس رکھ دی تھی کہ کہیں کچھ گڑبڑ ہو جائے تو میں انھیں پہنچا دوں۔''

دونوں حیران ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔ باہر نکلتے ہوئے اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ گاڑی کا گیٹ کھول کر سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''ارے... اب کیوں رو رہے ہو، دیدی ٹھیک ہیں نہ۔ ان سے بات کر لینا۔''

''اب بات کرنے کو بچا ہی کیا ہے۔''

اس کے آنسو نہیں رک رہے تھے۔ ایسا لگا، آج وہ دنیا کا سب سے مفلس انسان ہے اور دیدی سب سے امیر اور متمول۔

■

Khursheed Alam
F 23/6C, 2nd Floor
Shatabdi Enclave, Barola
Sector 49, Noida 201301 (UP)
Mob.+91 98208 11320

خصوصی گفتگو

خان محمد رضوان

اردو میں انگریزی کی آمیزش سے گھبرانے کی ضرورت نہیں

محترم شہباز حسین کی شناخت ایک ادیب اور مدیر کی حیثیت سے مستحکم ہے۔ انھوں نے روزنامہ 'ساتھی' اور 'سنگم' میں شریک مدیر کی حیثیت سے کام کیا ہے۔ ماہنامہ 'آجکل' کی ادارت سے بھی ان کی وابستگی رہی ہے۔ اپنے دور ادارت میں انھوں نے ماہنامہ 'آجکل' کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ قابل تحسین ہیں۔ اس رسالے سے بہ حیثیت اسسٹنٹ ایڈیٹر ان کی وابستگی ہوئی تھی پھر وہ 'آجکل' کے ایڈیٹر کے منصب پر فائز ہوئے۔ انھوں نے اپنے زمانۂ ادارت میں ماہنامہ 'آجکل' کے بہت سے خصوصی شمارے بھی شائع کیے جن میں موسیقی نمبر، فن تعمیر نمبر، رقص نمبر، جنگلی جانور نمبر اور فلم نمبر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جب ترقی اردو بورڈ کا قیام عمل میں آیا تو آپ اس سے وابستہ ہوگئے۔ اس کے علاوہ مختلف اداروں سے ان کی وابستگی رہی ہے۔ آپ نے 'جدید ہندی کتابوں میں ذات پات' اور 'ہندوستان کے چند عام پرنمے' کے عنوان سے ترجمے بھی کیے ہیں۔ ڈاکٹر خان محمد رضوان نے اردو زبان کی معاصر صورت حال اور مسائل کے تعلق سے ان سے گفتگو کی ہے۔ کچھ اقتباسات قارئین کی نذرہیں۔

خان محمد رضوان: محترم آپ اپنے بارے میں کچھ بتایئے۔

شہباز حسین: میرا نام شہباز حسین ہے اور میری پیدائش 1931 میں پٹنہ ضلع کے ایک گاؤں جمسوت میں ہوئی، میری ابتدائی تعلیم دانا پور میں ہوئی، کالج کی تعلیم پٹنہ یونیورسٹی سے ہوئی، میں نے 1951 میں ایم اے پاس کیا، پھر غلام سرور صاحب کے ساتھ سنگم اخبار سے وابستہ ہوگیا، 1955 میں دانا پور کے بی ایس کالج میں لکچرر مقرر ہوگیا، اور 1958 تک وہاں رہا اس کے بعد اسسٹنٹ ایڈیٹر ہوکر 'آجکل اردو' میں آ گیا۔

خ م ر: آخر یہ بات فہم سے بالاتر ہے کہ اردو کے قارئین روز بروز کیوں کم ہوتے جارہے ہیں؟

شہباز حسین: دیکھیے خان صاحب بنیادی بات تو یہ ہے کہ جب ترقی اردو بورڈ قائم ہوا تھا تو اس کے پیچھے جو مقصد تھا وہ یہ تھا کہ 1976 میں حکومت ہند نے یہ قانون پاس کیا تھا کہ بی اے تک کی تعلیم علاقائی زبان میں دی جائے گی جیسے تامل، تیلگو، کشمیری اور اس میں اردو بھی شامل تھی جب کہ ہر زبان کا اپنا ایک اسٹیٹ تھا اور اردو کشمیر کی سرکاری زبان تھی مگر کشمیر نے اپنی ذمے داری سے فرار اختیار کرتے ہوئے اسے ترک کردیا، اس وقت کے وزیر تعلیم وی کے آر جے راؤ تھے، انھوں نے مجیب صاحب کو بلایا اور کہا کہ آپ یہ مکمل اسکیم جامعہ لے جا کر نافذ کیجیے مگر انھوں نے بھی دامن جھاڑ لیا، پھر طے ہوا کہ سنٹرل ہندی ڈائریکٹوریٹ میں باضابطہ طور پر ترقی اردو بورڈ کو شعبے کے طور پر قائم کیا جائے اور کردیا گیا، مگر جب وہاں پوسٹ اڈورٹائز ہوئی تب میں نے 1972 میں جوائن کیا، اس وقت بھی ترقی اردو بورڈ سینٹرل ہندی ڈائریکٹوریٹ آر کے پورم میں ایک شعبے کے طور پر کام کر رہا تھا، اور انہی کے اسٹاف دفتری کام کاج بھی کرتے تھے، اس کے بعد اس کا دفتر الگ ہوا اور پھر اس کا بجٹ بھی الگ کیا گیا، اس وقت بورڈ کا کام گریجویٹ لیول کی کتابیں شائع کرنا تھا، لہٰذا سب سے پہلے ترجمے کا کام ہوا کیوں کہ یہ ساری چیزیں اردو میں نہیں تھیں اور ہر سبجیکٹ کے لیے کتابوں کی تیاری مشکل کام تھا، یہی وجہ ہے کہ اس کے لیے 26 لوگوں کا ایک پینل بنا جس میں کشمیر یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ عثمانیہ یونیورسٹی اور پٹنہ یونیورسٹی وغیرہ کے علاوہ اردو کے اہم پروفیسران بھی اس میں شامل ہوئے ساتھ ہی کیمسٹری اور ہسٹری کے پروفیسرس بھی اس میں شامل ہوئے، تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ کس کتاب کا ترجمہ ہونا ہے اسی چیز کو طے کرنے کے لیے پینل بنایا گیا، مگر کتابوں کے ترجمے کے دوران اردو اصطلاحات کا مسئلہ پیدا ہوا، پھر اصطلاحات کمیٹی بھی بنی جس میں پروفیسرس رکھے گئے تاکہ یہ لوگ اصطلاحات پر کام کریں جس میں معروف پروفیسر عابد صاحب بھی شامل تھے، مگر جب کونسل بنی تو پورا فریم ورک ہی بدل گیا کیوں کہ ترقی اردو بورڈ کا کام تھا بی اے لیول کی تدریسی کتابوں کو شائع کرنا، جب کہ کونسل کا نام فروغ اردو زبان کونسل تھا۔

خ م ر: کونسل کو کس طرح اس جانب پیش رفت کرنا چاہیے۔

شہباز حسین: ارکان کونسل کو چاہیے کہ وہ اردو اسکولوں میں جائیں ان کے مسائل سے آگاہ ہوں، ان سے دریافت کریں کہ اردو کے سلسلے میں ان کے ساتھ کیا مسائل ہیں، اردو پڑھانے میں انھیں کن مسائل ومشکلات کا سامنا ہے، لہٰذا کونسل کو چاہیے کہ اس جانب ان اسکولوں کی مدد کرے، کونسل کو چاہیے کہ وہ ایک ایک اسکول کا سروے کرے، اردو اساتذہ سے ملاقات کی جائے، اور جن اسکولوں میں درسی نصاب کا مسئلہ ہو اسے حل کریں، جہاں کتابیں دستیاب نہیں ہیں وہاں کتاب فراہم کریں، کہیں بلیک بورڈ نہیں ہے تو وہاں بلیک بورڈ دستیاب کرائیں، کہیں ٹیبل نہیں ہے تو وہاں ٹیبل دستیاب کرائیں اسی طرح کہیں کرسی نہیں ہے تو وہاں کرسیاں دستیاب کرائی

جائیں، اسی طرح بہت سارے اسکولوں میں اردو پڑھانے والے نہیں ہیں، وہاں اردو اساتذہ کو دستیاب کرایا جائے، لہٰذا اس جانب سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

خ م ر: اردو پڑھانے اور سکھانے کے لیے آپ کس طرح کی کتابوں کی بات کر رہے ہیں اس کی مزید وضاحت مطلوب ہے۔

شہباز حسین: خان صاحب میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ زبان کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہے کہ نسل نو کو اردو لکھنا پڑھنا سکھایا جائے اور ملک میں بڑے پیمانے پر اس طرح کے مراکز کھولے جائیں جو اردو زبان کی تعلیم دیں، جیسے حیات اللہ انصاری کی کتاب ''دس دن میں اردو'' اس کو زیادہ سے زیادہ شائع کیا جائے اور اس کو چھاپ کر بڑے پیمانے پر تقسیم کی جائے، اسی طرح اور بھی بنیادی کتابیں ہو سکتی ہیں، جو اس کام میں معاون ہوں۔

خ م ر: شہباز صاحب آپ اپنے تجربے کی روشنی میں یہ بتائیے کہ اردو پڑھنے کے مسائل کیا کیا ہیں۔

شہباز حسین: اردو پڑھنے کے مسائل کی ہم اگر بات کریں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب سے انگریزی زبان کو پڑھنے کا غلبہ ہوا ہے جگہ جگہ انگریزی اسکول کھولے جا رہے ہیں جس کی وجہ سے ہر زبان کے اسکول کی تعلیم کم ہوگئی ہے بلکہ تقریباً ختم ہوگئی ہے، جیسے اردو، کنڑ، ملایلم اور دیگر زبانوں کے اسکول کم ہوگئے بلکہ بہت سارے اسکول تو بند ہوگئے کیوں کہ لڑکوں کی بڑی تعداد انگریزی اسکولوں کی طرف بھاگ رہی ہے، سچ تو یہ ہے کہ آج اردو کوئی پڑھنا ہی نہیں چاہتا، دوسری وجہ یہ ہے کہ جب سے انسانی زندگی میں خوشحالی اور آسودگی آئی ہے ہر شخص انگریزی میڈیم کے اسکول میں اپنے بچوں کو پڑھانا پسند کرتا ہے، وہ اپنے بچوں کو اردو پڑھانا پسند نہیں کرتے، سب سے زیادہ اردو اسکول ممبئی میں تھے، ہمارے زمانے میں میونسپلٹی کے پرائمری اسکول ساڑھے تین سو تھے، اب جا کر معلوم کیجیے یقیناً وہ آدھے ہوگئے ہوں گے، اس کی وجہ آخر کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اب گارجین اپنے بچوں کو اردو اسکولوں کے بجائے انگریزی اسکولوں میں بھیج رہے ہیں، جس کی وجہ سے اردو اسکول بند ہو رہے ہیں۔

خ م ر: آخر بیشتر لوگ اردو اسکول چھوڑ کر انگریزی اسکولوں کی طرف کیوں بھاگ رہے ہیں؟

شہباز حسین: اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انھیں اردو زبان سے نفرت ہے، ایسا بالکل نہیں ہے بلکہ والدین یہ دیکھ رہے ہیں کہ میرا بچہ کون سی زبان پڑھ کر روزی روٹی سے وابستہ ہو جائے گا، اور ظاہر سی بات ہے کہ اردو روزی روٹی سے اس طرح جڑی ہوئی زبان نہیں ہے جس طرح انگریزی ہے، اس لیے زیادہ تر لوگ انگریزی کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ اگر آپ اردو زبان کو بھی روزگار سے جوڑ دیں تب لوگ شوق سے اردو پڑھیں گے۔ دوسرا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اردو کے وہ لوگ جو آج سرخیل بنے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا بچہ اردو سے وابستہ نہیں ہے، جب کہ دوسرے میدانوں اور زبانوں میں یہ ہوتا ہے کہ باپ اگر ڈاکٹر ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا بھی ڈاکٹر بنے، اسی طرح باپ اگر وکیل ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا بھی وکیل بنے بلکہ اس سے اچھا اور نامور وکیل بنے، مگر اردو کے ساتھ ایسا نہیں ہوا؟ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان پروفیسروں کو اردو میں روزگار کے مواقع نظر نہیں آتے، جب کسی زبان کو پڑھنے سے روزگار کا مسئلہ ہی حل نہیں ہوگا تو کوئی اس زبان کو کیوں پڑھے گا۔ ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ اردو والے شاعری اور افسانے سے باہر ہی نہیں نکلے، ہم نے اپنے وقت میں آج کل کا فن تعمیر نمبر نکالا، موسیقی نمبر، غزل نمبر، فلم نمبر اور جنگلی جانور نمبر نکالا تا کہ اردو والے کچھ اردو سے ہٹ کر بھی سوچیں، غزل اور افسانے کے علاوہ بھی کچھ پڑھیں۔

خ م ر: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اب اردو کے تعلق سے لوگوں کا جذبہ مر چکا ہے۔

شہباز حسین: دیکھیے اردو پڑھنے اور پڑھانے کا آج بھی لوگوں میں جذبہ اور خواہش ہے، مگر ضروری ہے کہ اس کے جگہ جگہ مراکز قائم کیے جائیں، جہاں لوگ بہ آسانی جا کر پڑھ سکیں، چوں کہ ذاتی طور پر کسی کے بس کا نہیں ہے کہ اتنا بڑا کام کوئی کر سکے، اور اس میں آنے والے اخراجات برداشت کر سکے، مگر یہ کوئی ادارہ ہی کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ سب سے بڑا مسئلہ اردو نصاب کی تیاری اور اردو کی کتابوں کی دستیابی کا ہے، جب پہلے این سی ای آر ٹی کی کتابیں ملک کے سبھی صوبے میں دستیاب کرائی جاتی تھیں، اسی طرح مکتبہ جامعہ کشمیر وغیرہ کے لیے تین تین لاکھ کتابیں شائع کرتا تھا، مگر چونکہ اب ہر چیز میں تجارتی ذہن کارفرما ہو گیا ہے لہٰذا ہر صوبے نے یہ کہا ہے کہ اردو کے تعلق سے وہ بورڈ بالکل ہی غیر ذمے دار ہوتا ہے، وہ اردو کے تعلق سے کچھ سوچتے ہی نہیں، اس وجہ سے وہ اردو کی کتابیں شائع نہیں کرتے جب کہ بورڈ کو چاہیے کہ وہ اسکولوں میں جائے ان کے مسائل دریافت کرے اور معلوم کرے کہ اساتذہ کی بحالی کیوں نہیں ہو پا رہی ہے، کتابیں وقت پر کیوں نہیں شائع ہو رہی ہیں۔

خ م ر: اردو زبان کو زندہ رکھنے کے لیے کیا طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔

شہباز حسین: دیکھیے اردو بے حد میٹھی اور پرکشش زبان ہے، اس لیے بہت ضروری ہے کہ اس زبان سے لوگوں کو اٹریکٹ کیا جائے، اس زبان سے لوگوں کو روبرو کرایا جائے، جب ہم اس کا اٹریکشن بڑھائیں گے تو لوگ خود بخود اس زبان سے جڑیں گے اور اس سے وابستہ ہوں گے، پھر وہ اس کو پڑھیں گے، آپ دیکھیے کہ ہر سال جشن ریختہ ہوتا ہے، اس جشن میں ہزاروں لوگ کون ہوتے ہیں اور کہاں سے آتے ہیں، دراصل یہ سب اردو کے چاہنے والے لوگ ہوتے ہیں، یہ لوگ رات رات بھر بیٹھ کر غزل، قوالی اور سنگیت سنتے ہیں، چاہے ان کی سمجھ میں وہ آئے یا نہ آئے، میں ایک مثال پیش کرتا ہوں کہ ہمارا ایک بنگالی ساتھی تھا اس نے مغل اعظم فلم تین یا چار دفعہ دیکھی، ہم نے اس سے کہا کہ یار یہ بتاؤ کہ تمھاری کیا سمجھ میں آتا ہے کہ تم بار بار اس فلم کو دیکھنے جاتے ہو، اس نے برجستہ کہا کہ جب وہ ڈائلاگ بولتا ہے تو بڑا اچھا لگتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس کشش والی زبان سے لوگوں کا رشتہ جوڑا جائے، پھر ایک کام جو ہم سب کے کرنے کا ہے وہ یہ کہ اردو آبادی والے علاقے میں ہم سب جائیں اور وہاں میٹنگ کریں کہ بھائی آپ لوگ اردو کیوں نہیں پڑھتے ہیں، آپ کو اردو پڑھنے میں کیا پریشانی ہے، اس طرح سے لوگوں کے درمیان جا جا کر ہمیں اردو کے تعلق سے لوگوں کو بیدار کرنا ہوگا، اور اس کام کو ایک مہم کی طرح سے منانا ہوگا، اردو بیداری مہم کے نام پر برسوں کام کرنے کی ضرورت ہے، تب جا کر ممکن ہو سکے گا کہ لوگ اس زبان کو پڑھیں گے اور سیکھیں گے بھی۔

خ م ر: یہ بتائیے کہ زبان کا تہذیب وثقافت سے کیا رشتہ ہوتا ہے؟

شہباز حسین: سب سے پہلے آپ یہ سمجھیے کہ تہذیب اور ثقافت تغیر پذیر ہیں، یہ کوئی جامد اور ٹھوس چیزیں نہیں ہیں، آپ یہ دیکھیے کہ حالات کس طرح سے اور کتنا بدل گئے کہ جو چیز پہلے پسندیدہ نہیں تھی آج وہ چیز پسند کی جا رہی ہے۔ اس لیے آپ کسی بھی طور پر اور کسی بھی حوالے سے تہذیب کو بدلنے سے روک نہیں سکتے ہیں، اس لیے یہ سمجھیے کہ سماجی تبدیلی ناگزیر ہے وہ ہو کر رہے گی، آپ ماضی کی طرف جائیے اور دیکھیے کہ لوگ کس طرح اپنے گھروں کی شادیوں اور مختلف خوشی کے مواقع پر چاندنی پر بیٹھا کرتے تھے، مگر آج چاندنی کی جگہ صوفے نے لے لیا ہے، اب لوگ چاندنی کو بھول گئے اور صوفے پر بیٹھ رہے ہیں، اسی طرح لوگ ڈائننگ ٹیبل کا استعمال کرتے ہیں اور کھانے میں ہاتھ کے بجائے اسپون کا استعمال کرتے ہیں، اسی طرح رومال اور تولیہ کی

جگہ ٹیشو پیپر خوب استعمال کیا جارہا ہے، لہذا جیسے جیسے حالات بدلتے ہیں ہمارا معاشرہ بھی ویسے ہی ویسے بدلتا رہتا ہے، اس طرح سماج میں لڑکیوں کا اہم مسئلہ ہے کہ وہ کل تک کسی حد تک گھر میں رہتی تھیں، بازار، شاپنگ اور دیگر چیزوں کا رواج کم تھا، مگر آج خوب ہے، لڑکیاں اور عورتیں ہی اب مارکیٹنگ کررہی ہیں، جب کہ پہلے ایسا نہیں تھا، لہذا اس تبدیلی کو روکا نہیں جاسکتا ہے، مگر ہاں ایک کام جوکہ ناگزیر ہے وہ کیا جاسکتا ہے، وہ یہ کہ اگر ہم بچوں اور بچیوں کی تربیت اور ان کی اصلاح کا صحیح نظم کردیں تو اتنا تو ضرور ہوگا کہ ہمارے وہ بچے اور بچیاں بڑے ہوکر ایک حد کو پار نہیں کریں گے، وہ اس کا ضرور خیال رکھیں گے، جس کے نتیجے میں ہم بہت ساری خرابیوں سے بچ سکتے ہیں، بہرحال یہ تو ضروری ہے کہ ایک لچھمن ریکھا کھینچنا ضروری ہے کہ جب ہم بچوں کو آزادی دے رہے ہیں تو کس حد تک آزادی ہونی چاہیے اور کس حد تک نہیں ہونی چاہیے، تاکہ بچے حد سے زیادہ نہ گزریں۔

خ م ر: شہباز صاحب دیکھا یہ جارہا ہے کہ زبان بہت تیزی سے مٹتی جارہی ہے تو کیا زبان کا مٹنا انسانی تحفظ کا مسئلہ نہیں ہے؟

شہباز حسین: دیکھیے یہ ڈیجیٹل دور ہے، یہاں زبان نہیں بلکہ فارمولے سے کام لیا جارہا ہے، جب کہ یہ بھی وقت کی ایک اہم ضرورت ہے، مگر اس کا نقصان یہ ہے کہ آج کل ٹی وی اور دوسری الکٹرانک مشینوں کو رواج دے کر زبان ختم کردی گئی ہے اور صرف فارمولے کو اختیار کیا جارہا ہے، اب آپ دیکھیے کہ نیٹ کے اس دور میں پڑھنے لکھنے کا رواج ختم ہوگیا ہے، چوں کہ ٹی وی، کمپیوٹر، لیپ ٹاپ اور اس طرح دیگر مشینوں نے لوگوں کو تفریحی کاموں میں الجھا کر رکھ دیا ہے، اور پڑھنے پڑھانے سے رشتہ کاٹ دیا ہے، اس لیے جب بہت کم محنت میں ساری چیزیں نیٹ پر دستیاب ہیں تو کوئی کیوں کتاب پڑھنے جائے، آج یہ رواج عام سا ہوگیا ہے کہ لوگ دن بھر دفتر میں کام کرکے گھر آتے ہیں اور شام کو ٹی وی اور کمپیوٹر پر بیٹھ کر اپنا دل بہلاتے ہیں اور اپنے ٹینشن کو رفع کرتے ہیں، آج کوئی شخص اپنے بچوں کے ساتھ نہیں کھیلتا ان کے ساتھ انٹرٹین نہیں کرتا، آج سبھی لوگ اپنی بیوی اور بچوں کو چھوڑ کر انٹرنیٹ سے دل بہلاتے ہیں، اس طرح دیکھا جائے تو لوگوں نے اپنا رشتہ خود اپنے آپ سے کمزور کرلیا ہے اور الیکٹرانک چیزوں سے الجھ کر رہ گئے ہیں، اس لیے آپ یقین کیجیے کہ اب جو وقت آرہا ہے اس میں زبان کا استعمال کم سے کم ہوگا اور اس کی جگہ فارمولہ اور سائین لینگویج لے لے گی۔

خ م ر: روز بروز اردو انگریزی زدہ ہوتی جارہی ہے لہذا اس کو کیسے روکا جاسکتا ہے، اردو کو انگریزی زدہ ہونے سے کیسے بچایا جاسکتا ہے۔

شہباز حسین: دیکھیے سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہر زبان میں ہر چیز کا متبادل نہیں ہے، جیسے ٹوئٹر ایک لفظ ہے جو خوب استعمال ہوتا ہے، مگر آپ یہ سوچے کہ اگر اسے ٹوئٹر نہ بولا جائے تو پھر اردو میں اس کا متبادل کیا ہے، اسی طرح فیس بک، واٹس اپ، گوگل اور بلاک کو لے لیجیے تو کیا ان اصطلاحوں کا اردو زبان میں کوئی متبادل ہے، اسی طرح آپ روزمرہ کی چیزوں کو ہی دیکھ لیجیے، جیسے ٹیلی ویژن، ٹیلی فون اور واشنگ مشین وغیرہ کی اصطلاحوں کو ہی دیکھ لیجیے کہ اس کا بدل اردو میں نہیں ہے، آپ دیکھیے کہ ایک وقت میں عثمانیہ یونیورسٹی میں بہت ترجمے کا کام ہوا تھا، انھوں نے تھرمامیٹر کا ترجمہ مقیاس الحرارت کیا تھا، اسی طرح لاؤڈ اسپیکر کا ترجمہ مکبر الصوت کیا تھا، ٹیلی فون کا ترجمہ دور گو کیا تھا، مگر اصل مسئلہ یہ ہے کہ آپ کسی عام فہم چیز کا ترجمہ کرکے اسے نافہم بنارہے ہیں، اس لیے بہت ساری ایسی چیزیں ہیں کہ جو جیسی ہیں ویسی ہی ٹھیک ہیں، ذرا سی اس میں چھیڑ چھاڑ کریں گے تو اس کی شکل بگڑ جائے گی۔ میں ایک واقعہ سناتا ہوں کہ میرے پڑوس میں ایک شاعر صاحب رہتے ہیں، وہ ایک روز چھت پر غزل سنا رہے تھے وہاں ان کا بیٹا بھی موجود تھا، اس نے پوچھا ابا سوزِ الفت کے کیا معنی ہیں، اسی طرح کسی نے آتش سے پوچھا کہ بیگم کا اصل تلفظ بیگم ہے اور یہ ترکی کا لفظ ہے، اس سوال پر آتش نے برجستہ کہا کہ ترکی میں ہوگا، مگر اردو میں تو بیگم ہی ہے اور یہی اچھا ہے، اسی طرح بہار میں گرمی میں نکلنے والے چھوٹے چھوٹے دانوں کو گھموری بولتے ہیں، مگر دہلی وغیرہ میں اسے دانہ بولتے ہیں، اسی طرح بہار میں گنجی بولتے ہیں اور دہلی وغیرہ میں اسے بنیان بولتے ہیں، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بہت ساری چیزیں ریجنل اعتبار سے معروف ہیں، لہذا اسے ویسے ہی رہنے دینا چاہیے کیوں کہ دوسری زبانوں میں اس کا کوئی متبادل نہیں ہے، اردو زبان میں شروع سے ہی فارسی اور عربی کی آمیزش رہی ہے اگر فی زمانہ انگریزی کی آمیزش ہورہی ہے تو ہونے دیجیے اس سے گھبرانے کی ضرورت کیا ہے، انگریزی کے وہ الفاظ جو اردو میں کھپ جائیں انھیں کھپایئے اس کے متبادل کی ضرورت کیا ہے۔

خ م ر: آپ کا بیک گراؤنڈ اردو نہیں تھا اس کے باوجود آپ اردو کے ادارے سے وابستہ رہے آپ کو اردو والوں کے درمیان کام کرکے کیسا محسوس ہوا۔

شہباز حسین: دیکھیے اردو ترقی بورڈ کی بدولت میری ملاقات ہر زبان کے پروفیسر سے رہی اور وہ سب اردو بولنے اور لکھنے پر قادر بھی تھے مگر علی گڑھ کے ایک ایسے پروفیسر سے واسطہ پڑا جو اردو بولتے ضرور تھے مگر وہ اردو لکھتے نہیں تھے، وہ لوگ بہت خوش ہوتے تھے کہ اردو کی ترقی کے لیے کام ہورہا ہے، آپ کے سامنے میں ایک بڑی مثال پیش کررہا ہوں وہ یہ کہ آپ اردو پڑھیے اور اردو بولیے مگر کام زمانے کے اعتبار سے کیجیے، دیکھیے سرسید نے ایک صدی پہلے وقت کو بھانپ لیا تھا یہی وجہ تھی کہ انھوں نے علی گڑھ کو اردو میڈیم کے بجائے انگریزی میڈیم رکھا، جس کی مخالفت کا انھیں سامنا بھی کرنا پڑا، مگر یاد رکھیے کہ آج علی گڑھ کو انگریزی میڈیم بنانے کا فائدہ ملا، کیا اردو میڈیم ہونے کی صورت میں یہ فوائد ملتے؟ قطعی نہیں، یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اسے انگریزی میڈیم رکھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ سرسید نے زبان کو محدود ہونے سے بھی بچایا اور اس کی وجہ سے مسلمانوں کا آج جو فائدہ ہوا اور ہورہا ہے وہ نہیں ہوتا، ایک طرح سے مسلمانوں کا نقصان ہی ہوتا، ویسے بھی اردو پورے ملک میں کہاں بولی جاتی ہے، اردو کا حلقہ تو پہلے سے ہی محدود ہے جیسے اردو ساؤتھ میں نہیں بولی جاتی ہے، ایسٹ میں بھی نہیں بولی جاتی ہے، بنگال اور آسام میں بھی اردو نہیں بولی جاتی۔

خ م ر: اچھا یہ بتایئے کہ اردو کا حلقہ بڑھانے کے لیے کیا کرنا ہوگا اپنے تجربے کی روشنی میں اس جانب کچھ رہنمائی کیجیے۔

شہباز حسین: دیکھیے ایک ہندو اردو بولنا چاہتا ہے چوں کہ اردو اس کو سننے میں اچھی لگتی ضرور ہے مگر وہ اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھائے گا کیوں کہ اردو سے اس کے فیوچر کا مسئلہ حل نہیں ہوگا، آپ دیکھیے کہ جس طرح دہلی اردو اکیڈمی کناٹ پلیس میں اردو کا بڑا جشن مناتی ہے اور کتاب میلہ لگاتی ہے، جشن اردو اور وراثت اردو کے نام سے جشن منایا جاتا ہے، اس طرح جشن ریختہ منایا جاتا ہے ساتھ ہی اکیڈمی کی جانب سے اردو سکھانے کے لیے کئی سینٹرس چلائے جاتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسی طرح جگہ جگہ سینٹر چلائے جائیں، اور اسی طرح سرکاری اسکولوں کا دورہ کرکے اس کا سروے کیا جائے اور طلبہ کے ساتھ ان کے سرپرستوں کو اردو کی اہمیت بتا کر اس کو پڑھنے اور پڑھانے پر آمادہ کرایا جائے تو یقین ہے کہ کچھ فائدہ ضرور ہوگا۔ ان شاءاللہ!

■

Dr. Khan Rizwan
D-307, M.M.I. Publishers
Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar
New Delhi - 110025
Mob: 9810862283

انیس امروہوی

تحریک آزادی اور ہماری فلمیں

ہندوستان کی آزادی کی تحریک یوں تو 1857 کی جدوجہد سے ہی شروع ہوگئی تھی، مگر انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور چالاکیوں نے اس تحریک کو اپنے ظلم وستم سے دَبا کر ہندوستان کو غلام بنالیا اور پورے ہندوستان پر قبضہ کرلیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فوٹوگرافی کی تکنیک میں نت نئے تجربے ہورہے تھے اور تصویر کو متحرک بنانے کی کوششیں کی جارہی تھیں۔ دوسرے ممالک میں پردے پر چلتی پھرتی تصویروں کو ابھارنے کی کوشش 1893 میں ہی کامیابی کی طرف گامزن ہو چکی تھی۔ ہمارے یہاں ہندوستان میں اپنے طور پر بھی کوششیں جاری تھیں۔

اس زمانے میں ہندوستان میں اس طرح کی کئی کتابیں شائع ہوئیں، جن میں تمام صفحات پر ایک جیسی تصویریں چھپی تھیں، مگر ہر تصویر پچھلی تصویر سے تھوڑی سی مختلف تھی۔ جب اس کتاب کے صفحات کو تیزی سے الٹا جاتا تو ایسا لگتا تھا جیسے اس کتاب میں چھپی تصویر متحرک ہواٹھی ہو۔

پہلے پہل 1896 میں ہندوستان کے شہر بمبئی میں بیرون ممالک سے چھوٹی چھوٹی خاموش فلموں کی آمد شروع ہوئی اور 7 جولائی 1896 کولمونیئر برادرس نے بمبئی کے واٹسن ہوٹل میں 'میجک لائٹس' کے نام سے ایک چھوٹی سی فلم کی نمائش کی۔ اس طرح کی فلموں کو عوام نے اور تھیئٹر کے مالکوں نے بہت پسند کیا۔ طویل فیچر فلموں کے سلسلے کو ہندوستان میں شروع کرنے کا سہرا داداصاحب پھالکے کو جاتا ہے۔ انھوں نے 'لائف آف کرائسٹ' نام کی فلم سے متاثر ہوکر بڑی جد وجہد سے فلم 'راجہ ہریش چندر' کو ہندوستان میں تیار کیا اور 1913 میں اس خاموش فلم کی نمائش کی۔ اس طرح ہندوستان میں خاموش فلموں کا سفر شروع ہوگیا۔ حالانکہ 1900 میں گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور نے گراموفون پر پہلی بار خود اپنی ہی آواز میں...... ''بندے ماترم......'' گانا ریکارڈ کرایا تھا، مگر 1931 میں ہندوستانی فلموں کو بھی بولنا آگیا اور آرڈیشر ایرانی نے ہندوستان کی پہلی بولتی فلم 'عالم آرا' کی نمائش کی۔ یہی وہ دَور تھا جب ہندوستان میں جنگِ آزادی کی تحریک بھی زوروں پر تھی۔

1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ہندوستان کے نوجوان، آزادی کے متوالے پوری طرح انگریزوں کو ہندوستان سے بھگا دینے کا فیصلہ کر چکے تھے اور گاندھی جی کی قیادت میں مکمل آزادی کی قرارداد پاس ہوچکی تھی۔ مگر ایسے وقت میں بھی ہماری فلموں میں آزادی کی تحریک کے اثرات کم دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ایک تو انگریز حکومت کی قائم کردہ پابندیاں اور ظلم وستم، جس کی وجہ سے کوئی بھی فلمساز ایسے موضوع کو اپنانے سے اپنا دامن بچاتا تھا، جس سے انگریز حکومت کے غضب کا شکار ہونے کا خطرہ لاحق ہو۔

دوسرے برٹش حکومت نے 1922 میں پریس سنسرشپ قائم کیا اور اس کے دائرہ کار میں ہندوستانی سینما کو بھی جکڑ لیا۔ جس کی وجہ سے اگر کوئی فلمساز تحریک آزادی کو موضوع بنا کر فلم بنا بھی لیتا تو اس کی نمائش پر پابندی لگ سکتی تھی۔ ایک اور خاص وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک ہندوستانی فلموں کا مزاج صرف دیومالائی یا جادوئی کہانیوں تک محدود تھا، اور لوگ اسی کو پسند کرتے تھے۔

خاموش فلموں کے دَور میں بھی بمبئی میں کئی لوگوں نے ہمت کرکے سیاسی مقاصد کو پس منظر میں رکھ کر کئی اہم فلمیں بنائیں، جو مقبول بھی ہوئیں۔ فلم 'کس کا قصور' بیوہ عورتوں کے مسائل کو لے کر بنائی گئی تھی۔ مگر اس کے علاوہ 'گوری بالا' اور 'رام رحیم' میں سیاسی تحریک کو ایک خاص انداز میں پیش کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستانی قومیت کا جذبہ اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے عنصر کو بھی ان فلموں میں شامل کیا گیا تھا۔ تحریک آزادی کی کامیابی اور مقبولیت کے لیے ملک میں ہندو مسلم اتحاد کی سخت ضرورت تھی اور اِسی موضوع کو مرکزی خیال بناتے ہوئے لکشمی پکچرز نے 1925 میں 'سورن' نام سے ایک ایسی فلم کی نمائش کی جس میں مغل تاریخ کے ایک واقعہ کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد کا پیغام ہندوستانی عوام کو دیا تھا۔

فلم 'دی بم' میں بھی انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے پر اکسایا گیا تھا۔ اس لیے برٹش سنسر اور بھی ہوشیار ہوگیا اور اس نے اس فلم کو بری طرح کاٹ دیا تھا۔ وی۔ شانتارام نے فلم 'اودے کال' بھی انہی دنوں میں بنائی تھی۔ اس زمانے میں کوہِ نور اسٹوڈیو میں ایک خاص قسم کی ریلی کا اہتمام کرکے بھی فلم والوں نے تحریکِ آزادی میں حصہ لیا۔ اس کے بعد ہی 'انڈین فلم ایسوسی ایشن' کا قیام عمل میں آیا تھا، اور ایک دن کی مکمل علامتی ہڑتال بھی کی گئی تھی۔

اِسی دَوران ایک اور فلم 'غصہ' کی بھی نمائش ہوئی۔ اس فلم میں ہندوستانی سماج کا پچھڑاپن دِکھایا گیا تھا اور گاندھی جی کی طرح دِکھائی دینے والا ایک کردار بھی اِس فلم میں تھا جسے مکند نام کے ایک اداکار نے ادا کیا تھا۔

1935-36 کے آتے آتے ملک بھر میں ہندوستانی فلموں کے دیکھنے والے سنجیدہ اور غور طلب موضوعات پر بننے والی فلموں کو دیکھنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گئے تھے۔ فلم بینوں کا یہ رویّہ دوسری جنگِ عظیم کے وقت تک اور پھر ہندوستان کی آزادی کی سنہری صبح کے آنے تک برقرار رہا۔ اِس کی خاص وجہ یہ تھی کہ زیادہ تر فلم بین متوسط طبقے کے تھے، یا پھر اونچی سوسائٹی کے لوگ تھے۔ فلمساز کے۔سی۔ بروا نے روایت سے ہٹ کر اور کھوکھلی آزادانہ روش کے درمیان پھنسے انسانوں کے درد کو فلم ''منزل'' اور فلم ''مایا'' میں بڑے ہی پراثر انداز میں پیش کیا۔ جس نے ہمارے فلم بینوں کے ذہن و دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ دیوکی بوس نے فلم 'سنہرا سنسار' میں سماج کی نابرابری کے مسئلے کو پیش کیا۔ اس کے ساتھ ہی واڈیا کی فلم 'جئے بھارت'، وجئے بھٹ کی 'پاسنگ شو' اور محبوب خان کی 'ڈکن کوئن' جیسی فلمیں بھی خاصی کامیاب رہیں۔ ان فلموں میں کسی نہ کسی طور پر دیش بھکتی اور تحریک آزادی کا جذبہ چھپا ہوا تھا۔ 1942 میں مشہور فلمساز و ہدایت کار محبوب خان نے ہی فلم 'روٹی' کی نمائش کی، جس کے ذریعے انھوں نے ہندوستانی عوام کو یہ پیغام دیا کہ انسان کو اپنا حق مانگنے سے نہ ملے تو چھین لینا چاہیے۔ یہ فلم سامراجی نظام کے خلاف ایک بہت اثردار ہتھیار تھی، لہٰذا انگریزی حکومت نے اس پر پابندی لگادی۔ ہومی

واڈیا کی فلم 'ویر پربھات' حالانکہ اسٹنٹ فلم تھی مگر اس میں برٹش حکومت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی بات کو بڑے ہی پراثر انداز اور سلیقے سے پیش کیا گیا تھا۔

1946 میں چیتن آنند نے فلم 'نیچا نگر' پیش کی۔ اس فلم میں انگریز حکومت کے ذریعے معصوم ہندوستانیوں پر ڈھائے گئے مظالم کی تصویر کشی بڑے خوبصورت انداز میں پیش کی گئی تھی۔ اس فلم کی کہانی اردو کے ممتاز افسانہ نگار حیات اللہ انصاری نے تحریر کی تھی اور پنڈت جواہر لعل نہرو کو یہ فلم اس قدر پسند آئی تھی کہ 1947 میں جب نئی دہلی میں پہلی ایشیائی کانفرنس منعقد ہوئی تو پنڈت نہرو کی خواہش کے مطابق یہ فلم کانفرنس کے ڈیلی گیٹس کو دِکھائی گئی۔

اس زمانے میں انگریز حکومت کی سخت سنسر شپ کی وجہ سے بہت سی باتیں سیدھے طریقے سے نہ کہہ کر موضوعات کو بدل کر بھی کہی گئیں۔ مثال کے طور پر شانتارام کی فلم 'پڑوسی' ہندو مسلم ایکتا پر بنائی گئی تھی۔ فلم میں دکھایا گیا تھا کہ ہندو اور مسلمان خاندان آپس میں مل جل کر رہتے ہیں، مگر باہری طاقتیں اپنے مقاصد حاصل کرنے کی غرض سے انھیں آپس میں لڑا دیتے ہیں۔ دوست بچھڑ جاتے ہیں، بعد میں انھیں طرح طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کے پاس صرف یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔ ان کا دوبارہ ملن تب ہوتا ہے، جب ایک باندھ کے ٹوٹنے کی وجہ سے وہ سب موت کی آغوش میں ہوتے ہیں۔

فلم 'قسمت' بامبے ٹاکیز کی فلم تھی، جسے ایس مکھر جی کی ہدایت میں بنایا گیا تھا۔ حالانکہ یہ فلم جرائم کے واقعات پر مبنی ہلکی پھلکی مزاحیہ قسم کی فلم تھی، مگر اس فلم کا ایک گانا...... 'دور ہٹو اَے دنیا والو، ہندوستان ہمارا ہے' نے بڑی شہرت حاصل کی اور تحریک آزادی کے متوالوں کو جھومنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی حب الوطنی کا جذبہ بھی لوگوں میں بیدار ہوا۔ اس گیت کی ایک لائن...... 'تم نہ کسی کے آگے جھکنا، جرمن ہو یا جاپانی' ایک طرح سے انگریزوں کی طرف ہی اشارہ تھا، اور گاندھی جی کے نعرہ 'انگریزو! بھارت چھوڑو' کی ہی ترجمانی کرتا تھا۔ ان دنوں یہ گانا ہندوستان کے بچے بچے کی زبان پر تھا، جسے کوی پردیپ نے تحریر کیا تھا۔

اسی طرح دوسرے فلمسازوں نے بھی انگریزی سنسر بورڈ کی پریشانیوں سے بچنے کے لیے ایسی حکایت آمیز اور دیوی دیوتاؤں کی کہانیوں پر مبنی علامتی فلمیں بنائیں۔ حالانکہ ان کا مقصد لوگوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔

1945 سے 1947 تک کا وقت ہندوستانی سینما کے لیے بے حد اہم رہا ہے۔ ایسے وقت میں جب دوسری جنگ عظیم ختم ہو رہی تھی اور ہندوستان کو آزادی ملنے ہی والی تھی، ہر طرح کے فن کے میدان میں تبدیلی کی لہریں نمایاں ہونے لگی تھیں۔ ہماری فلموں نے بھی ایسے ماحول میں کروٹ لی اور کچھ لوگوں نے ہمت کر کے خاص طرح سے تحریکِ آزادی کو موضوع بنا کر فلمیں بنانے کا اِرادہ کر لیا۔ ادھر بنگال میں بھی نوجوانوں میں ایک خاص طرح کی لہر چل رہی تھی۔ تب وہاں بی۔ این سرکار نے 'ہمراہی' فلم بنائی۔ پربھات کی فلم 'ہم ایک ہیں' کی کہانی بھی پوری طرح قومی ایکتا کے دھاگے میں پروئی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں لیک سے ہٹ کر بننے والی فلموں کے موضوعات بائیں بازو کی تحریک سے متاثر ہونے لگے، کیونکہ ان کے لکھنے والے زیادہ تر ادیب اور شاعر اسی تحریک سے وابستہ تھے۔ اِس طرح کی تحریک کو اپٹا (IPTA: Indian People theatre Assicoation) سے بھی کافی مدد ملی، اور اِس تحریک کا جذبہ فلموں پر حاوی ہوتا گیا۔

دیکھا جائے تو تحریک آزادی کو موضوع بنا کر ہندوستان کی آزادی سے پہلے کوئی بہت زیادہ کام نہیں ہو سکا تھا۔ 29 اگست 1918 کو لوک مانیہ تلک نے خاص طور پر کانگریس کا اجلاس بمبئی میں بلایا تھا۔ اس وقت بابوراؤ پینٹر نے اپنے دو معاون داملے اور فتح لعل کو ساتھ لے کر اِس اجلاس کی فلم بندی کی تھی۔ مگر یہ فلم اس وقت کہیں پر بھی دکھائی نہ جا سکی تھی، اور جب 1920 میں بابوراؤ پینٹر ہی کی فلم 'سیرندھری' کی بمبئی کے میجسٹک سینما میں نمائش ہوئی، تب اس فلم کو بھی 'سیرندھری' کے ساتھ ہی جوڑ کر دکھایا گیا۔ مگر اس فلم کی نمائش سے قبل ہی یکم اگست 1920 کو بال گنگا دھر تلک کا انتقال ہو چکا تھا۔

1935 میں ایسٹرن کمپنی نے فلم 'بھارت کی بیٹی' بنائی تھی۔ اس کی ہدایت پریمانکور آتھرتھی نے کی تھی اور کہانی کے۔ ایل۔ ورمانی کی تھی۔ اس فلم میں بھی ہندوستان کی آزادی کی بات کو اٹھایا گیا تھا۔ 1938 میں محبوب خان نے وطن نام سے ایک فلم بنائی تھی، جو حب الوطنی پر مبنی کچھ باتوں کو لے کر پیش کی گئی تھی۔

ملک کی آزادی کے ساتھ ہی فلم والوں کو بھی اپنی مرضی کے موضوعات پر فلم بنانے کی آزادی ملی...... اور بڑی تیزی سے تحریکِ آزادی اور حب الوطنی کے موضوعات پر فلمیں بننے لگیں۔ وی۔ شانتارام نے 1949 میں فلم 'اپنا دیش' بنائی۔ نتن بوس نے 1950 میں 'مشعل' بنائی۔ شیام مکھر جی نے 1950 میں ہی اشوک کمار کو لے کر فلم 'سنگرام' بنائی۔ 1952 میں فیمس پکچرز نے آر۔ ایس۔ چودھری کی ہدایت میں فلم 'جلیاں والا باغ' بنائی اور پھر 1953 میں منروا مووی ٹون کے بینر سے سہراب مودی نے فلم 'جھانسی کی رانی' پیش کی، جو بہت مقبول ہوئی۔ 1954 میں فلمستان نے 'جاگرتی' بنائی۔ 1954 میں ہی 'شہید اعظم بھگت سنگھ' کی نمائش ہوئی، جو مکمل طور پر تحریک آزادی پر مبنی فلم تھی۔

اس سلسلے کی سب سے مشہور اور بہترین فلم 'شہید' تھی، جس نے تحریک آزادی کے متوالے نوجوانوں کو جوش و خروش سے لبالب بھر دیا۔ فلمستان کی اس فلم کے خالق رمیش سہگل تھے اور دلیپ کمار کی ہیروئین کامنی کوشل تھیں۔ چندر موہن، لیلا چٹنس اور رام سنگھ نے بھی اس فلم میں اہم رول ادا کیے تھے۔ فلم کے مکالمے اور کہانی کی بنت نے ہندوستانی عوام کے سینوں میں ایک جوش بھر دیا تھا۔ اسی نام سے ایک دوسری فلم 1965 میں بھی بنی تھی۔ اس دوسری فلم 'شہید' میں منوج کمار کے ساتھ اور کئی نامور اداکار اور اداکارائیں تھیں، اور یہ فلم بھی کافی مقبول ہوئی تھی۔ 1965 میں ہی آئی۔ ایس۔ جوہر نے ایک فلم 'جوہر محمود اِن گوا' بنائی تھی۔ یہ فلم بھی تحریک آزادی کے موضوع پر ہی بنی تھی، مگر اس فلم میں خاص طور پر گوا کی آزادی کو ہی موضوع بنایا گیا تھا۔ منوج کمار کی فلم 'کرانتی' بھی تحریک آزادی کے ہی موضوع پر ایک بڑی فلم تھی اور اس میں دلیپ کمار نے بھی ایک اہم رول ادا کیا تھا۔ یہ فلم بھی کافی کامیاب ہوئی تھی۔

ان سب فلموں کے علاوہ بھی کئی فلمیں ایسی آئیں، جن میں ہندوستان کی تحریک آزادی کے کچھ حصے فلمائے گئے تھے، یا کہانی میں اس دور کے چند واقعات پیش کیے گئے تھے۔ اس سب کے باوجود اتنے بڑے ملک کی آزادی کی اتنی بڑی تحریک پر جو کام دنیا کی سب سے بڑی ہماری فلم انڈسٹری میں ہونا چاہیے تھا، میرے خیال سے وہ نہیں ہو پایا ہے۔ آزادی سے قبل تو انگریز حکومت کا سنسر بورڈ آڑے آتا رہا، مگر اب اس سلسلے میں ضرور کوئی ایسا کام ہونا چاہیے جس سے ملک کا وقار اونچا ہو۔ آزادی کے اس موضوع پر سب سے بڑی فلم 'گاندھی' کو ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس فلم میں بڑے پیمانے پر گاندھی جی کی زندگی اور اس وقت کے حالات کی عکاسی ہوئی ہے۔ مگر یہ فلم مکمل طور پر ہندوستانی فلم نہیں کہی جا سکتی۔ کیا اس طرح کی کسی بڑی فلم کی امید ہم ہندوستانی سنیما سے بھی کر سکتے ہیں؟

■

Anees Amrohvi
104/B, Yawar Manzil, 1- Block
Laxmi Nagar
Delhi - 110092
Mob.:9811612373
Email.: qissey@rediffmail.com

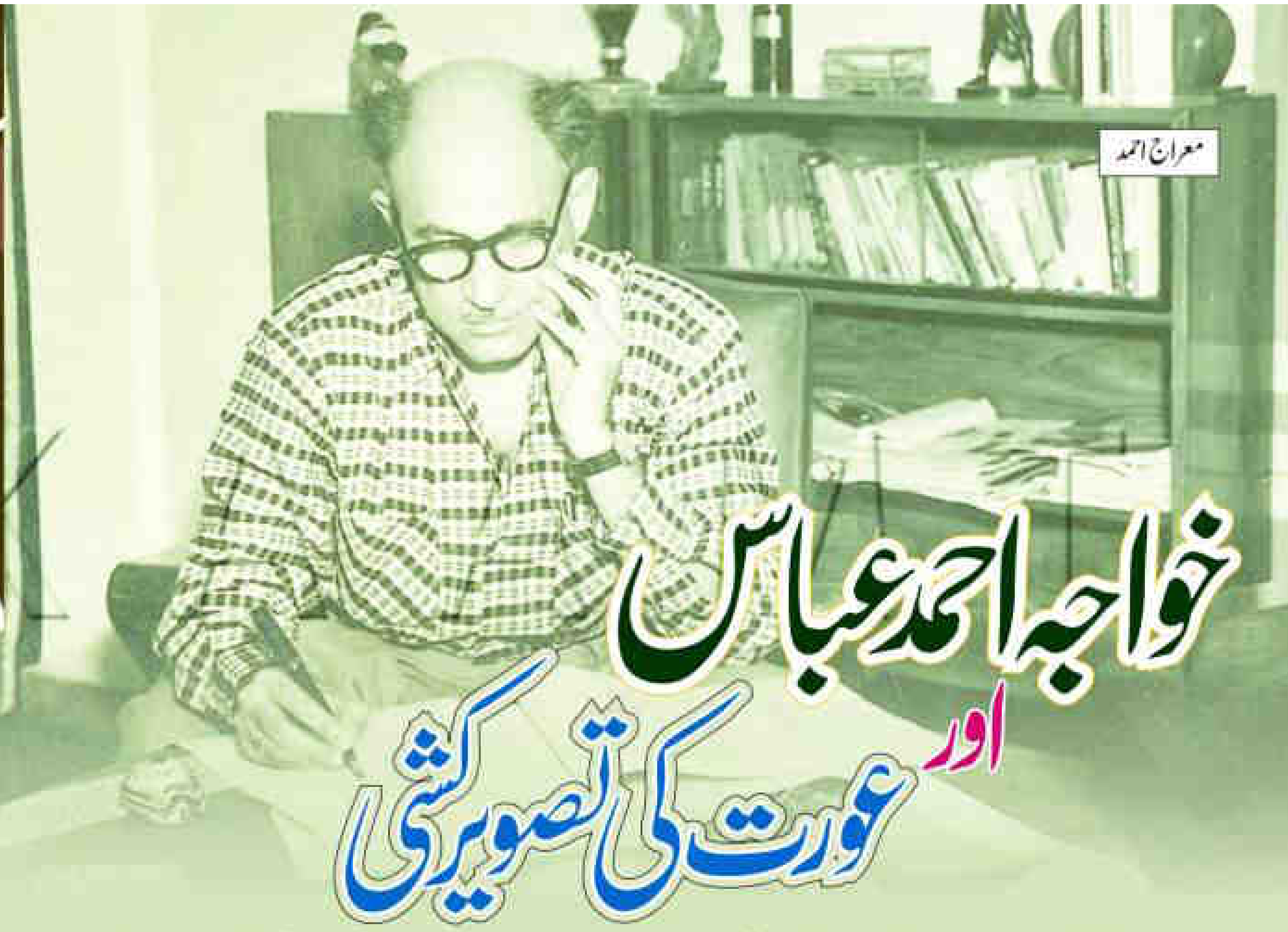

معراج احمد

خواجہ احمد عباس اور عورت کی تصویر کشی

ممتاز صحافی، ناول نگار، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، کالم نویس، فلم ساز، ہدایت کار، منظر نامہ نگار، مکالمہ نگار، خواجہ احمد عباس 7 جون 1916 کو پانی پت میں پیدا ہوئے۔ وہ ادبی اور فلمی دنیا کی ایک نامور شخصیت رہے۔ ان کی زندگی کا ہر دور کسی نہ کسی عورت سے متاثر رہا ہے چاہے وہ ان کی نانی ہوں، ماں ہوں یا ان کی اہلیہ۔ یہ نہ صرف ان کی تحریر میں نظر آتا ہے بلکہ ان کی فلموں میں بھی اجاگر ہے۔ انھوں نے اپنی فلموں میں ہمیشہ عورت کو مضبوط اور آہنی عزم والا دکھایا ہے اور ان کی تحریر میں بھی کبھی عورت کبھی یا کمزور نظر نہیں آتی۔ انھوں نے ہمیشہ عورت کو بہادر اور خود کفیل دکھایا جو زندگی سے لڑنا جانتی ہے۔

خواجہ احمد عباس منظر نامہ نگار، مکالمہ نگار اور ہدایت کار سے زیادہ ایک مثالی شخصیت تھے۔ وہ اپنی فلموں اور تحریروں سے نہ صرف سماج اور دنیا کو آئینہ دکھاتے تھے بلکہ ان کے یہاں ہندوستان کے روشن مستقبل کی تصویر کشی بھی ہے۔

خواجہ احمد عباس نے 1951 میں 'نیا سنسار' کے نام سے اپنی فلم کمپنی قائم کی۔ ان کی کمپنی کی پہلی فلم انہونی تھی جس میں نرگس اور راج کپور نے کام کیا تھا اس کے بعد ان کی کمپنی نے کئی فلمیں بنائی جن میں راہی 1952 (دیو آنند، نلنی جیونت)، منا 1954 (رومی، ڈیوڈ)، پردیسی 1957 (نرگس، بلراج ساہنی)، چار دل چار راہیں 1959 (راج کپور، مینا کماری، اجیت، نمی، شمی کپور)، شہر اور سپنا 1963 (دلیپ راج، سریکھا)، ہمارا گھر 1964 (دلیپ راج، سریکھا)، بمبئی رات کی بانہوں میں 1968 (وِمل آہوجہ، سریکھا)، سات ہندوستانی 1969 (امیتابھ بچن، شہناز)، فاصلہ 1974 (شبانہ اعظمی، رمن کمار)، نکسلائٹ 1978 (متھن چکرورتی، سمیتا پاٹل) ہیں۔ 1985 میں انھوں نے ایک فلم ایک آدمی شروع کی تھی جو ان کے انتقال کی وجہ سے ادھوری رہ گئی۔ اس کے علاوہ انہوں نے لاتعداد فلموں کی کہانی، منظر نامہ اور مکالمے تحریر کیے جن میں راج کپور کی فلمیں سرفہرست ہیں۔

> **خواجہ احمد عباس نے فلموں میں کرداروں کی تصویر کشی بہت عمدگی سے کی ہے جن میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا کردار زیادہ مضبوط اور اجاگر ہے۔ مثلاً میرا نام جوکر میں راجو کی ماں جو اپنے شوہر کو کھونے کے بعد نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا بھی یہی غلطی کرے یا حنا فلم کی بنجارن لڑکی جو ایک گمنام ہندوستانی لڑکے چندر پرکاش کے پیار میں اس کی زندگی بچاتے ہوئے اپنی زندگی قربان کر دیتی ہے۔**

خواجہ احمد عباس نے ہندی فلموں کے نہ جانے کتنے کرداروں کو زندگی بخشی جو آج بھی یاد کیے جاتے ہیں۔ آوارہ کا راج، میرا نام جوکر کا راجو اور بابی کی بابی اس کی چند مثالیں ہیں۔

خواجہ احمد عباس نے فلموں میں کرداروں کی تصویر کشی بہت عمدگی سے کی ہے جن میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا کردار زیادہ مضبوط اور اجاگر ہے۔ مثلاً میرا نام جوکر میں راجو کی ماں جو اپنے شوہر کو کھونے کے بعد نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا بھی یہی غلطی کرے یا حنا فلم کی بنجارن لڑکی جو ایک گمنام ہندوستانی لڑکے چندر پرکاش کے پیار میں اس کی زندگی بچاتے ہوئے اپنی زندگی قربان کر دیتی ہے۔

خواجہ احمد عباس نے خودداری اور عزت نفس اپنے والد خواجہ غلام السبطین سے ورثے میں پائی تھی اور والدہ سے ایک آزاد سوچ و فکر۔ اپنی والدہ کو ایک آزاد خیال خاتون بتاتے ہوئے خواجہ احمد عباس تحریر کرتے ہیں:

''میری فہرست میں سب سے اہم آزاد خیال عورت میری ماں ہیں۔ میں شروعات سے ان کی آزاد خیالی سے متاثر رہا ہوں۔ انھیں سنیما بہت پسند تھا (اس لیے میری

یہ بری عادت پڑی) ہمارے قصبہ میں صرف ایک سنیما ہال تھا۔ اس سے پہلے عارضی سنیما تھے۔ ایک ٹکٹ آٹھ آنہ کا تھا لہٰذا ہم پڑوسیوں اور بچوں کو بھی مدعو کرتے۔ سنیما دیکھنا ہمارے لیے کسی تقریب سے کم نہ تھا۔ میری ماں تو ایک ہیروئن کی طرح تھیں جو میرے والد کا یہ حکم نہیں مانتی تھیں۔''

شروعات کی فلموں میں سب سے مشہور منظر نامہ خواجہ احمد عباس نے آوارہ کا لکھا۔ اس میں انھوں نے ریٹا کے کردار کو مستقبل کی عورت کے طور پر اجاگر کیا جسے پردے پر نرگس نے نبھایا۔ ایک خود اعتمادی سے بھرپور دولت مند عورت ریٹا ہیرو راج سے محبت کرنے لگتی ہے۔ راج کا کردار راج کپور نے نبھایا تھا۔ ریٹا نہ صرف ایک جذباتی عورت ہے بلکہ عملی بھی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ راج ایک چور ہے تو وہ اسے اپنی زندگی سے باہر نہیں کرتی اور نہ ہی اپنے پیار پر شرمندہ ہو کر اپنے کو کوستی ہے بلکہ وہ راج کی ماں کے پاس جا کر تمام حقیقت معلوم کرتی ہے۔

یہی نہیں بلکہ راج جب پکڑا جاتا ہے اور اسے عدالت میں پولیس لے جاتی ہے تو ریٹا جو پیشے سے وکیل بھی ہے اپنے پیار کا بچاؤ کرتی ہے پھر جب راج کو تین سال کی جیل ہو جاتی ہے تو وہ وعدہ کرتی ہے کہ راج کا انتظار کرے گی۔ یہاں خواجہ احمد عباس نے عورت کے دل کے نرم جذبے کی عکاسی کی ہے کیونکہ وہ حقائق کی عکاسی کرتے تھے۔

خواجہ احمد عباس کی زندگی کو متاثر کرنے والی ایک اور عورت ان کی نانی ہیں جس کا عکس وہ مدر انڈیا کے روپ میں دیکھتے تھے۔ وہ بھی عباس کی ادبی تحریروں سے متاثر تھیں۔ عباس نے خود کہا ہے کہ 'وہ ایک تعجب خیز' بڑی آنکھوں والی عورت اور لمبی کہانیاں سنانے والی تھیں۔ ہم ان سے تین شہزادیوں اور سات شہزادیوں کی کہانیاں سنتے تھے، بڑے بڑے جنوں، دیو اور پریوں کی کہانیاں جو پھولوں میں رہتی تھیں۔ پردار گھوڑے جو بولتے تھے (شاید یہیں سے مجھے بھی کہانی لکھنے کا شوق پیدا ہوا)۔'

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ایک قلم کار کے طور پر عباس کب پیدا ہوئے مگر کرشن چندر سے ایک انٹرویو میں خواجہ احمد عباس نے کہا 'میں پیدائش سے پہلے ہی ایک قلم کار تھا میرا مطلب ہے کہ میں حالی کی شاعری میں پیدا ہوا اور کتابوں اور رسالوں میں پروان چڑھا آپ مجھے ایک کتابی کیڑا بھی کہہ سکتے ہیں۔''

خواجہ احمد عباس نے اپنی فلموں میں ہمیشہ تعلیم یافتہ عورتوں کو پیش کیا ہے۔ فلم شری 420 میں نرگس نہ صرف تعلیم یافتہ ہے بلکہ غریب بچوں کو پڑھاتی بھی ہے۔ دوسری سب سے اہم بات یہ ہے کہ نرگس کے کردار کا نام 'ودیاؔ' ہے جس کے معنی علم ہیں۔ اور اسی فلم میں نادرہ کا نام مایا ہے جس کے معنی فریب دولت ہے۔ ان دونوں ناموں سے ہی دونوں کرداروں کی عکاسی ہو جاتی ہے۔ حالانکہ ودیاؔ ایک سنجیدہ، غریب اور مذہبی لڑکی ہے جو اپنے محبوب کو غلط راستے پر چلنے سے روکتی ہے جب کہ مایا ایک دولت مند، ضدی اور اکھڑ مزاج کی ہے جو شاہانہ طریقے سے زندگی گزارتی ہے۔ عباس نے اس فلم کے مکالمے بھی تحریر کیے۔ وہ ہمیشہ اپنی فلموں میں عورتوں کو جاندار مکالمہ دیتے تھے۔ فلم کا وہ سین جس میں مایا راج کو پاش پاش کرتی ہے یہ دکھاتا ہے کہ عورت کتنی طاقتور ہوتی ہے جو دولت مند بھی ہو۔

خواجہ احمد عباس نے اپنی فلموں میں ہمیشہ تعلیم یافتہ عورتوں کو پیش کیا ہے۔ فلم شری 420 میں نرگس نہ صرف تعلیم یافتہ ہے بلکہ غریب بچوں کو پڑھاتی بھی ہے۔ دوسری سب سے اہم بات یہ ہے کہ نرگس کے کردار کا نام 'ودیاؔ' ہے جس کے معنی علم ہیں۔ اور اسی فلم میں نادرہ کا نام مایا ہے جس کے معنی فریب دولت ہے۔ ان دونوں ناموں سے ہی دونوں کرداروں کی عکاسی ہو جاتی ہے۔

جس طرح خواجہ احمد عباس کی ادبی راہ گزر پر صحافت کا اثر ہے اسی طرح ان کی فلموں پر بھی ان کی صحافت اور ادب کا اثر ہے۔ ان دونوں کے درمیان بہت باریک لکیر ہے۔ خواجہ احمد عباس نے خود یہ مانا ہے 'جب میں کوئی فلم بناتا ہوں تو اس میں میری تحریروں کا اثر ہوتا ہے اور جب میں کچھ تحریر کرتا ہوں تو اپنی فلموں سے متاثر ہوتا ہوں۔' عباس کی پوری شخصیت انہی دونوں کے بیچ ہے۔

خواجہ احمد عباس کے لیے فلم اپنے سماجی نقطہ نظر کو اجاگر کرنے کا ایک ذریعہ ہے انھوں نے کبھی اسے پیسہ کمانے کا ذریعہ نہیں سمجھا۔ انھوں نے اپنی فلموں کو ویسا ہی ایک ذریعہ سمجھا جیسا انھوں نے اپنی صحافت، ناول اور افسانوں کو سمجھا تھا۔

خواجہ احمد عباس اپنی اہلیہ مجتبائی خاتون سے بھی بہت متاثر تھے کیونکہ وہ ان کی پہلی قاری اور ناقد تھیں۔ خواجہ احمد عباس نے نہ صرف اپنی کہانیوں سے کردار پیدا کیے بلکہ ہدایت کار کے طور پر کئی ایوارڈ یافتہ فلمیں بھی دیں۔ بدقسمتی سے ہدایت کار کے طور پر انھیں وہ شہرت نصیب نہ ہوئی جو انھیں ان کی کہانیوں سے ملی۔ حالانکہ ان کی کئی فلمیں قومی اور بین الاقوامی سطح پر نہ صرف سراہی گئیں بلکہ ایوارڈ یافتہ بھی رہیں مگر لوگ ان کی صرف ان کہانیوں کو زیادہ جانتے ہیں جو انھوں نے آر کے بینر کے لیے لکھیں۔

خواجہ احمد عباس کی ایک اور کہانی بحیثیت ہدایت کار سات ہندوستانی بھی ہے۔ یہ فلم دکھاتی ہے کہ کس طرح سات انقلابی گوا کو پرتگالیوں سے آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ ان سات کرداروں میں چھ مرد اور ایک عورت ہے۔ خواجہ احمد عباس نے عورت ماریا کا کردار ان سات ہندوستانیوں

میں انتہائی بے خوف اور نڈر دکھایا ہے، گو کہ وہ پرتگالی ظلم کا شکار ہے مگر پھر بھی وہ گوا کی آزادی کے لیے ثابت قدم ہے۔

یہ فلم اس لیے دیکھنے کے لائق ہے کیونکہ خواجہ احمد عباس نے اس میں مختلف پس منظر اور مختلف تہذیب و تمدن کے افراد کو یکجا کیا ہے جو ایک ساتھ انقلاب میں حصہ لیتے ہیں۔ اس میں خاص طور پر عورت کا کردار مثبت ہے حالانکہ اس فلم میں عورت اور مرد کے بیچ کہیں بھی رومانس نہیں دکھایا گیا مگر پھر بھی ساتوں کے بیچ افلاطونی عشق کا رشتہ ضرور ہے۔ یہی نہیں بلکہ جب ماریا موت سے ہمکنار ہونے لگتی ہے تو وہ اپنے چھ دوستوں کو جو چھ مختلف جگہوں پر ہیں خط لکھتی ہے۔ ماریا کو یقین ہے کہ وہ اس سے ملنے ضرور آئیں گے یہ اور بات ہے کہ وہ جب آئے تو وہ ان کا انتظار کرتے کرتے اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔

ماریا ایک عیسائی لڑکی دکھائی گئی ہے جو جدید لباس اور چھوٹے بالوں کے ساتھ ایک نڈر اور بیباک لڑکی ہے۔ اسے مردانہ خصوصیات کا حامل بھی دکھایا گیا ہے۔ اس نے فلم میں یہ بھی بتایا کہ ایک وقت میں اس کے بال لمبے تھے جنھیں پرتگالیوں نے کاٹ دیا تھا اور اسے جسمانی

تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔خواجہ احمد عباس نے کبھی یہ نہیں دکھایا کہ جنسی تشدد کا شکار ہو جانے کے بعد عورت خودکشی کر لے کیونکہ وہ سماج وادی کے ساتھ ساتھ اشتراکی بھی تھے اس لیے وہ بیباک نڈر اور پرانتقام عورت کا کردار دکھاتے تھے۔

خواجہ احمد عباس مثبت کرداروں کی عکاسی کرتے تھے جو ایک خوش آئند مستقبل کے نقیب ہوں۔ عام طور پر فلم ساز تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے فلم بناتے ہیں مگر خواجہ احمد عباس ہمیشہ عام لوگوں کے لیے فلم بناتے تھے جن میں زیادہ تر غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ ان کی فلموں میں گانے اور ڈانس سین سے مطابقت رکھتے تھے۔خواجہ احمد عباس نے ایک بار کہا:

''کچھ لوگ کہتے ہیں کہ میں بے وقوف ضدی اور اڑیل ہوں میں صلح جو نہیں ہوں، میں جو لوگ چاہتے ہیں اس کے بجائے سماج کی سچائی دکھانے لگ جاتا ہوں۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ جو لوگ چاہتے ہیں وہ دکھاؤ مگر میں مطمئن ہوں کیونکہ یہ میری انا، میری سوچ اور شعور کو تسکین دیتا ہے۔ میں اپنی ہر فلم سے لطف اٹھاتا ہوں۔''

خواجہ احمد عباس کے قلم سے ایک اور مشہور فلم میرا نام جوکر بھی ہے۔ یہ ہندی سنیما کی سنگم کے بعد دوسری فلم تھی جس میں دو انٹرول تھے۔ یہ فلم راجو کی زندگی کے مختلف ادوار پر مبنی ہے۔ اس میں راجو کی زندگی کے تین دور میں تین مختلف عورتیں آئیں جنھوں نے اس کی زندگی اور شخصیت پر اپنا اثر ڈالا۔ پہلی عورت میری جس پر راج فریفتہ ہو جاتا ہے حالانکہ وہ اسے صرف اپنا طالب علم سمجھتی ہے۔ اس نے اسے زندگی کے بہت سارے سبق دیئے اور راج میں خود اعتمادی بھی پیدا کی مگر پھر راج کو اس کی شادی پر اپنے دل کے ٹوٹنے کا تجربہ ہوا جب اسے یہ معلوم ہوا کہ میری نے کسی اور کو جیون ساتھی بنالیا ہے۔

دوسری عورت جو راجو کی زندگی میں آئی وہ روسی سرکس اسٹا میرینا تھی۔ دونوں کے درمیان کچھ مزاحیہ سین بھی ہیں۔ مگر راجو کا دل پھر ٹوٹ گیا جب میرینا اپنا جیمنی سرکس کا ٹور ختم کرکے واپس روس چلی گئی۔

در اصل یہ تین عورتیں تین مختلف شخصیات ہیں جنھیں خواجہ احمد عباس نے دکھایا۔ میری ایک سادہ عورت ہے جو راج کی فریفتگی سے نابلد ہے۔ میرینا ایک خودکفیل جسے زندگی میں کام ہی کرنا ہے اور مینو ایک خود غرض عورت جو مردانہ جذبات سے کھیل کر اپنا مطلب نکالتی ہے۔ خواجہ احمد عباس نے ان تینوں کرداروں کو حقیقی زندگی کے کردار کے طور پر اس طرح پیش کیا ہے کہ تینوں کرداروں کی صحیح عکاسی ہو جاتی ہے۔ یہ خواجہ احمد عباس کی ہی خصوصیت ہے کہ انھوں نے زندہ کرداروں کی عکاسی کی اور دیکھنے والوں کو حقیقت سے روشناس کرایا۔

خواجہ احمد عباس ایک ناقد بھی تھے۔ ہدایت کار بننے کے بعد وہ دوسری فلموں کو ناقدانہ نظر سے دیکھتے تھے لہٰذا وہ تنقید سے گھبراتے نہیں تھے۔ایک بار کسی نے ان سے پوچھا تو انھوں نے کہا:

''تقریباً سب بھاری بھرکم نقاد اس پر متفق ہیں کہ میں ادیب نہیں اخبار نویس ہوں اور میرے افسانوں میں صحافتی انداز جھلکتا ہے۔ یہ بھی آپ نے سنا ہوگا کہ میں اعلیٰ ادب تخلیق کرنے کے بجائے اخباروں میں پڑھی پڑھائی خبروں کو افسانوی رنگ دے کر افسانے کے نام سے چھپوادیتا ہوں۔''

انھوں نے یہ بھی کہا:

''ادیب اور نقاد کہتے ہیں خواجہ احمد عباس ناول یا افسانہ نہیں لکھتا وہ محض صحافی ہے ادب کی کی تخلیق اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ فلم والے کہتے ہیں اس کے فیچر فلم بھی محض ڈاکومینٹری ہوتے ہیں وہ کیمرے کی مدد سے صحافت کرتا ہے، آرٹ کی تخلیق نہیں... اور جو مجھے کہنا ہے وہ صرف یہ ہی کہ انسان کی اندرونی زندگی اس کے ذاتی مسائل اور اس کی بیرونی، سماجی اور اقتصادی زندگی میں ایک گہرا تعلق اور رشتہ ہے جو کچھ دنیا میں اس کے اپنے ملک اور اس کے سماج میں ہوتا ہے اس کا اثر اس کے اپنے کردار اور اس کے افعال پر پڑتا ہے۔ جیسے جیسے دنیا، سماج، ملک کا اقتصادی، سیاسی اور سماجی نظام بدلتا جاتا ہے اسی طرح انسان بھی بدلتے رہتے ہیں۔''

(خواجہ احمد عباس نمبر، ایوانِ اردو، دہلی دسمبر 1987، ص 66)

خواجہ احمد عباس کی ایک اور یادگار فلم بابی ہے جس کی کہانی اور منظر نامہ انھوں نے تحریر کیا تھا۔ اس فلم میں ہندوستانی فلمی دنیا میں 'ٹین ایج' کے پیار کی ابتدا کی۔ حالانکہ اس میں ایک دولت مند اور غریب خاندان کے بیچ کا ٹکراؤ ہے جو بہت ساری ہندی فلموں میں فلمایا گیا ہے مگر فلم کی ہیروئن بابی کا مرکزی کردار بہت عمدگی سے دکھلایا گیا ہے جو نوعمر، اسمارٹ اور راج سے زیادہ خود اعتماد ہے۔ وہ راج کے پیار میں انتہا پسندی کی حد تک چلی جاتی ہے جب کہ وہ جانتی ہے کہ راج کے والدین اس کے خلاف ہیں۔ بابی ایک خوبصورت غریب لڑکی جو ایک مالدار لڑکے راج کے پیار میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ وہ اتنی پراعتماد ہے کہ جب اس کا باپ اسے راج سے شادی کرنے سے منع کرتا ہے تو وہ اسے نہیں مانتی۔ وہ ایک مضبوط ارادے کی لڑکی ہے جو اپنا مستقبل خود بنانا چاہتی ہے۔ خواجہ احمد عباس نے نہ صرف بابی کو ایک مضبوط خود اعتمادی سے بھرپور لڑکی دکھایا ہے بلکہ بیسویں صدی کی نئی لڑکی کا تصور بھی پیش کیا ہے جو اپنی تقدیر خود لکھنا چاہتی ہے۔ بابی فلم 1973 میں ریلیز ہوئی اور اس سے پہلے اس طرح کی لڑکی کی کسی فلم میں عکاسی نہیں کی گئی تھی لہٰذا بعد میں یہ ایک مثال بن گئی۔

ان تمام فلموں کے سامنے آنے پر ہر کردار کا نازک پہلو بھی ظاہر ہوتا ہے جو خواجہ احمد عباس کے قلم سے نکلا ہے۔ حالانکہ انھوں نے بہت سی کہانیاں تحریر کیں۔ جس میں متعدد اور عورتوں کے کردار رہے لیکن پھر بھی لوگ ہر کردار کو ایک دوسرے سے الگ دیکھتے ہیں۔ ان میں کچھ خوبصورت ہیں، کچھ نوعمر ہیں، اور کچھ بوڑھے بھی مگر ہر کردار کی اپنی انفرادیت ہے۔

خواجہ احمد عباس کا مطالعہ وسیع تھا، وہ اکثر جان ڈان کا یہ قول دہراتے تھے کہ:

''کوئی انسان جزیرہ نہیں ہے
ہر انسان سمندر میں ایک قطرہ ہے
ہر انسان زمین کا ایک ذرہ ہے
ہر انسان کی موت میری موت ہے کیونکہ
میں اور انسانیت جدا نہیں ہیں''

خواجہ احمد عباس نے بلٹز کے ایک کالم میں تحریر کیا 'میں نے بحیثیت فلم ساز جو فلمیں دیں انھیں دیکھو اور مجھ سے مل لو' انھوں نے یہ بھی کہا:

''میں کمرشیل فلمیں نہیں بناتا۔ میرا ایک آئیڈیل ہے، ایک مقصد ہے۔ میں فلم پیسے کمانے کے لیے بھی نہیں بناتا۔ سنیما سیمنٹ یا فولاد کی انڈسٹری نہیں ہے۔ اس کا مقصد ہے عوام کے احساس کو جگانا، ان کے دماغوں کو جھنجھوڑنا اور ان کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی جھلک دکھانا تاکہ ان کو اپنی موجودہ زندگی کی محرومیوں اور ناانصافیوں سے نفرت ہو جائے اور وہ ان کو بدل سکیں''

خواجہ احمد عباس کی فلمی کہانیوں کے کردار ہندوستانی معاشرے کے کردار ہیں جن میں ہر مذہب اور ہر ملت کے افراد شامل ہیں۔ ان کے کردار جامد اور ٹھہرے ہوئے کردار نہیں ہیں بلکہ ایسے کردار ہیں جو حالات کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

اپنی پوری زندگی مصروفیتوں میں گزارنے والا یہ شخص بالآخر یکم جون 1987 کو ممبئی میں ابدی نیند سو گیا۔

■

Meraj Ahmad
Asst. Prof., Dept of Mass Communication
and Journalism, MANUU
Hyderabad- 500032 (Telangana)
Mob.: 7500496666

محمد علوی کی شاعری کی مخصوص لفظیات

شفا مریم

محمد علوی جدید اردو غزل اور نظم میں ایک منفرد مقام و مرتبہ کے مالک ہیں۔ زندگی کو ایک خاص انداز سے دیکھنا اور سادہ اسلوب میں اپنے دلی جذبات کی ترجمانی کرنا ان کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ جدید شاعری کی امتیازی شناخت شعرا کا لفظیات اور اسلوب پر زور دینا ہے جو انھیں اپنے ماقبل کی شعری روایت سے انفرادیت عطا کرتا ہے جدید شاعری میں تجربے پر زور دیا گیا نئی شعری تراکیب، نئے استعارے اور نئی علامتیں وضع کرنے پر اصرار کیا گیا اسی وجہ سے زبان کا مخصوص استعمال ہی جدید شعری رجحان کے طور پر سامنے آیا اور موضوع کو ثانوی حیثیت حاصل رہی جدید شعری جمالیات میں جدلیاتی الفاظ اور ایہام کو بنیادی اہمیت دی گئی جدلیاتی الفاظ سے شمس الرحمٰن فاروقی تشبیہ، استعارہ، پیکر اور علامت مراد لیتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ:

''فنی تخلیق، حقیقت کی تخلیق نو ہے فن پارہ قائم بالذات ہوتا ہے اور اس میں لفظ و معنی کی وحدت ہوتی ہے ان تین تصورات کی تکمیل شعری جمالیات کے چوتھے اصول سے ہوتی ہے کہ یہ تین باتیں اسی وقت قائم ہوتی ہیں جب فنکار اپنی بصیرت کے اظہار کے لیے علامت، استعارہ، پیکر اور دوسرے جدلیاتی نوعیت کے الفاظ کا استعمال کرتا ہے۔'' (جدید شعری جمالیات: شمس الرحمٰن فاروقی ص 60)

جدید شاعری میں کلاسکی شاعری کے برخلاف شعرا کے یہاں اسلوب اور طرز اظہار میں فرق ملتا ہے جہاں انھوں نے تجربے سے کام لیا، زبان کا تخلیقی استعمال کیا اور ذاتی تجربات کو شاعری میں نظم کیا۔ جدید شعرا میں یوں تو سب کی شاعری میں زبان و بیان کی سطح پر شکست و ریخت کی کیفیت ملتی ہے لیکن ظفر اقبال اور عادل منصوری کے یہاں زبان و بیان کی سطح پر انحراف کی صورتیں کثرت سے نظر آتی ہیں۔

جدید شاعری میں نئے استعارے اور نئے علائم وضع کرنے پر اصرار کے سبب نئی لفظیات بکثرت دیکھنے کو ملتی ہیں اسی وجہ سے جدید شاعری میں زبان کا انفرادی استعمال نظر آتا ہے۔ محمد علوی کی شاعری میں بھی کچھ مخصوص لفظیات کا استعمال ملتا ہے جس سے ان کی انفرادیت مستحکم ہوتی ہے ان کا اسلوب سادہ، لہجہ عام ہے کہیں وہ بے ساختگی اور گفتگو کے انداز میں اپنی بات کہہ جاتے ہیں اور کہیں خود کلامی اور حیرت و استعجاب کو بروئے کار لاتے ہیں۔ جدید شاعری میں لفظیات اور اسلوبیات کے تجربات کی وجہ سے شعرا نے زبان کے ساتھ بہت تبدیلیاں کیں جس سے لسانی شکست و ریخت کی بہت سی مثالیں اس دور کی شاعری میں نظر آتی ہیں اور لسانی شکست و ریخت اور لفظیات کی سطح پر تجربات اتنے بڑھے کہ کہیں کہیں صرف زبانی کرتب بازی کو ہی شاعری سمجھا جانے لگا لیکن محمد علوی جدید شاعری کو صرف اسلوبیاتی تجربات کا ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ فکر و فن دونوں سطحوں پر تخلیقی صحتمندی کی اہمیت کے قائل نظر آتے ہیں وہ صرف الفاظ کے ذریعے جدید شاعری کرنے والوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔

عجب انجان لفظوں سے بھری ہے
لغت ہے یا ہماری شاعری ہے
کیوں سر کھپا رہے ہو مضامیں کی کھوج میں
کر لو جدید شاعری لفظوں کو جوڑ کر
علوی غزل تو کہنے چلے ہو نئی مگر
رکھ دو نہ تم خیال کے بخیے ادھیڑ کر

اور کہیں جدید شاعری کی حد درجہ بڑھی ہوئی مہملیت، زبانی کرتب بازی اور صرف ایہام کو شاعری خیال کرنے والوں پر بھی طنز کرتے نظر آتے ہیں۔

نئی نظم علوی اشاروں میں تھی
اشارے بھی حد درجہ موہوم تھے
سننے والوں کا کچھ قصور نہیں
نیا شاعر بچارہ ہکلا ہے
ارے یہ شاعری ہے
یہ کیسی دھاندلی ہے

محمد علوی کی شاعری میں بھی زبان کا استعمال اور پیش کش کا منفرد انداز انھیں دیگر جدید شعرا میں ممتاز کرتا ہے۔ انھوں نے اپنے لہجے کی سادگی اور تحیر کی کیفیت سے ایک انوکھا اسلوب پیدا کیا ہے اور اسی سادگی سے اپنی شاعری میں کامیاب تجربات کا اظہار کیا ہے جو انھی کا خاصہ ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اتار پھینکوں بدن سے پھٹی پرانی قمیض
بدن قمیض سے بڑھ کر کٹا پھٹا دیکھوں
چاند ہی چاند یہاں سے گزرے
یہ سڑک پھر بھی سیاہ فام رہی
بہت ہی لال پیلے ہو رہے ہیں
صبا پھولوں سے جانے کہہ گئی کیا

محمد علوی کی شاعری کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ ان کی شاعری جو بظاہر سہل اور آسان نظر آتی ہے اتنی آسان نہیں ہوتی بلکہ شاعر عام توقعات کی تقلیب کر دیتا ہے اور یہی محمد علوی کا مزاج ہے کہ پہلے کسی عام سے بیان کو نظم کرتے ہیں اور پھر کسی غیر متوقع بیان سے پوری کیفیت کو ہی بدل دیتے ہیں یہی باطنی احساس کا وہ رخ ہے جو عموماً نظروں سے اوجھل رہتا ہے اور یہی وہ احساس ہے جو سامنے کی بات میں گہرائی پیدا کر دیتا ہے جس سے ایک انوکھی اور حیرت و استعجاب کی کیفیت نمایاں ہوتی ہے جسے گوپی چند نارنگ نے احساس کے دوسرے پن سے عبارت کیا ہے مثال کے طور ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اور بازار سے کیا لے جاؤں
پہلی بارش کا مزہ لے جاؤں
کچھ تو سوغات دوں گھر والوں کو
رات آنکھوں میں بسا لے جاؤں
گھر میں ساماں تو ہو دلچسپی کا
حادثہ کوئی اٹھا لے جاؤں

مذکورہ غزل میں بات عام بیان سے شروع ہوکر غیر متوقع بیان پر مکمل ہوتی ہے بازار سے کچھ گھر لے جانا عام طور پر ہوتا ہے لیکن پہلی بارش کا مزہ لے جانا عمومی بیان نہیں ہے یہ ایک غیر متوقع بیان ہے سوغات میں کسی شے کو دینے کا

تصور رائج رہا ہے لیکن رات آنکھوں میں بطور سوغات بسا لے جانا عام بیان نہیں ہے اور اگلے شعر میں دلچسپی کے سامان کے لیے حادثہ اٹھا لے جانا انتہائی غیر متوقع صورت حال کا بیان ہے جسے محمد علوی نے سادگی سے شعر میں بیان کر دیا ہے اور یہ انداز بیان ان کی شاعری میں عام طور پر ملتا ہے جہاں وہ منطقی توقعات کو پلٹ کر قاری کو انوکھی کیفیت سے دوچار کرتے ہیں ان کی اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گوپی چند نارنگ نے کیا بصیرت افروز بات کہی ہے:

''محمد علوی کا شعری عمل زبان کی عمومی منطقی توقعات کو پلٹنے کا ہے یہاں منطقی بخیہ ادھڑنے لگتا ہے اور معنی کا شرارہ کسی انوکھی لذت کے ساتھ جلنے بجھنے لگتا ہے۔''

(محمد علوی اور احساس کا دوسرا پن: گوپی چند نارنگ ص 34)

جدیدیت میں نئے مسائل جیسے تنہائی، اجنبیت، بے گھری، خوابوں کی شکست وغیرہ موضوعات کے اظہار کے لیے جدید شعرا نے فطرت کا مطالعہ کیا اور فطرت سے الفاظ اخذ کیے جیسے سورج، جنگل، پھول، پرندے، پیڑ، پتھر، ریت وغیرہ جنھوں نے جدید شاعری میں علامتی حیثیت اختیار کر لی اور اس طرح جدید شعری زبان جدید لفظیات کے ساتھ سامنے آئی جو فطرت اور روزمرہ سے قریب تھی۔

محمد علوی کی شاعری میں بھی اپنے عہد کے مسائل کا اظہار کچھ مخصوص لفظیات کے ذریعے ہوا ہے جس میں پرندہ، جنگل، سمندر، گھر، خواب، پتھر، رات، موت، دھوپ وغیرہ اہم ہیں مثلاً پرندے کا استعمال ان کی شاعری میں اکثر ہوا ہے اور ہر جگہ پرندہ الگ معنویت کے ساتھ سامنے آیا ہے مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیے۔

پرندے اڑے پھڑ پھڑاتے ہوئے
بہت شور اٹھا رات جاتے ہوئے

پرندہ عموماً شاعری میں آزادی، بلندی اور پرواز کی علامت بن کر آتا ہے اور کہیں زندگی میں حوصلے کی علامت بن کر۔ یہ جدید شاعری کا ایک اہم لفظ ہے مذکورہ شعر میں پرندے کا پھڑ پھڑاتے ہوئے اڑنا یا رخصت ہونا زندگی کی معصومیت کے خاتمے یا جدائی کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے لفظ پھڑ پھڑانے سے سمعی، حرکی، حسی اور بصری پیکر بیک وقت محسوس ہوتے ہیں۔

دور تک بیکار سی اک دوپہر
اک پرندہ بے سبب اڑتا ہوا

یہاں پرندہ مایوسی کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔

اک پرندہ سنا رہا تھا غزل
چار چھ پیڑ مل کے سنتے تھے

مذکورہ شعر میں پرندہ گاؤں کی زندگی یا فطرت کی خوبصورتی کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے۔

پرندے دور فضاؤں میں کھو گئے علوی
اجاڑ اجاڑ درختوں پہ آشیانے تھے

اس شعر میں پرندہ زندگی کی معصومیت کے خاتمے اور شہری زندگی کے عذاب کی طرف اشارہ کرتا ہے کلاسیکی غزل میں پرندوں میں قمری و بلبل اور پروانے کا ذکر ہی زیادہ ملتا تھا جدید غزل میں ہر طرح کے پرندے نظر آتے ہیں کیونکہ یہاں شعرا کو کھلی فضا میسر آئی تاکہ ہر طرح کے تجربات اور لفظیات غزل کے دامن میں شامل ہوسکیں۔

پرندے کے علاوہ لفظ جنگل محمد علوی کی فرہنگ شاعری کا ایک اہم لفظ ہے جو ان کی شاعری میں بکثرت استعمال ہوا ہے کہیں ماضی کی علامت بن کر اور کہیں سکون کے حصول کا ذریعہ بن کر۔ جدید شاعری میں جنگل لغوی اور علامتی دونوں معنی میں نظر آتا ہے لیکن زیادہ تر علامتی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے نئے مسائل اور پریشانیوں سے تنگ آ کر انسان کھلی فضا میں سانس لینے کی خواہش کرتا ہے اور جنگل میں اسے یہ سکون میسر آتا ہے۔ محمد علوی کے یہاں جنگل کا استعمال ان کی نظموں اور غزلوں دونوں میں ملتا ہے مثال کے طور پر یہ غزل ملاحظہ ہو۔

روشنی کچھ تو ملے جنگل میں
آگ لگ جائے گھنے جنگل میں
آپ کو شہر سے ڈر لگتا ہے
ہم تو بے خوف رہے جنگل میں
ایک اک شاخ زباں ہو جائے
کوئی آواز تو دے جنگل میں
پیڑ سے پیڑ لگا رہتا ہے
پیار ہوتا ہے گھنے جنگل میں
خوب تھے حضرت آدم علوی
بستیاں چھوڑ گئے جنگل میں

مذکورہ غزل میں جنگل شہر کے برعکس معنی میں استعمال ہوا ہے انسان جدید معاشرے میں خود کو تنہا محسوس کرتا ہے اور کسی کو اپنا ہمدرد نہیں پاتا تو خود کو سکون پہنچانے کے لیے وہ جنگل کی طرف رخ کرتا ہے کیونکہ جنگل میں محبت اور پیار ملتا ہے وہاں ایک دوسرے کے لیے دلوں میں ہمدردی ہوتی ہے 'پیڑ سے پیڑ لگا رہتا ہے' اور یہی محبت انسان کو درکار ہے اسی وجہ سے لفظ جنگل کا استعمال جدید شاعری میں کثرت سے ملتا ہے جنگل علوی کے خوابوں کی دنیا ہے چند اشعار اور ملاحظہ فرمائیے۔

جنگلوں میں بھی راہ جاتی ہے
شہر میں کیوں پھرا کرے کوئی

جی کھول کے پیڑوں نے لٹائے پتے
خیرات ہی خیرات ہوئی جنگل میں

دن ڈوب گیا رات ہوئی جنگل میں
اپنے سے ملاقات ہوئی جنگل میں

غزلوں کے اشعار کے علاوہ ان کی نظموں میں بھی یہ تصور نظر آتا ہے ان کی نظم 'جدائی کا غم' ان کے خوابوں اور تمناؤں کے خوف کو ظاہر کرتی ہے۔

گھنے جنگلوں میں / درختوں کی شاخوں پہ/ بیٹھے ہوئے/ آدمی کی شباہت کے/ بندر کی آنکھوں میں/ (چڑی ہوئی/ ادھ کھلی، سرد آنکھوں میں)/غم یوں جھلکتا ہے، جیسے/ ابھی اس کے ساتھی/ ذرا دیر پہلے/ اسے چھوڑ کر دور... / جنگل کے اس پار/ سرسبز و شاداب/ میدان میں جا بسے ہیں!!

مذکورہ نظم میں جدید عہد کے اہم موضوع شہری زندگی اور اس کے متعلقات کو نظم کیا گیا ہے جہاں جدائی کا احساس حاوی ہے لیکن سردست شہری زندگی کی طرف ہجرت اور جنگل چھوٹ جانے کی تکلیف کا احساس بھی ہوتا ہے۔

'گھر' کا لفظ جدید شاعری میں ایک اہم علامت کے طور پر سامنے آتا ہے تقریباً ہر جدید شاعر کے یہاں اس کا استعمال نظر آتا ہے گھر سے وابستگی، گھر کی روایات، گھر کی رسومات، بے گھری، ہجرت، گھر کی یاد وغیرہ موضوعات کے تحت 'گھر' جدید شاعری میں اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ شاعری میں گھر کے لفظ کے ذکر کے بغیر محمد علوی کی لفظیات کا احاطہ مکمل نہیں ہوسکتا ان کے یہاں 'گھر' کا لفظ علامت کی حیثیت اختیار کر گیا ہے جو ان کی شاعری میں اکثر و بیشتر نظر آتا ہے۔ گھر وہ ہے جس سے تحفظ کا احساس وابستہ ہوتا ہے جدید عہد میں گاؤں سے شہروں کی طرف ہجرت نے انسان کے اندر بے گھری کا احساس پیدا کیا وہ اپنا گھر چھوڑ کر شہر کی طرف ہجرت کرتا ہے تو بے گھری اس کا مقدر ہوتی ہے۔ محمد علوی کے یہاں گھر اور اس کے متعلقات کا استعمال اتنا زیادہ ہے کہ ان کے پہلے مجموعے کا نام ہی 'خالی مکان' ہے اور اس کی پہلی نظم سے ہی مجموعے کا نام اخذ کیا گیا ہے نظم ملاحظہ ہو۔

جالے تنے ہوئے ہیں، گھر میں کوئی نہیں
'کوئی نہیں' اک اک کونا چلاتا ہے
دیواریں اٹھ کر کہتی ہیں کوئی نہیں
'کوئی نہیں' دروازہ شور مچاتا ہے
کوئی نہیں اس گھر میں کوئی نہیں لیکن
کوئی مجھے اس گھر میں روز بلاتا ہے
روز یہاں میں آتا ہوں ہر روز کوئی
میرے کان میں چپکے سے کہہ جاتا ہے
''کوئی نہیں اس گھر میں کوئی نہیں پگلے
کس سے ملنے روز یہاں تو آتا ہے''

یا 'ایک نظم' کے عنوان سے ان کی یہ نظم ملاحظہ ہو جس میں اداسی کا احساس نمایاں ہے۔

آج یہ گھر کتنا سونا ہے/ یوں لگتا ہے جیسے کوئی/ اس گھر کے سارے ہنگامے/ جاتے جاتے توڑ گیا ہے/ اور اپنی زہریلی یادیں/ سارے گھر میں چھوڑ گیا ہے

گھر سے بے گھری کا احساس بھی ان کی شاعری میں شدت اختیار کر گیا ہے کیونکہ ان کا تعلق سر زمین گجرات کے شہر احمد آباد سے ہے جہاں فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجے میں بے گھری ان کا ذاتی تجربہ ہے اسی وجہ سے اس تجربے کا اظہار ان کے یہاں شدت اختیار کر گیا ہے مثلا یہ اشعار دیکھیے۔

ابھی میں اپنے گھر میں سو رہا تھا
ابھی میں گھر سے بے گھر ہو گیا ہوں
میں اپنے آپ سے ڈرنے لگا تھا
گلی کا شور گھر میں آ گیا تھا
گھر سے باہر کس بلا کا شور تھا
میرے گھر میں جیسے میں خود چور تھا
اوروں کے گھر جلا کے قیامت نہ کر سکا
گھر میرا جل گیا میں شکایت نہ کر سکا

مذکورہ تجربات کی وجہ سے گھر ان کی شاعری میں کلیدی حیثیت اختیار کر گیا ہے مغنی تبسم لکھتے ہیں کہ

''گھر' اپنے تکرر کی وجہ سے محمد علوی کی فرہنگ غزل کا ایک مانوس اور مخصوص جز بن گیا ہے اور جس شعر میں بھی استعمال ہوا ہے بالعموم کلیدی لفظ بن کر آیا ہے''

(محمد علوی: گھر اور جدید غزل، مغنی تبسم ص 106)

بے گھری اور عدم تحفظ کے احساس کی وجہ سے کہیں کہیں وہ مایوس نظر آتے ہیں۔

مجھے یہ دکھ کہ میں نے یہ گھر بنایا کیوں
یہ گھر ہے آگ کی لپیٹوں میں اور میں گھر میں ہوں

جدید شاعری میں بے حسی، لاتعلقی اور بیزاری کو ظاہر کرنے کے لیے پتھر، دیوار، دھوپ اور سمندر جیسی لفظیات کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

ہم سے جو آگے گئے وہ کتنے مہرباں تھے
دور تلک راہ میں ایک بھی پتھر نہ تھا

پتھر جدید شاعری میں رکاوٹ اور بے حسی کی علامت کے طور پر ملتا ہے۔ مذکورہ شعر میں حسرت ہے کہ اسلاف خوش قسمت تھے کہ انھیں وہ سختیاں نہیں جھیلنا پڑیں جو جدید عہد کا مقدر ہیں۔

چلتے چلتے پاؤں پتھر ہو گئے
ہم تو رستے کا مقدر ہو گئے

یہاں بھی سفر کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ملتا ہے جہاں ایک کے بعد ایک رستہ ہے اور منزل کا کہیں پتہ نہیں۔ ان سختیوں اور مصائب کے لیے لفظ دھوپ کا استعمال بھی تقریباً اسی مفہوم میں ملتا ہے۔

سفر میں سوچتے رہتے ہیں کہ چھاؤں آئے کہیں
یہ دھوپ سارا سمندر ہی پی نہ جائے کہیں

یہاں بھی سفر، دھوپ، سمندر جیسے الفاظ کے ذریعے لا متناہی پریشانیوں کا بیان ہے۔

درختوں نے رستے میں روکا بہت
رہا دھوپ کا سلسلہ دور تک

'دھوپ' نظم میں عمدہ تمثیل نگاری نظر آتی ہے۔

اجلی اجلی دھوپ آنگن میں در آئی
ہلکے ہلکے قدموں سے دہلیز چڑھی
ڈرتے ڈرتے دروازے میں پاؤں دھرا
گھر میں گھور اندھیرے کو بیٹھے دیکھا
شرمائی، جھجکی، گھبرائی، لوٹ گئی !

لفظ دھوپ میں چھوٹی بحر کے کچھ اشعار بہت خوبصورتی سے نظم کیے گئے ہیں مثلاً

دھوپ میں شجر چمکے تتلیوں کے پر چمکے
دھوپ نے گزارش کی ایک بوند بارش کی

چھوٹی بحروں میں اکثر ان کی غزلیں نظر آتی ہیں جہاں وہ اپنی بات سادگی سے کہہ جاتے ہیں لیکن طرز اظہار چونکنے پر مجبور کر دیتا ہے دھوپ میں تتلیوں کے پر چمکنا اور دھوپ کا خود بارش کی خواہش کرنا عام لیکن خوش کن کیفیت سے دوچار کرتا ہے۔

جدید عہد میں جہاں انسان مشینی زندگی کا عادی ہو گیا ہے جس کی وجہ سے بے حسی عام طور پر نظر آتی ہے جس کا اظہار محمد علوی کی شاعری میں جہاں دھوپ، سمندر، اندھیرا کے ساتھ ساتھ لفظ دیوار کی علامت کے ذریعے بھی ہوا ہے مثلاً

یہ دیواریں بھی اب گرنے لگی ہیں
یہاں بھی وقت کا سایہ پڑا ہے

مذکورہ شعر میں دیواریں اسلاف کی یادیں، نشانیاں اور پرانی یادداشت کا حصہ ہیں جو اب بوسیدہ ہو چکی ہیں اور وقت نے انھیں بے وقعت کر دیا ہے جدید عہد میں انتشار کی کیفیت کے اظہار کے لیے شعرا نے لفظ ریت کا استعمال عام طور پر کیا ہے محمد علوی کے یہاں بھی ذات کے بکھراؤ اور انتشار کو بیان کرنے کے لیے ریت کو بطور علامت استعمال کیا گیا ہے ان کی نظم 'ریت' مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔

سکون ریت کا/ ایک ذرہ ہے/ جو ریت نے کھا لیا ہے/ اسے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرو/ اونٹ پر/ اپنی تنہائیاں لاد کر/ یا برہنہ/ دہکتے ہوئے ریگ زاروں میں/ بھٹکا کرو/ اور سرابوں کو دیکھو/ تو آنکھیں چرا لو/ کہ سب ریت ہی ریت ہے/ ریت ہے/ ریت

جن الفاظ کا ذکر کیا گیا ان کے علاوہ بھی کچھ لفظ محمد علوی کی فرہنگ شاعری کا حصہ رہے ہیں مثلا دریا، پانی، ساحل، بارش، برسات، بادل، کنواں، دشت، صحرا، خرابہ، ہوا، شور، گاؤں، کھیت، پگڈنڈی، آئینہ، چھت، دروازہ، دریچہ، آہٹ، آگ، دھواں، آسمان، سورج، صبح، دوپہر، شام، حادثہ وغیرہ الفاظ کا استعمال استعاراتی اور علامتی انداز میں اکثر ملتا ہے۔

مذکورہ لفظیات کے علاوہ کچھ ایسے الفاظ کا استعمال بھی ان کی شاعری میں نظر آتا ہے جو شاعری کا معیار تصور نہیں کیا جاتا اور غزل کے مزاج کے منافی سمجھا جاتا ہے ان کی شاعری میں نظر آتا ہے مثال کے لیے ان کی یہ مشہور غزل ملاحظہ ہو۔

ہر اک جھونکا نکیلا ہو گیا ہے
فضا کا رنگ نیلا ہو گیا ہے
ابھی دو چار ہی بوندیں گری ہیں
مگر موسم نشیلا ہو گیا ہے
کریں کیا دل اسی کو مانگتا ہے
یہ سالا بھی ہٹیلا ہو گیا ہے
خبر کیا تھی کہ نیکی بانجھ ہوگی
بدی کا تو قبیلہ ہو گیا ہے

مذکورہ غزل میں محمد علوی نے نکیلا، نشیلا، ہٹیلا جیسے الفاظ کا استعمال بلا تکلف کیا ہے اس طرح کے الفاظ عموما شاعری میں مستعمل نہیں ہوتے ہیں۔

الغرض محمد علوی کی شاعری میں جدید لفظیات کا استعمال منفرد انداز میں نظر آتا ہے وہ شاعری کو صرف لفاظی کا ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ فکر وفن دونوں سطحوں پر شاعری کی صحتمندی کے قائل نظر آتے ہیں ان کا انداز بیان چونکا دینے والا ہے وہ عمومی بیان کو اپنی تخلیقی صلاحیت سے اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ وہ نئ معلوم ہونے لگتی ہیں اور اس کے لیے وہ لسانی تجربات سے نہیں گھبراتے۔ انھوں نے پرندہ، جنگل، گھر، سمندر، ریت، دیوار، پتھر، خواب، موت، دھوپ جیسی لفظیات کو اپنے انداز میں استعمال کر کے جدید شاعری میں قابل قدر اضافہ کیا ہے تجربہ اور بے ساختہ لہجہ ان کی شناخت ہے جو انھیں جدید شعرا میں ممتاز حیثیت عطا کرتا ہے۔

■

Shifa Maryam
Research Scholar, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001 (UP)
Mob.:8865831287

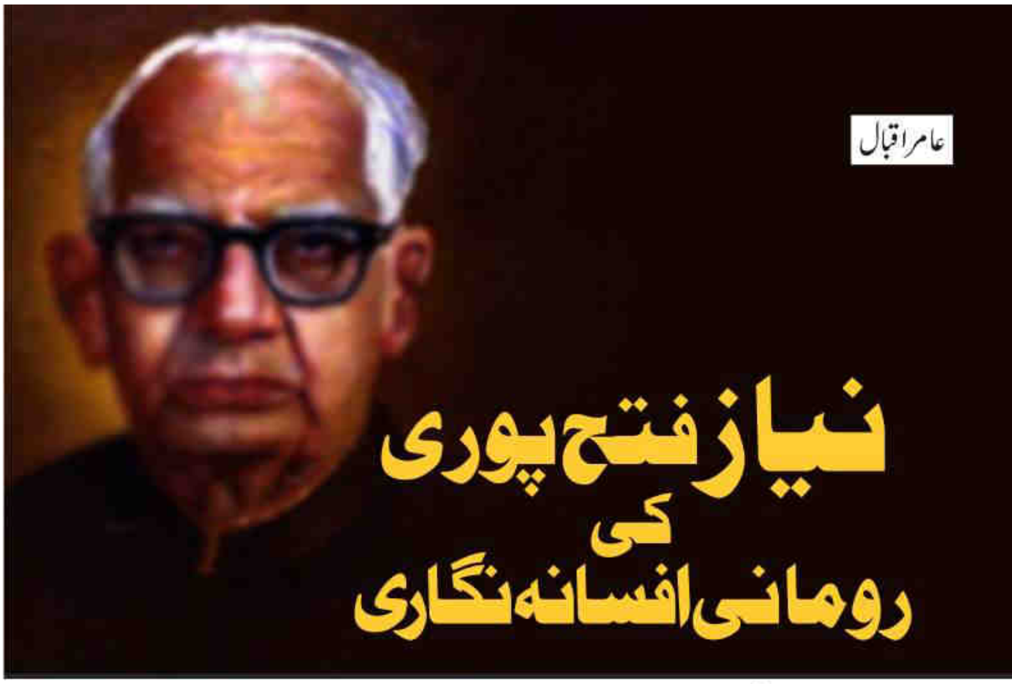

عامر اقبال

نیاز فتح پوری کی رومانی افسانہ نگاری

نیاز فتح پوری (1884-1966) کا شمار ان فنکاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے خون جگر سے گلشن ادب کی آبیاری کی۔ وہ مختلف الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی علمی خدمات بہت وسیع ہیں۔ انھوں نے ادب کی مختلف اصناف میں اپنی یادگار تحریریں چھوڑی ہیں اور ایک عہد کو متاثر کیا ہے۔ نیاز فتح پوری نے اپنی تحریروں کے ذریعے زبان کو ایسا حسن اور ایسی لطافت بخشی کہ نثر میں بھی نظم کی شیرینی محسوس ہونے لگی۔ ان کی سحر انگیز تحریریں قاری کے ذہن کو فوراً اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ نیاز فتح پوری کی تحریروں میں ان کے قلب کی نرمی اور جذبات کی گرمی دونوں بیک وقت نمایاں ہوتی ہیں۔ نیاز فتح پوری نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا لیکن جلد ہی وہ انشائے لطیف اور افسانہ نگاری کی طرف مائل ہو گئے۔ انھوں نے ادبی، تنقیدی، سماجی، سیاسی، علمی اور مذہبی موضوعات پر مضامین بھی لکھے جو غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ نیاز فتح پوری کی فطرت بڑی متجسس تھی۔ ان کا تحقیقی ذہن سطحی ادب سے کوئی تاثر قبول نہیں کرتا تھا۔ انھوں نے تنقید نگاری کے ضمن میں بھی ایک الگ راہ نکالی۔ ان کا تنقیدی زاویہ فلسفیانہ اساس پر مبنی ہے۔ تنقید کے ساتھ ساتھ نیاز فتح پوری نے اور بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ انھوں نے اپنی گراں مایہ تخلیق سے اردو افسانوی ادب کو گراں بار کیا۔ نیاز فتح پوری کے افسانے زندگی سے متعلق ہیں اور زندگی کے تمام حسین اور جمالیاتی پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں۔

اردو کے افسانوی ادب میں رومانی رجحانات کے تحت افسانہ لکھنے والوں میں نیاز فتح پوری کا نام امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ وہ اردو کے ابتدائی رومانی افسانہ نگاروں میں سے تھے۔ ان کا اولین مطبوعہ افسانہ 'ایک پارسی دوشیزہ کو دیکھ کر' ہے جو 'تمدن' دہلی، جنوری 1913 میں شائع ہوا۔

(مرزا حامد بیگ، 'اردو افسانے کی روایت' ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2014، ص 343)

نگارستان، جمالستان، نقاب اٹھ جانے کے بعد، حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے وغیرہ ان کے ناقابل فراموش افسانوی مجموعے ہیں۔ نیاز فتح پوری کی تحریروں میں جوش اور بیان کا ایسا پرکشش سلیقہ ملتا ہے جس کے ذریعے ان کی تحریریں اور تراکیب لفظی خوبصورت ترین ہو جاتی ہیں۔ انھوں نے متعدد جذبات و کیفیات کو اپنے دلکش انداز میں پیش کیا ہے کہ ذہن تھوڑی دیر کے لیے مسحور ہو جاتا ہے۔ نیاز فتح پوری کے افسانوں کا موضوع حسن و عشق ہے جس میں شاعرانہ رنگینی بھی پائی جاتی ہیں اور جس کا اسلوب بیان بھی بہت سحر انگیز ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''نیاز کے افسانے دراصل اس دور کی تخلیق ہیں جسے اردو میں نثر لطیف کی تحریر کا دور کہا جاتا ہے۔ اس میں عورت، حسن اور رومانی انداز فکر کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ میر ناصر علی، سجاد حیدر یلدرم اور مہدی افادی نے اس رنگ کو ایسا جاذب نظر بنا دیا تھا کہ نوجوان ادیب اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ نیاز تو طبعاً رومان پرست تھے بہت جلد اس گروہ میں شامل ہو گئے اور دیکھتے دیکھتے ممتاز مقام پیدا کر لیا۔''

(ڈاکٹر فرمان فتح پوری، 'اردو افسانہ اور افسانہ نگار'، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1982، ص 27)

نیاز فتح پوری کی رومانیت ان کے افسانوں میں مختلف زاویوں سے نمایاں ہوتی ہے۔ وہ اپنے افسانوں کا مواد کلاسیکی، تاریخی واقعات اور یونان و عرب کی قدیم داستانوں سے اخذ کرتے ہیں۔ لیکن ان اخذ کردہ واقعات کو وہ اپنی قوت متخیلہ کے ذریعے رومانیت کا ایسا دلنشین اور ہوشربا پیراہن عطا کرتے ہیں کہ وہ حسن کا مرکز بن جاتا ہے۔ نیاز اپنے نادر اسلوب کے ذریعے اسے ایک بالکل نئے زاویے کے ساتھ نئی شکل میں پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں رومانی فضا کی پرکیف سرمستی اور سرگشتگی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں محبت و حسن کی جن کیفیات کو پیش کیا ہے وہ ان کے ہم عصر افسانہ نگاروں کی رومانی تحریروں میں معدوم ہیں۔ مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:

''نیاز ایک زبردست قوت آخذہ کے مالک ہیں۔ وہ بڑے سلیقے کے ساتھ دوسری جگہ سے مواد لے سکتے ہیں اور اپنے انفرادی اسلوب سے اس کو اپنا بنا کر پیش کر سکتے ہیں۔ ایسا کرنا کوئی عیب نہیں ہے بشرطیکہ کوئی اپنے تخلیقی اسلوب سے دوسری جگہ سے ماخوذ مواد کو بالکل نیا روپ دے سکے۔ شیکسپیئر کا کوئی ڈرامے ایسا نہیں جو دوسری جگہ سے نہ لیا گیا ہو۔ لیکن اس کے ڈراموں کے اصلی ماخذوں کو کوئی پوچھتا نہیں۔ اس کے ڈرامے آج تک دنیا کو متاثر کیے ہوئے ہیں۔ اول اول نیاز کے افسانے یونانی اساطیر و قصص اور مصر و عرب یا دوسرے قدیم ملکوں کے حسن و عشق کی داستانوں سے ماخوذ ہوتے تھے جو بڑی رومانی سرگشتگی اور والہانہ پن کے ساتھ لکھے جاتے تھے۔ ان کے افسانوں کا موضوع بلا استثنا حسن و عشق ہے۔ محبت اور عورت کی جیسی رنگین اور دلفریب تصویریں ان کے افسانوں میں ملتی ہیں اردو کے کسی دوسرے افسانہ نگار کے یہاں نہیں ملتیں۔''

(مجنوں گورکھپوری، مضمون 'جدید نثر اردو، نیاز فتح پوری اور نئی نسل'، مشمولہ 'نگار' (نیاز نمبر) مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، پاکستان، 1963، ص 102)

نیاز فتح پوری اپنے زور تخیل سے اپنے افسانوں کے لیے ایسا پس منظر تیار کرتے ہیں اور ایک ایسی حسین و دلکش وادی کی تخلیق کرتے ہیں جس میں حسن و عشق کی بیل کا پروان چڑھنا فطری معلوم ہوتا ہے۔ اس فضا کو اور بھی سازگار بنانے میں نیاز فتح پوری خوبصورت پس منظر اور ماحول کے ساتھ ساتھ ایسے کرداروں کی تخلیق کرتے ہیں جن کے دل و دماغ محبت کے جذبے سے سرشار ہوتے ہیں۔ ایسے افسانوں میں نیاز نے بہت ہی لطیف اور دلکش اسلوب اختیار کیا ہے۔ مکالمے بھی جذبات سے لبریز ہوتے ہیں۔ یہاں عشق اپنی انتہا پر ہوتا ہے۔ لیکن ایسے ماحول میں بھی نیاز فتح پوری کا قلم شہوانیت کا شکار نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ ان کے عشق میں پاکیزگی نظر آتی ہے۔ نیاز فتح پوری کا مشہور افسانہ 'کیوپڈ اور سائکی' کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''سائکی بے خبر پڑی سو رہی تھی، چادر اس کے سرد سینہ سے جدا تھی اور اسے یہ ہوش نہ تھا کہ ایک حریص آنکھ اسے دیکھ رہی ہے۔ اس لیے اپنا عریاں حصہ جسم چھپا کر اسے سمٹ جانا چاہیے، اس کے بال ہوا سے اڑ اڑ کر اس

کی پیشانی اور چہرے پر آ رہے تھے اور اسے کچھ خبر نہ تھی کہ ایک غیر شخص اس منظر سے لطف اٹھا رہا ہے، اس لیے اپنے بال درست کر کے چہرہ پر نقاب ڈال لینا چاہیے۔

کیوپڈ نے اس سے قبل جب سائکی کو باغ میں دیکھا تو وہ بے نقاب ضرور تھی، مگر محو خواب نہ تھی، لیکن اسے کیا خبر تھی جب حسن سو جاتا ہے تو کیا ہو جاتا ہے اور جب لباس بے ترتیب اور بال برہم ہو جاتے ہیں تو ایک عورت کیا قیامت ہو جاتی ہے۔''

(نیاز فتح پوری، افسانہ 'کیوپڈ و سائکی'، 'نگارستان'، صدیق بک ڈپو، لکھنؤ، 1930، ص 48)

نیاز فتح پوری کی افسانہ نگاری پر رومانیت پوری طرح حاوی نظر آتی ہے۔ ان کا شعری مذاق جب ان کے افسانوی تخیل میں تحلیل ہوتا ہے تو اسے اور بھی دلچسپ بنا دیتا ہے۔ ان کے لیے دنیا کا ذرہ ذرہ رومان پرور ہے جو ہمارے احساسات کو عام زندگی کی سطح سے بلند کرتا ہے۔ نیاز فتح پوری کی شعریت اور ان کی شاعرانہ فطرت ان کے افسانوں کو نئے لطف سے ہمکنار کرتی ہے۔ نیاز فتح پوری صنف نازک کو اپنے افسانے کا مرکزی کردار بناتے ہیں اور اسے محبت کا مرکز تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں عورت ہر پہلو سے اپنے جلوے بکھیرتی نظر آتی ہے۔ نیاز فتح پوری کے افسانوں میں ایسی چیزیں نہیں پائی جاتی ہیں جن سے افسانے کی شعریات یا افسانے کا حسن مجروح ہو۔ ان کے افسانے حسن و عشق کے محور پر گردش کرتے ہیں۔ نیاز فتح پوری کا خیال ہے کہ عورت اور محبت ہی افسانے کی دلکشی اور دل فریبی کا سبب بن سکتی ہے۔ ان کے نزدیک عورت کے ذکر سے ہی کائنات میں حرارتیں اور سرمستیاں ہیں۔ وقار عظیم نے نیاز فتح پوری کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے افسانوں کی شعریت اور رنگینی کو موضوع گفتگو بنایا ہے اور ان کے تمام خصائص کی وجہ عورت کی ذات کو ٹھہرایا ہے۔ وقار عظیم اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''نیاز کے رومانی افسانوں کی جان، انھیں پر تاثیر بنانے والی قوت، ان میں شعریت اور رنگینی کی کیف آگینیاں شامل کرنے والی لطیف شے صرف عورت ہے۔ عورت کے نغمہ نے ان کے ہر لفظ کو، ہر جملہ کو، ہر قصہ کو رومانی اور رومانی سے زیادہ کیف آور بنانے میں مدد دی ہے۔ عورت کو انھوں نے جن جن طریقوں سے یاد کیا ہے اور ان کا ذکر کرتے وقت زبان نے جو کچھ کہا ہے اس سے رومانیت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔''

(وقار عظیم، مضمون 'رومانی افسانہ اور نیاز'، مشمولہ 'نگار' (نیاز نمبر) مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، پاکستان، 1963، ص 236)

نیاز فتح پوری کی تحریروں میں حسن اپنی پوری جلوہ سامانیوں اور تجلی ریزیوں کے ساتھ نمو پذیر ہوتا ہے اور عشق بھی اپنی تمام تر شدت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ نیاز کے رومانی تصورات میں عورت کلیدی کردار کی حامل ہے۔ عورت ہی نیاز کے لیے مرکز حسن ہے، وہی منبع حسن ہے اور حسن سوائے نسوانیت کے اور کچھ نہیں۔ نیاز فتح پوری کے نزدیک حسن کو عورت سے الگ کر کے نہ تو دیکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ نیاز کی نگاہ جب کسی مادی شے پر پڑتی ہے تو اس میں بھی انھیں نسائیت کا احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے حسن پر بہت غور و فکر کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حسن کے تمام اسرار و رموز نسائیت میں ہی پنہاں ہیں۔ حسن کو نسائیت سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا اور نہ ہی اس کے بنا حسن کا کوئی تصور ممکن ہے۔

نیاز فتح پوری عورت کو روشنی تسلیم کرتے ہیں، خوشبو مانتے ہیں، آلات موسیقی کا درجہ دیتے ہیں۔ انھوں نے بڑے ہی دلکش انداز میں لکھا ہے کہ:

''عورت ایک روحانیت ہے قابل لمس، نورانیت ہے صاحب نطق، ایک روشنی ہے جسے ہم چھو سکتے ہیں۔ ایک نکہت ہے جس سے ہم گفتگو کر سکتے ہیں۔ ایک حلاوت ہے جو ہاتھ سے چکھی جاتی ہے۔ ایک موسیقی ہے جو آنکھوں سے سنی جاتی ہے۔''

(نیاز فتح پوری، 'نگارستان'، صدیق بک ڈپو، لکھنؤ، 1930، ص 79)

نیاز فتح پوری کے افسانوں میں بڑی جاذبیت اور دلآویزی ہے۔ انھوں نے اپنی قوت متخیلہ کے ذریعے جو تجسیم کاری اور صورت گری کی ہے اس میں زندگی ہے، حرارت ہے اور جوش بھی ہے۔ ان کی خلاقانہ صلاحیت اور فکری و فنی بصیرت نے نازک ترین تصورات اور لطیف ترین تخیلات کو بہت ہی جاذب پیرہن عطا کیا ہے۔ بعض اوقات ان کے تخیل کی کارفرمائی اتنی عمیق ہوتی ہے کہ اس کی تہہ تک پہنچنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ ان کے تخیل کی رفعت اور معنوی نزاکتیں عجیب لطف پیدا کرتی ہیں۔

نیاز فتح پوری مزاجاً رومانی اور جمالیاتی افسانہ نگار ہیں۔ نیاز کے افسانے جہاں رومانی رنگ و آہنگ سے معمور ہیں، وہیں ان کے افسانوں میں معاشرتی اور اصلاحی رنگوں کی آمیزش بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ رومانونیت اور اصلاح پسندی کا یہ میلان دراصل نیاز کی پہلودار شخصیت اور ان کی رومانی اور فلسفیانہ افتاد طبع کا نتیجہ ہے۔ ان کے رومانی افسانے ہوں یا اصلاحی ان میں اسلوب کے اعتبار سے یکسانیت پائی جاتی ہے اور یہ اسلوب ادب لطیف کا ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اصلاحی اور معاشرتی افسانوں کے اسلوب میں رومانی افسانوں کی بہ نسبت سادگی ضرور آ جاتی ہے۔ مگر نیاز نے اپنے رنگ خاص کو کبھی ترک نہیں کیا۔ کیونکہ نیاز فتح پوری کی افسانوی دنیا کی تمام تر رونقیں اور دلکشی رومانیت پسندی ہی میں مضمر ہیں۔ نیاز فتح پوری کے افسانوی جہان کا سب سے امتیازی وصف ان کا مخصوص طرز بیان ہے۔ اسی سحر انگیز اسلوب کے ذریعے انھوں نے اپنے افسانوں میں لطافت اور دلکشی پیدا کی ہے۔ موضوعات کے لحاظ سے نیاز کے افسانے کی زبان میں تبدیلی آتی جاتی ہے۔ جہاں وہ معاشرتی اور اصلاحی موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے ہیں وہاں زبان سادہ اور سلیس ہو جاتی ہے اور جب محبت اور رومان پرور وادیوں کی سیر کراتے ہیں تو ایک طرح کی شوخی و سرمستی پیدا ہو جاتی ہے۔ تشبیہات و استعارات کے ذریعے شاعرانہ نثر نگاری کے جلوے بکھیرے جاتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں نیاز کے اسلوب کا اصل جوہر دیکھنے کو ملتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:

''نیاز کے اسلوب میں بیک وقت ٹھہری ہوئی سنجیدگی اور سنبھلی ہوئی شوخی باہم ملی جلی ہوئی پائی جاتی ہے۔ یہ اسلوب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نازک سے نازک رنگین مسائل پر شگفتگی اور دل آویزی کے ساتھ بحث کی جا سکتی ہے۔ موضوع کی خشکی یا تلخی کو اسلوبی کیفیتوں میں اس طرح لپیٹ لینا کہ محسوس نہ ہونے پائے، معمولی ہنر نہیں ہے۔ اردو نثر کی نئی نسل نے یہی انداز نیاز سے پایا اور جب تک اردو زبان کا کوئی ادبی مستقبل ہے، اس کے ادیبوں کی کوئی نئی نسل نیاز کے اسلوب کے اثر سے بے نیازی نہیں برت سکتی۔ اردو نثر کی تاریخ میں نیاز کا اسلوب ایک زندہ قوت ہے جس کے اثرات کبھی فنا نہیں ہو سکتے۔''

(مجنوں گورکھپوری، مضمون 'اردو نثر، نیاز اور نئی نسل'، مشمولہ 'نگار' (نیاز نمبر)، پاکستان، مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، 1963، ص 104)

یہ حقیقت ہے کہ نیاز فتح پوری خالص رومانی اور جمالیاتی افسانہ نگار ہیں لیکن ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے سماجی مسائل اور نفسیاتی کیفیات سے چشم پوشی کی ہو۔ نیاز فتح پوری نے سماجی اور نفسیاتی موضوعات پر بھی قلم اٹھایا اور بہترین افسانے تخلیق کیے۔ لیکن ان افسانوں پر بھی ان کا رومانی جذبہ غالب ہے۔ ان کا افسانوی اسلوب اپنے عہد کے دیگر افسانہ نگاروں سے منفرد ہے۔ نیاز فتح پوری کے افسانوں کو ہم جدید تنقیدی اصولوں پر نہیں پرکھ سکتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے تعین قدر کے لیے ہمیں انھیں کے وضع کردہ اصولوں اور معیاروں کی جانب رجوع کرنا پڑے گا۔

■

Amir Iqbal
Research Scholar, Dept of Urdu
University of Allahabad-
Prayagraj-211002 (UP)
Mob.:9889665833

تبصرہ وتعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیرضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان وادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

طب القانون و علم السموم

صفحات: 666 قیمت: 295روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: عبدالباری قاسمی، C-145/1 طیب لین، شاہین باغ، نئی دہلی

طب زندگی کا ایسا جزو لاینفک شعبہ ہے کہ کسی کو بھی اس سے مفر کی گنجائش نہیں ہے، ہر انسان اور ہر شہری کو اس کی ضرورت پڑتی ہے، باوقار اور بہترین زندگی گزارنے کے لیے بہتر طبی سہولیات کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ طب کا تعلق صرف علاج ومعالجہ تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا قانونی پہلو بھی ہے۔ معاشرہ اور سوسائٹی میں بہت سے مسائل درپیش ہوتے رہتے ہیں جنھیں ہم کچھ اصول وضوابط کی روشنی میں حل کرتے ہیں انھیں اصول وضوابط کو قانون سے تعبیر کیا جاتا ہے، ابتدائی دور میں کچھ زبانی اصول وضوابط تھے، رفتہ رفتہ ترقی کرکے تحریری شکل میں سامنے آئے، انھیں اصول وضوابط کو قانون کا نام دیا گیا، اس کے بعد جیسے جیسے ترقی ہوتی گئی قانون کے بھی بہت سے شعبے ہوگئے اور نئے نئے اصطلاحات سامنے آتے گئے۔

قانون کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں: دیوانی قوانین (Civil Laws) اور فوجداری قوانین (Criminal Laws) پہلی قسم میں تمام قوانین کی کارروائیاں ہوتی ہیں جبکہ دوسرے میں جان و مال کی حفاظت اور جرائم کا سد باب وغیرہ شامل ہے۔ اس کے بنیادی قوانین 'تعزیرات ہند' کے نام سے موسوم ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'طب القانون وعلم السموم' دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلا حصہ طب القانون ہے جبکہ دوسرا علم السموم ہے۔ طب قانون فارینسک میڈیسن (Forensic Medicie) کو کہتے ہیں، اس میں انسان کی ایسی داخلی اور خارجی تبدیلیوں اور علامتوں سے بحث کی جاتی ہے جن سے عدالت کو صحیح فیصلہ دینے میں مدد ملے۔ اس کا بنیادی مقصد قانونی معاملات میں طب کو استعمال کرنا ہے تاکہ فیصلے آسانی سے لے سکیں۔

اس کتاب کا حصہ اول 'طب القانون' ہے اس میں اطبا اور ماہرین قوانین کے پندرہ مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون طب القانون کا تعارف ہے اسے ڈاکٹر پارس وانی نے تحریر کیا ہے۔ دوسرا مضمون 'طبی آداب قوانین' ہے اسے ڈاکٹر ارش محمد خاں شیروانی نے لکھا ہے، اس میں طبی اخلاق اور اصول وضوابط پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس میں مفصل انداز میں بتایا گیا ہے کہ ایک ڈاکٹر کے لیے میڈیکل سرٹیفکیٹ کی کتنی اہمیت ہے اور اس سرٹیفکیٹ کی وجہ سے ان پر کس طرح کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ تیسرا مضمون 'عدالتیں اختیارات وطریقہ کار' ہے، یہ ڈاکٹر افتخار احمد بھوپال کی تحریر ہے، اس میں قانون کا تعارف کراتے ہوئے عدالت میں کس طرح کی شہادتیں معتبر ہوتی ہیں، طبی شہادت کی کتنی قسمیں ہیں اور اس کے رہنما ہدایات کیا کیا ہیں ان امور کو بیان کیا گیا ہے۔ چوتھا مضمون 'شناخت' ہے اس میں شناخت کی تعریف، طریقۂ کار، نعش کی قسمیں، مذہب اور جنس وغیرہ کی شناخت پر گفتگو کی گئی ہے، یہ مضمون ڈاکٹر پارس وانی کا ہے، پانچواں مضمون 'موت اور تشریح بعدالموت' ہے، اسے ڈاکٹر ایم ایس صدیقی نے تحریر کیا ہے، اس میں موت کے طبی اور قانونی پہلو کو بیان کرتے ہوئے موت کے درجات، علامات اور موت کے بعد تغیرات وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے۔ چھٹا مضمون 'تشددی اختناقی اموات' ہے اسے ڈاکٹر محمد نسیم خاں بھوپال نے لکھا ہے، اس میں عمل تنفس کے بند ہونے کی وجہ سے جو موت واقع ہوتی ہے اس کی کیا شکلیں ہوتی ہیں، بعد موت کس طرح کے علامات ظاہر ہوتے ہیں اور قانون اس سلسلے میں کیا ہے، بیان کیا گیا ہے۔ ساتواں مضمون 'زخم' ہے یہ مضمون ڈاکٹر عبدالحلیم لکھنؤ کا ہے، اس میں زخم کی تعریف، قبل موت اور بعد موت زخم کی شکلیں اور اس کے قانونی پہلوؤں کو بیان کیا ہے۔ آٹھواں مضمون 'حرق وسلق' ہے، اسے ڈاکٹر روبی انجم نئی دہلی نے تحریر کیا ہے اس میں حرق وسلق کی تعریف، نوعیت، اثرات واسباب اور عوارضات وغیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نواں مضمون 'عنانت، عقم، عقر، تعقیم اور امنا اصطناعی' ہے یہ بھی ڈاکٹر روبی انجم کا ہے، اس میں انھوں نے نامردی، بچہ نہ جننے کی صلاحیت، تخلیقی نقائص اور اس سلسلہ میں طبی قوانین کو بیان کیا ہے۔ دسواں مضمون 'دوشیزگی' ہے اس میں بکارت، جنسی اعضا کی تشخیص اور قانونی پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔ گیارہواں مضمون 'جنسیاتی جرائم' ہے اسے ڈاکٹر انتظار احمد نے تحریر کیا ہے، بارہواں مضمون 'حمل' ہے اسے ڈاکٹر محمد نسیم خان نے لکھا ہے۔ تیرہواں مضمون 'اسقاط' ہے یہ ڈاکٹر روبی انجم کا تحریر کردہ ہے، چودہواں مضمون 'قتل اطفال' ہے یہ بھی ڈاکٹر روبی انجم کا ہی ہے، پندرہواں مضمون 'جنون' ہے اسے ڈاکٹر محمد اکرم نئی دہلی نے تحریر کیا ہے، اس میں دماغی بیماریوں کی اقسام، صورت حال، دماغی صحت سے متعلق ایکٹ اور خاندانی وشخصی روداد وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ علم السموم ہے، اس کے عنوان سے ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس کا تعلق زہروں سے ہے، اس حصہ میں آٹھ مضامین شامل ہیں۔ ہر مضمون کو علاحدہ علاحدہ باب کی حیثیت حاصل ہے، اس اعتبار سے کہ سکتے ہیں کہ اس حصہ میں آٹھ ابواب ہیں۔ ابواب کی فہرست اس طرح ہے، علم السموم کا تعارف ڈاکٹر پارس وانی، اکال زہر ڈاکٹر محمد اکرم، سموم مخرشہ ڈاکٹر انتظام احمد، عصبی زہر ڈاکٹر ابصار احمد اور ڈاکٹر محمد نسیم خاں، حیوانی زہر ڈاکٹر حامد علی بنگلور، قلبی سموم ڈاکٹر محمد اکرم، اختناقی زہر ڈاکٹر عائشہ پروین اور گھریلو زہر اور متفرق زہر ڈاکٹر شمیم جہاں رضوی۔ ان ابواب میں زہر کی تعریف، قسمیں، زہر کے دخول کے طریقہ کار، عوامل، تشخیص، تشریح بعدالموت، قبل الموت اور اس کے قانونی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

طب القانون وعلم السموم طبی قانون سے دلچسپی رکھنے والے اردوداں طبقہ کے لیے بیش بہا خزانہ سے کم نہیں ہے، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور اس کا طبی پینل اس کتاب کی اشاعت کے لیے قابل مبارکباد ہے۔ اس کتاب میں بہت آسان انداز میں طبی قانون اور زہروں کے علم پر روشنی ڈالی گئی ہے، مجھے قوی امید ہے کہ قارئین اس کتاب سے ضرور استفادہ کریں گے۔

تحقیق و تنقید

ہم عصر شعری جہات

مصنف: بدرمحمدی

صفحات: 216، قیمت 138، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: حبیب سیفی، E-12/51B، حوض رانی، مالویہ نگر، نئی دہلی

مضامین کا مجموعہ 'ہم عصر شعری جہات' بدرمحمدی کی تازہ تصنیف ہے، جو ان کے وسیع و عمیق مطالعہ کی غماز ہے۔ متعدد شعری اصناف کے تخلیق کاروں، تذکروں پر مبنی یہ مجموعہ مضامین کے عام مجموعوں سے کئی معنوں میں الگ ہے۔ اول تو یہ کہ شاعری کی جتنی بھی اصناف پر باتیں کی گئی ہیں ان کے تعلق سے بدرمحمدی بہت کچھ جانکاری رکھتے ہیں، کیونکہ خود بھی شاعر ہیں اور کئی اصناف میں طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس مجموعہ میں تذکرہ نگاری اور خاکہ نگاری کا بھی شائبہ قاری کو گزرے گا۔

بدرمحمدی نے مجموعہ میں شامل سبھی شعری اصناف کے بیشتر پہلوؤں کا عرق ریزی سے تنقیدی جائزہ لیا ہے، اور شاعری میں شعریت سے بھی حظ اٹھایا گیا ہے۔

مجموعہ میں دو درجن شعرا کی تخلیقات پر اپنے طریقے سے بدرمحمدی نے تاثراتی تنقید کی ہے، میری نظر میں یہ تنقید تجزیاتی نقطۂ نظر کا حصہ بھی کہی جاسکتی ہے۔ کتاب میں شامل جتنے بھی نام ہیں ان کی اردو ادب میں باقاعدہ ایک پہچان ہے، اور اس پہچان کو تازہ کرنے کی سعی نہایت ہی عمدہ انداز میں یا یہ کہہ لیجیے کہ اپنے انفرادی اسلوب نگارش سے بدرمحمدی نے کی ہے۔ ساتھ ہی مجموعہ کا انتساب بدرمحمدی کے طبعی میلانات کا واضح ثبوت ہے، کیونکہ انتساب ان بہی خواہوں کے نام ہے جنھوں نے تنقید نگاری کی طرف انھیں راغب کیا۔

فہرست پہ نگاہ ڈالیں تو جہت اوّل کے تحت بدرمحمدی نے اپنی بات رکھی ہے۔ ڈاکٹر اسلم حنیف گنوری نے امتزاج پسند ناقد کے عنوان سے اپنے تاثرات دیے ہیں، جبکہ حقانی القاسمی نے نقدشعر اور بدرمحمدی کے لیے 11 صفحات پر اپنے تفصیلی مگر جامع خیالات کا اظہار کیا ہے، اور جو محسوس کیا اسے بلا جھجک لکھا ہے۔ ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی نے بھی مجموعہ میں یہ رسم نبھائی ہے۔

حقانی القاسمی نے لکھا ہے کہ اس کتاب میں بیشتر وہ شعرا شامل ہیں جنھیں بڑے ناقدین کی بہت کم سطریں نصیب ہوئی ہوں گی، جی بلاشبہ نامور ناقدین ہرایرے غیرے پر قلم مفت میں نہیں اٹھاتے، یہ وبا اردو زبان وادب اور بالخصوص شاعری کے حوالے سے مرض کی شکل میں سرایت کرچکی ہے۔ حقانی القاسمی نے بڑے ہی اہم نکتہ کی سمت توجہ دلائی ہے کہ 'ہم عصر شعری جہات' میں شامل ادبی شخصیات کو بدرمحمدی کے ذریعہ توقع ہے شناخت بنانے میں کامیابی ملے گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض قلمکاروں کا ایک جہان معترف ہے، کیونکہ ان میں سے چند ایک رسائل کے مدیران اور نامور و معمر ادیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ شاید ہی بہار کے ایک دو قلمکار ایسے ہوں جن سے ناچیز واقف نہیں ہے باقی سبھی چہرے جانے پہچانے معلوم ہوتے ہیں۔

شعری اصناف کی گرہ کھولتے ہوئے جس ڈھنگ سے تنقید کی گئی ہے، اس سے بدرمحمدی کے تفکیری خیالات واحساسات کا بھرپور علم قاری کو ہوجائے گا۔ 'ہم عصر شعری جہات' کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے جہاں سے بھی کھولیے وہیں سے پڑھنا شروع کردیجیے، جس کسی مضمون کی آپ قرأت کریں گے تو میرا دعویٰ ہے آپ محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گے، کیونکہ بدرمحمدی نے ہر ایک قلمکار کے ساتھ نہ صرف اس کی کاوشات بلکہ اصناف شاعری سے بھی اپنی واقفیت کے ثبوت قلمبند کیے ہیں اور تعمیری شعور کی نظیریں اپنی تحریروں میں پیش کی ہیں۔

پروفیسر نجم الہدیٰ سابق صدر شعبۂ اردو بہار یونیورسٹی مظفرپور نے بدرمحمدی کو متعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ نثری نگارشات کا ایک مجموعہ منظر عام پر آچکا ہے اور 'ہم عصر شعری جہات' ان کے تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اگر کیفیت اور کمیّت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کے تنقیدی مضامین کے اور بھی مجموعے مرتب ہوسکتے ہیں۔ اگرچہ یہ فیصلہ مشکل ہے کہ وہ شاعر بڑے ہیں یا نثر نگار لیکن موضوعات کے تنوع اور دائرہ کار کے لحاظ سے ان کی نثری نگارشات کی دنیا زیادہ دوررس اور زیادہ وسیع ہے۔

مجموعہ مضامین میں سعید رحمانی کی حمدیہ سحر کاری، فرحت حسین خوشدل کی دعائیہ نظمیں، نویدی کی نثری نعتوں پر ایک نظر، طالب القادری کی نعتیہ شاعری، ناوک حمزہ پوری کی نظمیہ رباعیات، حافظ کرناٹکی کی قطعات نگاری، روٹی جیسا چاند کا دوہا نگار ظفر انصاری ظفر، ف۔ س۔ اعجاز کی چند پابند نظمیں، عطا عابدی کی زندگی زندگی اور زندگی، اندھیرے میں نور کی نظمیں فردوس گیاوی، ظہیر صدیقی کا شاعرانہ اختصاص، شگفتہ سہسرامی کی شعری شگفتگی، حمید ویشالوی بحیثیت استاد شاعر، صبا نقوی کی شعری جمالیات، ضیا عظیم آبادی کی شاعرانہ ضیا پاشی، اوج ثریا کے شاعر کی زمینی وابستگی عبدالمتین جامی، علیم الدین علیم کی غزلوں کا رنگ وآہنگ، سائے ببول کے اور اظہر نیّر، لفظ لفظ آئینہ اور اس کی تصویریں سید نفیس دسنوی، تیکھے لہجے کا شاعری ظفر صدیقی، اشرف یعقوبی کا شعری آہنگ، منظور عادل کا سرمایۂ سخن، مینو بخشی کی اردو شاعری اور کرب نارسائی کی شاعرہ شہناز شازی پر پرمغز تحریریں شامل ہیں۔

ان مضامین میں تہذیبی، تمدنی، ثقافتی اور معاشرتی فلاح و بہبود کا عنصر بھی شامل ہے۔ 'ہم عصر شعری جہات' دیکھنے کے بعد آپ تسلیم کریں گے کہ بدرمحمدی نے اپنی مخلصانہ صلاحیتوں کو اردو زبان وادب کے لیے وقف کیا ہوا ہے۔ 'ہم عصر شعری جہات' اردو کے ادبی وشعری ورثے کو آگے بڑھانے کا ذریعہ ثابت ہوگی، اس امکان کے ساتھ بدرمحمدی نے مسلسل ادبی منظرنامہ پر نگاہ رکھی ہے اور اس سے جو نتیجہ اخذ کیا اسے مجموعہ کی صورت میں قارئین کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے ایک بہترین کتاب سامنے آئی ہے، بہترین اس لیے بھی اندرونی مواد لائق مطالعہ اور کتاب کی باہری صورت گری دلکش وجاذب نظر ہے۔ اس لیے صاف ستھری طباعت اور تقریباً اغلاط سے پاک اس مجموعہ کی جتنی بھی پذیرائی ہو اور مقبولیت اس کتاب کو حاصل ہو وہ کم ہی کم ہے۔ تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ شعری ذوق وشوق رکھنے والوں کے لیے بہ ہر طور لائق استفادہ ہے، اور قیمت بھی مناسب ہے۔

مضامین

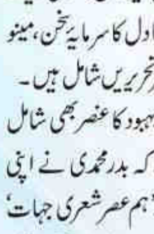

میزان فکر و فن

مصنف: انور آفاقی

صفحات: 208، قیمت: 280، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، دربھنگہ، بہار

مبصر: قمر اعظم صدیقی، معرفت انوار الحسن وسطوی، آشیانہ کالونی (حسن منزل)، باغ مالی، حاجی پور 844101 (بہار)

'میزان فکر وفن' انور آفاقی صاحب کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ اس سے قبل بھی آپ کی چھ کتابیں: دیرینہ خواب کی تعبیر، نئی راہ نئی روشنی، لمسوں کی خوشبو، دوبدو، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی سے گفتگو، Fragrance of Palpability داد وتحسین کے

مراحل سے گزر چکی ہیں۔ انور آفاقی صاحب نے اپنی اس کتاب کا انتساب عہد حاضر کے معروف ناقد، پیارے انسان جناب حقانی القاسمی کے نام کیا ہے۔

'اپنی بات' میں مصنف نے اپنے مضمون نگاری اور تبصرہ نگاری کے تعلق سے بہت ہی حق گوئی کے ساتھ اپنی روداد کو قلمبند کیا ہے "منصور خوشتر اور احسان عالم کے اعتماد نے مجھے مضامین و تبصرے لکھنے کو متحرک کیا۔ اس طرح شاعری و افسانہ نگاری کے ساتھ اس صنف (مضمون نگاری) میں بھی ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔"

ایک بہت ہی مشہور شعر 'تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب' کو مصنف نے اپنی اس کتاب میں موضوع بحث بنایا ہے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

"دو دن قبل برادر محترم اسلم بدر نے ایک پوسٹ میسنجر پر مجھ سے شیر کیا تھا اور جس پر ایک شعر۔

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب　　یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

لکھا ہوا تھا، اس کے ساتھ ایک سوال بھی تھا کہ لوگ کہتے ہیں۔ یہ شعر علامہ اقبال کا ہے۔ کیا واقعی انہی کا ہے؟ میں نے جواباً ان کو لکھا کہ یہ شعر علامہ اقبال کا نہیں ہے، بلکہ یہ شعر کسی 'صادق' کا ہے۔"

آگے لکھتے ہیں: "ایک مجموعہ کلام (برگ سبز) کے نام سے جو صرف 80 صفحات پر مشتمل ہے 1977 میں شائع ہوا۔ اسی مجموعہ کلام کے صفحہ 64 پر چھپی غزل میں متذکرہ شعر شامل ہے جس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب　　یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑنے کے لیے
کامیابی کی ہوا کرتی ہے ناکامی دلیل　　رنج آتے ہیں تجھے راحت دلانے کے لیے

مذکورہ شعر اپنے آہنگ و اسلوب اور شاید 'عقاب' کی وجہ سے ایک مدت سے آج تک علامہ اقبال کے نام سے لکھا اور پڑھا جاتا ہے لیکن اس طرح کی غلطی ایک عام قاری کرے تو بات کسی حد تک سمجھ میں آتی ہے مگر جب اس طرح کی غلطی پر ایک ادیب اپنے مضمون تک میں علامہ اقبال کی ضد کرنے لگتا ہے تو حیرانی ضرور ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ شعر سید صادق حسین شاہ کے مجموعہ کلام میں موجود ہے۔" (میزان فکر و فن، ص 20)

اس شعر کے حوالے سے مصنف نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ ان کی آخری آرام گاہ پر جو کتبہ نصب ہے اس پر بھی یہ شعر ان کے ہی نام سے منسوب ہے۔

مناظر عاشق ہرگانوی کے حوالے سے انور آفاقی نے بہت ہی قیمتی باتیں قلمبند کی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

"افسانچہ لکھنے والوں میں ایک معتبر نام مناظر عاشق ہرگانوی کا ہے، جب کبھی افسانچہ لکھنے والوں کی تاریخ رقم کی جائے گی تو اس میں مناظر عاشق ہرگانوی کا نام عزت و احترام کے ساتھ لکھا جائے گا۔ اس وقت مناظر عاشق ہرگانوی کا تازہ افسانچہ/منی اسٹوری 'حملہ کے وقت' نگاہوں کے سامنے ہے، جو صرف چودہ جملوں پر مشتمل ہے... کہانی کا اختتام اسی جملہ پر ہوتا ہے کہ "ہماری جان بچ گئی۔ اس کرشمہ کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ حملہ کے وقت میں سورۂ کہف کی تلاوت کر رہا تھا۔" اس افسانچہ کا سب سے اہم اور غور و فکر کی دعوت دیتا یہی آخری جملہ ہے جس پہ افسانچہ نگار مناظر عاشق ہرگانوی نے اپنے اس افسانچے کو ختم کیا ہے۔ کسی بھی افسانچہ کی خوبی بھی یہی ہے کہ قاری افسانچہ کے ختم ہوتے ہی اس میں غرق ہوجائے اور پھر تمام مناظر، حالات، کیفیات اور واقعات تفصیل سے اس قاری کے ذہن و قلب پر پردہ سیمیں کی طرح چلنے لگے۔ اس اعتبار سے افسانچہ 'حملہ کے وقت' ایک کامیاب اور چونکا دینے والا افسانچہ ہے۔"

مصنف نے مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی کے بارے میں بھی گفتگو کی ہے۔ بہت کم لوگوں کو پتہ ہے کہ مفتی صاحب شاعر اور افسانہ نگار بھی ہیں۔ انور آفاقی لکھتے ہیں:

"اگر مفتی صاحب نے افسانہ نگاری کو 1983 ہی میں الوداع نہ کہا ہوتا تو آج ان کا شمار تعمیری اور اصلاحی افسانہ نگاروں کی صف اول میں ہوتا۔ ان کے افسانوں میں جہاں خوبیاں ہیں وہیں کچھ فنی کمزوریاں بھی پائی جاتی ہیں مگر یہ بات ذہن میں رہے کہ ان کے یہ سب افسانے زمانہ طالب علمی کے ہیں۔

مفتی صاحب افسانہ نگاری کے ساتھ شاعری بھی کر رہے تھے۔ انھوں نے غزلیں اور چند نظمیں بھی لکھی ہیں۔ شاعری میں ان کا تخلص ثنا، ضیا اور عاصی رہا ہے۔ چند غزلیں اسی زمانے میں اخبارات میں شائع بھی ہوئیں۔ ان کی غزلیں عنفوان شباب کے دور کی ہیں لہٰذا ان کی غزلوں میں عشق و محبت مجازی کا ذکر ملتا ہے جو ایک فطری عمل ہے، اس کے ساتھ ہی ایسے اشعار بھی ان کی غزلوں میں ملتے ہیں جن میں قوم کو خواب خرگوش سے جگانے کا پیغام اور درد و الم کی داستان مذکور ہے۔"

بخوف طوالت یہاں تمام مضمون کے تعلق سے لکھنا ممکن نہیں ہے اس لیے باقی مضمون کے عنوانات آپ حضرات ملاحظہ فرمائیں— اقبال: محرم راز درون میخانہ، ایک فراموش کردہ ادیب کلیم عرفی، متھلا کے لال پدم شری ڈاکٹر مانس بہاری، زاویہ نظر کی آگہی۔ مطالعہ و تجزیہ (محمود احمد کریمی)، پروفیسر ابوذر عثمانی ایک ممتاز اور عہد ساز شخصیت، پروفیسر طرزی اور ان کے ادبی کارنامے، رفیع الدین راز کی شخصیت اور ادبی کارنامے، منفرد افسانہ نگار اور باشعور ناقد سلام بن رزاق، دھوپ اور چھاؤں کا شاعر اسلم بدر، میرا ہمدم میرا دوست اظہر نیر، وحشی سعید ایک ممتاز فکشن نگار اور باغ و بہار شخصیت، خلوص و محبت اور زبان و ادب کا امین: نذیر فتح پوری، قیام نیر اور ان کے ادبی کارنامے، دبستان عظیم آباد کا البیلا شاعر: شمیم قاسمی، خلیق الزماں نصرت: ایک کامیاب محقق، ممتاز و معروف ادیب اور نفیس انسان: ڈاکٹر سلیم خان، راجہ یوسف اور نقش فریادی، شگفت آگہی کا شاعر سلیم انصاری، عصر حاضر کا سنجیدہ اور معتبر ناقد و محقق: آفتاب احمد آفاقی، ڈاکٹر احسان عالم: ایک مشہور ادیب ناقد شاعر اور دل نواز شخصیت، ہم عصر افسانوی ادب کا معتبر نام: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، نئی نسل کا نمائندہ شاعر: جمیل اختر شفیق، اردو کی عصری صدائیں کا صداکار غلام نبی کمار، ڈاکٹر احسان عالم: اوراق غزل کے آئینے میں اور دربھنگہ ٹائمز کا یادرفتگاں نمبر۔

اس کتاب کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ آفاقی صاحب کی دلچسپی تحقیقی کاموں میں زیادہ ہے۔ آپ کے مضامین میں بہت ساری باتیں ایسی پائی جاتی ہیں جو قارئین کے لیے نئی ہوتی ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ ان کی دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی مقبول ہوگی اور ادبی حلقہ میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔ کتاب کافی دلکش ہے۔ مصنف نے کتاب کے نام کے مطابق 'میزان فکر و فن' میں تمام مضامین کو فکر و فن کے ترازو میں پرکھا ہے۔ بیک کور پر مصنف کی تصویر اور ان کی تصانیف کی تصویر چسپاں ہے۔

مضامین صدر عالم گوہر

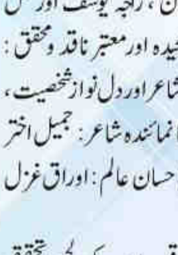

مرتب: ڈاکٹر غلام رسول
صفحات: 280، قیمت: 500 روپے
ناشر: نوارمبھ پرکاشن مدھوبنی پٹنہ
مبصر: ایم مبین، 303 کلاسک پلازہ، تین بتی،
کھڑک روڈ بھیونڈی 421302، ضلع تھانہ (مہاراشٹر)

یہ کتاب صدر عالم گوہر کے لکھے 21 مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین میں زیادہ

تر فلمی نوعیت کے مضامین شامل ہیں۔ یا صدر عالم گوہر نے جن فلمی شخصیات سے انٹرویو لیے ہیں اُن کو اس کتاب میں یکجا کر دیا ہے۔ کچھ اُن کے لکھے کتابوں کے تبصرے ہیں اور ایک سفرنامہ، سفرنامہ سکم کے نام سے ادھورا سا سفرنامہ ہے۔ ادھورا اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ کہ یہ سفرنامہ مکمل نہیں ہے۔ جگہ کی کمی کی وجہ سے شاید۔

صدر عالم گوہر کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ وہ بہت اچھے شاعر ہیں، مضمون نگار ہیں۔ انھوں نے کہانیاں افسانے بھی لکھے ہیں۔ ترجمے بھی کیے ہیں۔ اردو ہندی اور میتھلی زبانوں میں باقاعدگی سے لکھتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ 12 زبانیں جانتے ہیں۔ ان کے تعارف میں اس کتاب کے مرتب ڈاکٹر غلام رسول نے لکھا ہے:

''صدر عالم گوہر ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ وہ شاعر ہیں دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ ایک ادیب ہیں۔ ایک افسانہ نگار ہیں، مبصر ہیں۔ ان کی شخصیت کا یہ بھی ایک پہلو ہے کہ وہ ایک محقق ہیں۔ تحقیق کے میدان میں بھی ان کی بڑی بڑی فتوحات ہیں۔''

اس تعارف کے بعد مضمون نگار کے بارے میں اور کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں تک اس کتاب میں شامل ان کے مضامین کا تعلق ہے، ان کے مضامین تین نوعیت کے ہیں۔ بھلے ہی زیادہ تر مضامین فلمی نوعیت کے ہیں اور فلمی شخصیات سے لیے گئے انٹرویوز پر مبنی ہیں۔ لیکن ان کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ فلموں سے وابستہ خالص فلمی شخصیات سے لیے گئے انٹرویوز اور فلموں سے جڑے ادبی شخصیات سے لیے گئے انٹرویوز۔ فلموں سے جڑے ادیبوں اور شاعروں کے جو انٹرویو لیے گئے ہیں۔ ان پر ادبی رنگ تو غالب ہے ہی اور ادب کے باذوق قارئین کے لیے یہ اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ انٹرویوز کو پڑھتے ہوئے ان شخصیات کی نہ صرف زندگی سامنے آتی ہے بلکہ ان کے علمی و ادبی کارنامے بھی سامنے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے فلموں میں جو مقام بنایا ہے وہ مقام کس طرح بنایا؟ اس مقام کو حاصل کرنے کے لیے انھیں کتنی جدوجہد کرنی پڑی؟ ان کی زندگی کے وہ پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔ اُن شخصیات سے صدر عالم گوہر نے جو سوالات پوچھے ہیں ان میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا ہے کہ ان کی زندگی کے پوشیدہ اور گمنام پہلو قارئین کے سامنے آئے۔ اُن انٹرویو کو پڑھتے ہوئے ان شخصیات کی زندگی کے بڑے عجیب و غریب و منفرد پہلو سامنے آتے ہیں جو جو آج تک ہم سے پوشیدہ تھے۔ اس کتاب میں شامل انٹرویو کی ایک خاص بات یہ ہے کہ صدر عالم گوہر نے زیادہ تر موسیقی کے شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد سے انٹرویو لیے ہیں۔ پھر چاہے وہ موسیقار ہوں گلوکارہ ہوں گلوکار ہوں یا پھر نغمہ نگار ہوں۔ عام طور پر فلمی صحافت میں ان لوگوں کے بارے میں بہت کم لکھا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ پردے کے پیچھے ہوتے ہیں۔ اور لوگوں کی دلچسپی پردے پر نظر آنے والے افراد، اداکار، اداکاراؤں میں ہی ہوتی ہے۔ پس پردہ کام کرنے والے افراد سے بہت کم لوگ واقف ہوتے ہیں۔ لیکن صدر عالم گوہر نے ان انٹرویوز میں ان کی زندگی، اور ان کی جدوجہد کو انٹرویو کے ذریعے پیش کر کے ایک طرح سے ان شخصیات کو قارئین کے سامنے رکھ دیا ہے۔ ندا فاضلی مرحوم سے صدر عالم گوہر کے بڑے دیرینہ اور قریبی تعلقات تھے۔ اس کتاب میں 'ندا صاحب جہاں جاتے تھے چھا جاتے تھے' کے نام سے ندا فاضلی پر ایک مضمون تو شامل ہے ہی لیکن اپنی دیرینہ قربت اور اپنے تعلقات اور ندا فاضلی سے وابستہ یادیں اور باتوں کو انھوں نے اس کتاب میں کئی جگہ پر پیش کیا ہے۔ جیسے شاعر عبد الاحد ساز کے انتقال پر لکھا ہوا ان کا مضمون جب ہم پڑھتے ہیں تو اس میں عبد الاحد ساز کم نظر آتے ہیں زیادہ تر ندا فاضلی ہی چھائے ہوئے ہیں۔

ادبی کتابوں کے تبصروں میں تقریباً تمام تبصرے معروف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں سب سے زیادہ دلچسپی اور دلچسپ مضمون سفرنامہ سکم ہے۔ صدر عالم گوہر نے اپنے سکم کا سفرنامہ تو لکھا ہے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے بڑی باریکی سے سکم کی تہذیبی معاشرتی زندگی کو بھی اس سفرنامے میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے قارئین کو محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بھی سکم کا سفر کر آئے ہیں۔ اس کتاب کی ایک اور اہم دلچسپی مشہور عام شخصیت امین سیانی سے لیا گیا ایک انٹرویو ہے۔ امین سایانی سے ہر کوئی واقف تھا۔ ریڈیو کے زمانے میں ہر جگہ ان کا طوطی بولتا تھا۔ ٹی وی کے آجانے کے بعد یہ آواز گم ہوگئی۔ امین سایانی نام و نمود شہرت سے دور رہتے تھے اس لیے اُن کے متعلق بھی بہت کم معلومات مل پاتی ہے۔ یہ انٹرویو ان کے بارے میں بہت سی معلومات فراہم کرتا ہے۔ صدر عالم گوہر نے ہمیں امین سایانی سے انٹرویو لے کر ایک بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ امین سایانی کے بارے میں اُن کے چاہنے والوں کے دلوں میں جو تجسس تھا صدر عالم گوہر نے اپنے اس انٹرویو میں اُن کی زندگی کے وہ تمام پہلوؤں کو پیش کر دیا ہے۔ کتاب میں جن موضوعات پر مضامین شامل ہیں ان موضوعات میں دلچسپی رکھنے والے قارئین اس کتاب کو پڑھ کر ضرور فیضیاب ہوں گے۔

فکشن

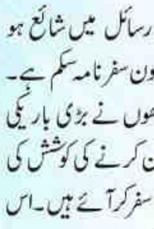

دوسرا وش پان

مصنف: ڈاکٹر عظیم اللہ ہاشمی

صفحات: 144، قیمت: 92 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: ایم۔آر۔ پبلی کیشنز دہلی

مبصر: اطہر حسین، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس

ڈاکٹر عظیم اللہ انصاری کا شمار دور حاضر کے ان افسانہ نگاروں میں کیا جاسکتا ہے جن کے یہاں حقیقت نگاری کے سارے پہلو نمایاں ہیں۔ ان کی متعدد کتابیں منظر عام پر آکر سراہی جاچکی ہیں۔ ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کے دو مجموعے 'ادبی افق' اور 'تفہیم و تعبیر' شائع ہو چکے ہیں۔ مختلف رسائل میں ان کے افسانے وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے افسانے نہ صرف عصری مسائل کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ فنی لوازمات پر بھی کھرے اترتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'دوسرا وش پان' ڈاکٹر عظیم اللہ ہاشمی کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ کتاب میں کل بیس افسانے شامل ہیں۔ یہ وہ افسانے ہیں جو موقر رسائل میں مختلف اوقات میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان افسانوں کے علاوہ مصنف کا لکھا ہوا حرف چند بھی شامل کتاب ہے جس سے نہ صرف یہ کہ کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ افسانوں کے پس منظر سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔ ان افسانوں میں موضوعات کا کافی تنوع پایا جاتا ہے۔ بیشتر افسانوں میں عصری حالات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ زبان و بیان کافی دلکش اور پیش کش کا انداز متاثر کن ہے۔ ان افسانوں میں نہ صرف یہ کہ مختلف تکنیک کو برتا گیا ہے بلکہ بیشتر افسانوں کی ابتدا اس انداز سے کی گئی ہے کہ افسانہ پڑھتے وقت ایک طرح کا تجسس برقرار رہتا ہے۔ افسانوں میں جذبے کی صداقت اور بیان کی آمیزش کی پوری عکاسی ملتی ہے۔ موضوعات میں یک رنگی کے بجائے تنوع ملتا ہے۔ ان افسانوں میں جذبہ آزادی، سماج کی ناہمواری، جنسی استحصال، انسان دوستی، گنگا جمنی تہذیب کی پاسداری، ملک کی تقسیم سے پیدا ہونے والے مسائل، موجودہ وقت میں معاشرے کی صورت حال اور دیگر کئی اہم امور کو موضوع بنایا گیا ہے۔

پہلا افسانہ 'دوسراوش پان' کے عنوان سے ہے۔ مصنف نے موجودہ حالات اور عصری مسائل کو موضوع بناتے ہوئے دوسراوش پان تحریر کیا ہے۔ افسانہ نگار نے افسانہ دوسراوش پان کے ذریعہ سماجی ناہمواری اور معاشرتی مسائل کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔

افسانہ ٹریجڈی ملک کی آزادی اور اس کے لیے پیش کی گئی قربانیوں پر لکھا گیا کامیاب افسانہ ہے۔ مذکورہ مجموعے کا ایک اہم افسانہ دل درد سے بھرآیا ملک کی آزادی کے پس منظر میں لکھا گیا یشپال اور پونم کے عشق ومحبت کی دردناک کہانی ہے جو نہ صرف یہ کہ آزادی کے لیے جدوجہد کرتے ہیں بلکہ مختلف مصائب سے دوچار ہوکر ایک دوسرے سے جدا ہونے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔

مشمولات کا ایک اہم افسانہ اٹھو فاطمہ دیوان دار کے عنوان سے ہے۔ جس میں فاطمہ دیوان دار اور عائشہ دیوان دار اور ان کے اجداد کی نہ صرف کہانی بیان کی گئی ہے بلکہ ملک کی سالمیت اور گنگا جمنی تہذیب کے لیے کی گئی کوششوں اور قربانیوں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ مذکورہ افسانہ نہ صرف موضوعاتی طور پر کافی منفرد ہے بلکہ دلکش لب ولہجے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

'پیاسا پھول' سماجی ناہمواری اور معاشرے کی ایک تلخ حقیقت سسرالی ظلم وستم پر لکھا گیا ہے۔ جس کا مرکزی کردار سارا ہے۔ جس کو بچے پاگل سمجھتے ہیں اور پگلی میرے گجرے کا پہلا پھول کہہ کر چھیڑتے ہیں۔ دراصل اس افسانہ میں سارا اور اس کی ماں کو موضوع بنا کر طلاق کے بعد پیدا ہونے والے مسائل اور لڑکیوں پر ڈھائے جانے والے مصائب کو بیان کیا گیا ہے۔ عالمی وبا کورونا اور اس سے پیدا ہونے والے جانی ومالی نقصانات پر لکھا گیا افسانہ 'لاک ڈاؤن' مشمولات کا ایک اہم افسانہ ہے۔ کورونا کی وبا سے ملک بھر میں پھیلی ہوئی دہشت اور لاک ڈاؤن سے پیدا ہونے والے مسائل کو جس منفرد انداز میں بیان کیا گیا ہے وہ پڑھے جانے کے قابل ہے۔

دوسراوش پان میں شامل افسانوں میں دوسراوش پان، نیا سیارہ، شب غم کا چاند، اعتماد کا زخم، بے ربط سانسوں کا سلسلہ، جنازہ گھر، دل درد سے بھرآیا اور پیاسا پھول کافی اہم ہیں۔ ان میں عصری مسائل کے نئے نئے موضوعات پر کافی کامیاب تجربہ کیا گیا ہے۔ ان کا لب ولہجہ اور پیش کرنے کا انداز متاثر کن ہے۔ بعض افسانوں کے مطالعہ کے وقت ان کے فن کی پختگی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ البتہ بعض افسانوں میں موضوعی تشنگی کھٹکتی ہے۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ افسانے نہ صرف یہ کہ منفرد ہیں بلکہ پڑھے جانے کے قابل ہیں۔ مجھے امید ہی نہیں کامل یقین ہے کہ ان کے پہلے مجموعہ کی طرح اس کی بھی خوب پذیرائی ہوگی۔

ترتیب

ھیون سانگ دھلی میں

مرتب: امتیاز وحید

صفحات: 200، قیمت: 130 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کولکاتا

مبصر: پروفیسر خالد اشرف، کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی

رام نرائن بھاٹیہ عرف فکر تونسوی پنجاب کے ریگستانی قریے شجاع آباد (ملتان) میں اکتوبر 1918 کو پیدا ہوئے۔ گوکہ آبائی قصبہ تونسہ شریف (ضلع ڈیرہ غازی خان) تھا، والد تجارت اور طبابت کرتے تھے لیکن جوئے کی لت نے فاقہ کشی تک پہنچادیا۔ فکر نے شاعری شروع کی اور ترقی پسندوں کے حلقے میں شامل ہوکر 'ادب لطیف' کے مدیر بنے۔ پھر ساحر لدھیانوی اور عارف عبدالمتین کی طرح سہ ماہی 'سویرا' کی ادارت کی۔ لاہور کی ادبی فضا 1947 کے فسادات میں برہم ہوئی تو فکر کو بطورِ شرنارتھی دلی آنا پڑا اور ان خونیں واقعات پر انھوں نے اپنا شاہکار روزنامچہ 'چھٹا دریا' لکھا۔ دلی آکر کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہوئے، انجمن ترقی پسند مصنفین کے رکن رہے اور شاعری ترک کرکے طنزیات کی طرف راغب ہوگئے۔ روزنامہ 'ملاپ' میں پچیس برس تک شاہکار کالم 'پیاز کے چھلکے' لکھتے رہے۔ 'فکرنامہ'، 'ساتواں شاستر'، 'تیرنیم کش' وغیرہ درجنوں تصانیف یادگار چھوڑیں۔ انتقال دلی میں 1987 میں ہوا۔

فکر تونسوی مزاجاً سادہ لوح اور درویش صفت تھے۔ اس لیے ان کو وہ مقام نہیں ملا، جس کے وہ مستحق تھے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے استاد امتیاز وحید نے 'ہیون سانگ دہلی میں' کے عنوان سے شائع فکر کی سلسلہ وار تحریروں کو یکجا کرکے ایک اہم فریضہ انجام دیا ہے۔ یہ مختصر مضامین خوشتر گرامی کے مایہ ناز ادبی رسالے 'بیسویں صدی' میں ستمبر 1979 سے ستمبر 1980 تک کے دورانیہ میں تیرہ قسطوں میں شائع ہوئے تھے۔ ڈاکٹر امتیاز وحید نے بیسویں صدی کی فائلیں بڑی تگ ودو کے بعد جے این یو کی لائبریری، کلکتہ کی نیشنل لائبریری اور خدابخش خاں لائبریری، پٹنہ وغیرہ سے حاصل کی ہیں، ورنہ یہ دلچسپ طنزپارے فائلوں ہی میں دم توڑ جاتے۔ ان کو یہ کام کرنے کی ترغیب ڈاکٹر ظفر کمالی نے دی تھی، جس کو پایۂ تکمیل تک لے جانے میں دس برس کی مدت صرف ہوگئی، جن میں کورونا کی خوفناکی کے دو سال بھی شامل رہے۔

زیر تبصرہ کتاب کے مقدمے میں ڈاکٹر امتیاز وحید نے لکھا ہے:

''فکر کا اصل رنگ طنز وظرافت ہے۔ طنز کے پردے میں فکر تونسوی کا اصل ہدف اعلیٰ انسانی آدرشوں کا تحفظ ہے، جو دیر وحرم کی اساس پر مبنی تقسیم ملک کی آندھی میں کہیں کھو گیا اور جس نے فکر سے ان کا چین وسکون چھین لیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مہاجرت پر مجبور ہوئے۔ تقسیم کی آندھی میں انسانیت کی ساری طنابیں اکھڑ گئیں اور احترام آدمیت کے سارے اصول خس وخاشاک کی طرح بہہ گئے۔ اس قیامتِ صغریٰ میں فکر کو اپنے دکھ سے زیادہ پرواہ نہ رہی اور انھوں نے جہاد بالقلم کی راہ کا انتخاب کیا۔''

اسی لیے فکر کی تحریروں میں اکثر تقسیم اور ہجرت کا المیہ کہیں نہ کہیں نظر آہی جاتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ تقسیم کی اذیت برداشت کرنے کے باوجود فکر کا نقطۂ نظر ہمیشہ روشن خیال اور سیکولر رہا۔

یہی نقطۂ نظر 'ہیون سانگ دہلی میں' کے اندر بھی موجود ہے۔ یہ دراصل ایک فنتاسی ہے، جو چینی سیاح ہیون سانگ کے سفرنامے پر مبنی ہے، جو ساتویں صدی عیسوی میں راجہ ہرش وردھن کے دور میں ہندوستان آیا تھا۔ فکر تونسوی نے بیسویں صدی کی دلی کے کرپشن، ہوسِ زر اور سیاسی بدکرداری کو موضوع بنایا ہے۔ مثال کے طور پر ''اور آج بیسویں صدی میں اگرچہ سونے کی ڈلیاں سڑک پر نہیں پھینکی جاتیں کیوں کہ سونا ہی نہیں بلکہ ہر چیز اتنی مہنگی ہوگئی ہے کہ کوئی آدمی گلا سڑا آم بھی سڑک پر نہیں پھینکتا۔ کیوں کہ پھینکنے کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ اُسے اُن کے گھر کا کوئی بچہ ہی کھائے گا—— لیکن اس کے باوجود یہ معاشرہ آج بھی حرص وہوا سے مبرّا ہے۔ اگر کوئی سونا اسمگل کرکے کسٹم چوکی سے گزر جائے تو کوئی کسٹم افسر اس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔''

اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں ہیں، جو 'ہیون سانگ دہلی میں' سے دی جاسکتی ہیں۔ ڈاکٹر امتیاز وحید نے ان مضامین کو تلاش کرکے اور یکجا کرکے ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ فکر شناسی کو مزید فروغ دیا جائے۔ توقع ہے کہ ڈاکٹر امتیاز وحید کے اس اہم اور وقیع علمی کام سے فکر فہمی کی ایک عمومی فضا ہموار ہوگی اور فکر جیسے اردو کے ایک اہم قلم کار پر ریسرچ اور تلاش وتحقیق کا سلسلہ شروع ہوگا۔ میں ڈاکٹر امتیاز وحید کو اس اہم ادبی وعلمی کارنامے پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

شاعری

اختتام

شاعر: کوثر امروہوی
صفحات: 248، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2021
مبصر: جمال عباس فہمی
محلّہ: لکڑا، امروہہ۔ 244221 (یوپی)

کوثر امروہی کی کتاب 'اختتام' مختلف ملکی اور عالمی شخصیات کی وفات پر کہے گئے تاریخی قطعات پر مبنی ہے۔ تاریخ گوئی ایک قدیم اور مشکل فن ہے جو موجودہ دور میں معدوم ہوتا جا رہا ہے۔

کسی شخص کی پیدائش، شادی، وفات یا کسی یادگار واقعہ کا ایک یا دو مصرعوں میں سن برآمد کرنا تاریخ گوئی کہلاتا ہے.. ویسے تو تاریخ گوئی اپنے آپ میں ہی ایک مشکل فن ہے اور ایک ہی مصرعے میں تاریخ برآمد کرنا نہایت ہی مشکل کام ہے۔ قطعہ کے چوتھے مصرعے سے تاریخ برآمد ہو تو اسے مسلم کہا جاتا ہے۔ بعض مواقع پر شعرا تیسرے اور چوتھے مصرے کے ذریعے تاریخ نکالتے ہیں یا تیسرے مصرعے کے کچھ حروف کو چوتھے مصرعے کے حروف کے اعداد کے ساتھ یکجا کر کے بھی تاریخ نکالتے ہیں۔ وہ بھی تاریخ گوئی لیکن اسے غیر مسلم کہا جاتا ہے۔

محمد شکور کوثر امروہوی فن تاریخ گوئی میں ماہر ہیں۔ وہ نہایت صاف ستھرے با محاورہ اور با معنیٰ مصرعے سے تاریخ نکالتے ہیں۔ کوثر امروہوی کی کتاب میں ایک بھی قطعہ ایسا نہیں ہے جس کے چوتھے مصرعے سے تاریخ نہ نکلی ہو۔ کوثر امروہوی کے نظم کردہ تمام قطعات میں تاریخ چوتھے مصرع سے ہی برآمد ہوتی ہے۔ اسے محض الہام ہی کہا جا سکتا ہے۔

'اختتام' میں دو سو سے زائد شخصیات کی وفات پر نظم کیے گئے پانچ سو سے زائد قطعات تاریخ شامل ہیں۔ یہ قطعات 1984 سے لے کر 2021 کے درمیان فوت ہونے والی شخصیات کے سلسلے میں نظم کیے گئے ہیں۔ کوثر امروہوی کی ایک اور خصوصیت ہے جو انھیں دیگر تاریخ گو شعرا سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے ایک ہی شخص کی موت پر ایک سے زائد قطعات تاریخ نظم کیے ہیں۔ جبکہ عام طور پر شعرا ایک ہی قطعہ تاریخ نظم کرتے ہیں۔ بعض شخصیات کے تعلق سے تو کوثر امروہوی نے درجنوں قطعات تاریخ نظم کر دیے ہیں۔ کوثر امروہوی نے اپنے استاد مرزا احمد حسین سیفی کے سانحہ ارتحال پر چودہ قطعات تاریخ نظم کیے۔ ایک قطعہ تاریخ نظم کرنے میں ہی شاعر کو پسینے آ جاتے ہیں۔ کوثر امروہوی سن عیسوی اور سن ہجری دونوں نکالنے میں ماہر ہیں۔ انھوں نے معروف خطاط اور آرٹسٹ صادقین، گلوکار کشور کمار، معروف شعرا رئیس امروہوی، جون ایلیا، پروین شاکر، فیض احمد فیض،، کیفی اعظمی، اختر الایمان، راحت اندوری، فلمساز کمال امروہی، لیڈی ڈائنا، مدر ٹریسا، فلسطینی لیڈر یاسر عرفات، سابق وزیر اعظم آئی کے گجرال، سابق صدر جمہوریہ اے پی جے عبدالکلام، طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین، اور شمس الرحمان فاروقی جیسی شخصیات کی وفات پر قطعات تاریخ نظم کیے۔ درجنوں غیر معروف افراد، ملنے جلنے والوں اور عزیزوں اور رشتے داروں کی موت پر بھی انھوں نے قطعات نظم کیے ہیں۔ کوثر امروہوی کے مجموعے کے عنوان 'اختتام' سے بھی اس کا سنہ اشاعت برآمد ہوتا ہے۔

نمونے کے طور پر کوثر امروہوی کے نظم کردہ کچھ قطعات تاریخ پیش کیے جاتے ہیں۔

گلشن دنیا سے صادقین رخصت ہو گئے　　لے کر آئی ہے خبر غمناک یہ باد نسیم
کوثر امروہوی تم انکی تاریخ اجل　　لکھوائے دل چل بسا افسوس خطاط عظیم

1987

چل بسیں وہ در ٹریسا بھی　　جن کا سارے جہاں میں شہرہ تھا
سال رحلت لکھا یہ کوثر نے　　بابا غم ہے مدر ٹریسا کا

1997

کوثر امروہوی اس لحاظ سے بھی قابل مبارکباد ہیں کہ وہ تاریخ گوئی کے فن کو نہ صرف زندہ رکھے ہوئے ہیں بلکہ تاریخی قطعات پر مبنی پوری ایک کتاب شائع کر کے انھوں نے اس فن کو قبول عام بنانے کی بھی کوشش کی ہے۔

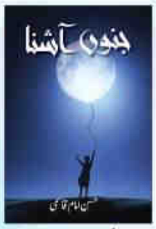

جنوں آشنا

شاعر: حسن امام قاسمی
صفحات: 140، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2022
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
مبصر: ابرار احمد اجراوی، ایٹ + پوسٹ: اجرا، وایا رایام فیکٹری، ضلع مدھوبنی، بہار

جواں سال شاعر حسن امام قاسمی دنیائے شعر و سخن میں زیادہ تعارف کے محتاج نہیں۔ انھوں نے بہت کم عرصے میں شعری منظر نامے پر اپنی شناخت قائم کر لی ہے۔ ان کی غزلیہ تخلیقات کو ادبی و شعری حلقوں میں قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ اصل میں غزلوں کے شاعر ہیں، مگر انھوں نے کامیاب نظمیں بھی کہی ہیں، جس میں نظم کی فنی حیثیت کا بدرجۂ اتم خیال رکھا گیا ہے۔ اس وقت میرے پیش نظر ان کا تازہ اور اولین شعری مجموعہ 'جنوں آشنا' ہے۔ جس میں عددی اعتبار سے غزلوں کا پہلو بھاری ہے۔ اس میں 64 غزلیں، ایک حمد، دو نعت، ایک نظم، تین ترانے اور دس قطعات شامل ہیں۔

حسن امام قاسمی کے یہاں خارجیت سے زیادہ داخلیت پسندی اور معرفت خودی پر مشتمل مضامین ملتے ہیں کہ انھوں نے خود کہا ہے۔

اپنوں کے غم میں اور غم روزگار میں　　مصروف زندگی ہے اسی کاروبار میں

انھوں نے عصری کرب و درد، زمانے کی بے رخی، اپنوں اور غیروں کے ظلم و تشدد اور حکمرانوں کی ستم شعاری کو شعری پیمانے میں سمو کر پیش کیا ہے۔ ان کی غزلیں اپنے فنی رکھ رکھاؤ اور غزلیہ طور و طرز کی وجہ سے قاری کو متاثر کرتی ہیں اور ان کے ذہن سے اپنا رشتہ استوار کرتی ہیں۔ انھیں شاعری کے اسرار و رموز اور اس کی کنہ و ماہیت پر دسترس حاصل ہے۔ وہ فن شاعری کے پارکھ ہیں، کہیں بھی ذہن و قلم انھیں غچہ نہیں دے پاتا۔ ان کی گرفت الفاظ پر بھی رہتی ہے اور معانی کے طلسماتی جہان پر بھی ان کی کمند مضبوط رہتی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں عمدہ تراکیب تراشی ہیں، جنوں آشنا کا شاعر صرف عشق و جنون کی بات نہیں کرتا، بلکہ وہ معاشرتی اقدار کی پاس داری، صالح سماج کی تشکیل کا مزاحمتی اعلان بھی کرتا ہے، وہ روزمرہ، محاورہ، ضرب الامثال اور تلمیحات و استعارات کے جہان سے بھی بخوبی آشنا ہے، وہ سادہ و سہل اور رواں و سلیس الفاظ میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کرتے ہیں، اس لیے ان کی شاعری کہیں بھی معمہ نہیں بنتی، بلکہ اپنی تراش خراش اور عمدہ ترکیبی بندش کے سبب بہت جلد قاری کے ذہن پر مرتسم اور نقش ہو جاتی ہے اور بہتوں کے حافظے کا حصہ بھی بن جاتی ہے۔ انھوں نے قدیم شعری دواوین کا بھی مطالعہ کیا ہے، اور انھوں نے معیاری کلاسیکی شاعری کا بھی اثر قبول کیا ہے۔ دیکھیے یہ دو شعر

اس خموشی کی کہانی اور ہے　　اب کے میری بے زبانی اور ہے
جو سنا تم نے فقط تمہید تھی　　اس کے آگے کی کہانی اور ہے

حسن امام قاسمی کے یہاں معانی و مضامین میں ایک قسم کا تسلسل ہے، اشعار اور مصرعوں میں باہم ربط و انسلاک ملتا ہے، غزل کی جس ریزہ کاری اور منتشر خیالی کو کچھ

سخت گیر ناقدین نے نشانہ بنایا ہے، اس سے ہمارے شاعر نے کہیں کہیں دامن بچایا ہے، بلکہ میں یہ کہوں تو بے جا اور غلط نہ ہوگا کہ ان کے یہاں اکثر غزلوں پر غزل مسلسل کا گمان ہوتا ہے، دیکھیے ایک غزل کے چند اشعار، جس میں مضامین کا تسلسل ہے:

روگ دل سے لگا کے بیٹھا ہوں — اپنا سب کچھ لٹا کے بیٹھا ہوں
جانے کب سے میں ان نگاہوں میں — تیری صورت بسا کے بیٹھا ہوں
تاکہ تیرا وجود روشن ہو — اپنی ہستی مٹا کے بیٹھا ہوں

حسن امام قاسمی محبت، اخوت و ہمدردی، اور دل دردمند کے حامل شاعر ہیں، انھیں معاشرتی اقدار اور انسانوں سے محبت ہی نہیں، جنون کی حد تک لگاؤ ہے، شاید اسی لیے وہ شاعری اور ادب کو تجارت نہیں، بلکہ عبادت یقین کرتے ہیں ۔

ہے بیع و شرا سے کہیں ماورا یہ — ادب ہے عبادت تجارت نہیں ہے

مجموعہ کے شروع میں معتبر ناقدین کی رائیں حرف اعتبار کے طور پر موجود ہیں، حقانی القاسمی، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی، ڈاکٹر نسیم احمد نسیم، ڈاکٹر ریحان غنی، پروفیسر شکیل قادری نے اس مجموعے پر اپنی تنقیدی رائے پیش کی ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنوں آشنا کا شاعر ناقدین کے یہاں بھی معتبر و مستند بننے کی راہ پر ہے۔ مشہور تخلیقی ناقد حقانی القاسمی نے کتاب کی پشت پر لکھا ہے:

''حسن امام کی شاعری ان کے مشاہدات، محسوسات اور متنوع تجربات کا نگارخانہ ہے۔ انھوں نے اپنے داخلی ارتعاش اور خارجی اضطراب کو پر اثر آہنگ میں ڈھالا ہے۔ وہ جس تہذیب اور روایت کے پروردہ ہیں، وہاں انسانیت اور محبت کو اعلیٰ قدر کی حیثیت حاصل ہے، اس لیے ان کی شاعری میں تعمیری، مثبت انداز فکر اور مقصدیت نمایاں ہے۔ زندگی کی گم شدہ قدروں اور کھوئی ہوئی سمتوں کی تلاش سے ان کی شاعری عبارت ہے۔ ان کے یہاں ہماری معاشرت اور ثقافت کے حوالے ہیں اور وہ اجالے بھی جن سے ہمارے سماج کا ربط ٹوٹتا جارہا ہے۔''

مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی لکھتے ہیں ''حسن امام حسن کی شاعری زمانے کی آواز ہے، ان کے خیالات فلسفیانہ نہیں ہیں، بلکہ عام دلوں کی آواز ہیں، خیالات کو شعر میں ڈھالنے کے لیے جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں وہ انتہائی سادہ اور آسان ہیں۔''

حسن امام قاسمی زمانی اعتبار سے میدان شاعری میں نو وارد تو ہیں، مگر ان کے یہاں ارتقا و ارتفاع کے بے شمار امکانات موجود ہیں۔ میری تمنا ہے کہ وہ اسی طرح اپنی جنوں آشنائی کا اظہار شعر کے جادوئی سانچے میں کرتے رہیں اور قارئین کو اپنے شعری گلستان کے گل بوٹوں سے فیضیاب کرتے رہیں۔

لفظوں کی سازش (شعری مجموعہ)

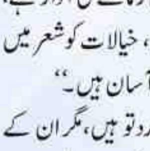

مصنفہ: شاذیہ نیازی
ضخامت: 160
سال اشاعت: 2020
ناشر: کریٹو اسٹار پبلی کیشنز، دہلی
مبصر: نیلوفر پروین، کچی ٹولہ، وارڈ نمبر 24، پوسٹ وضلع: ارریہ۔ 854311 (بہار)

'لفظوں کی سازش' شاذیہ نیازی کا پہلا شعری مجموعہ ہے جس کا انتساب انھوں نے اپنے والد محترم تسلیم نیازی کے نام کیا ہے جو مشہور و معروف استاد شاعر رہے ہیں۔ شاذیہ غزل کی شاعرہ ہیں اور ان کی غزلیں پڑھ کر موضوع و پیشکش میں تازگی اور انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کا شعری مجموعہ 'لفظوں کی سازش' کے مطالعے کے بعد ان کی شاعری کی انفرادو امتیاز کے مزید کئی در وا ہوئے۔ اس مجموعہ میں شامل جن حضرات نے شاذیہ نیازی کے کلام کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے ان میں سلیم سرفراز اور سید رومان انجم قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے مدلل انداز میں شاذیہ نیازی کے فکر و فن پر روشنی ڈالی ہے۔ میں ذاتی طور پر ان کے آرا سے متفق ہوں۔

سرزمین بنگال سے ہمیشہ ہی ادب و ثقافت کے حوالے سے نئے ٹیلنٹ سامنے آتے رہے ہیں۔ شاذیہ نیازی بھی ان میں سے ایک ہیں۔ حیرت اور خوشی کا مقام یہ ہے کہ شاذیہ نیازی نے اشعار کو فنی پیکر میں ڈھالنے کے لیے اپنی الگ راہ نکالی ہے جو پرخطر بھی ہے اور پر اثر بھی۔ وہ سیدھے سچے اور آسان لفظوں میں معصومیت کے ساتھ گہری اور فکر انگیز باتیں کہہ جاتی ہیں۔ بیشتر اشعار میں نسوانی کیف ونشاط ونفسیات کی عمدہ عکاسی ہوئی ہے، مگر ایک جرأت مندانہ اقدام کے ساتھ کہ اب متوسط طبقے کی گھریلو لڑکیوں نے بھی ظلم و ستم کے خلاف احتجاج بلند کرنا اور اپنا جائز حق مانگنا سیکھ لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عصری حسیت کا تقاضا بھی ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

صلح تو اک روز ہونی ہے — آج کی بات کیوں نہیں کرتے
ہاں مجھے عشق کی تمیز نہیں — آپ حضرات کیوں نہیں کرتے
نئے نئے سے یہ انداز چھو رہے ہیں مگر — میں تم کو پھر سے پرانا نہیں بنا سکتی

شاذیہ نیازی کی شاعری میں تانیثی توانائی کو تمکنت اور وقار کے ساتھ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ انداز تخاطب عاجزانہ نہیں بلکہ بیباکانہ ہے۔ انانیت میں خودداری کی جھلک ان اشعار میں در آئی ہے ۔

میں اکیلی ہی خود پرست نہیں — دکھ رہے ہیں انا میں سب تنہا
آپ کس ملک کے شہنشہ ہیں — مجھ کو کہتے ہیں بے ادب تنہا
شاذیہ چھوڑ مت اصولوں کو — تجھ پہ جچتا ہے یہ لقب تنہا

شاذیہ نیازی کے شعری ڈکشن واقعی ان پر جچتے بھی ہیں اور ان کی ایک الگ شناخت کا حوالہ بھی بنتے ہیں۔ وہ سیاسی اور سماجی سرگرمیوں سے بھی باخبر رہتی ہیں اور طنز کے تیروں سے گھائل کرنا بھی انھیں آتا ہے ۔

کچھ بیخبر سے لوگوں مل جائے تو خبر — پڑھتی رہی یہ سوچ کے اخبار دیر تک
باپ دولت مند، بیٹی خوبصورت مہ جبیں — آپ کی اس مرتبہ تو لاٹری اچھی لگی

شاذیہ نیازی نے بڑی فن کاری سے ایسے الفاظ و اشیا کو اپنی شاعری میں برتا ہے جن پر عام طور سے دھیان نہیں جاتا۔ مثلاً ۔

تجھے محسوس ہو جائے گا میرے ہجر کا صدمہ — میں ایسا ذائقہ اس بار بریانی میں رکھوں گی
حد ہی وہ مجنوں صفت کرنے لگا — مجھ پہ گرتی چھپکلی کا شکریہ

بریانی میں ہجر کے صدمے کا مسالہ اور مجنوں صفت شخص سے نجات کے لئے چھپکلی کا سہارا نسوانی تجربے و مشاہدے کی اچھی اور سچی مثالیں ہیں۔

مشہور و معروف شاعر کی صاحبزادی ہونے کے ناطے کئی طرح کے اندیشوں اور وسوسوں کا در آنا فطری ہے۔ سید رومان انجم رقمطراز ہیں کہ'' شاذیہ پر تسلیم نیازی کی دختر ہونے کا ایک بڑا دباؤ اور چیلنج ہوگا۔'' مگر شاذیہ نیازی نے اپنے ایک شعر میں ان اندیشوں کو دور کرتے ہوئے کہا کہ ۔

اگرچہ میں بیٹی ہوں تسلیم جی کی — مگر اپنے بوتے یہ سب لکھ رہی ہوں

شاذیہ نیازی کی شاعری کی بنیادی خصوصیات میں موضوع کا تنوع، روزمرہ کے الفاظ کا حسی وصوتی پیکر، لب لہجے کا بانکپن اور پیشکش کی ندرت خاص طور سے قابل ذکر ہیں، انھوں نے مختصر اور آسان بحر میں اچھی غزلیں کہی ہیں۔

شاذیہ نیازی کے اس شعری مجموعے کا تنقیدی محاسبہ اور تعین قدر تو آنے والا زمانہ کرے گا مگر امکان اغلب ہے کہ ارض بنگال سے ایک ایسی چونکا دینے والی شاعرہ سامنے آئی ہیں جن کی شعری تخلیقات میں پروین شاکر، زہرہ نگاہ، عذرا پروین، فہمیدہ ریاض اور شہناز نبی کے تیور کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ شاذیہ نیازی کے شعری مجموعے 'لفظوں کی سازش' کا فراخ دلی سے خیر مقدم کیا جائے گا۔

سرمایۂ تنہائی

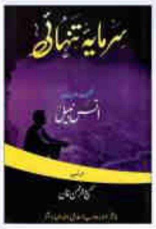

شاعر: انس نبیل

صفحات: 230، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: ادارہ ادب اسلامی ہند، مہاراشٹر

مبصر: ڈاکٹر محسن امین

نزد حنیف کیرانہ شاپ، اکبر پلاٹ، اکوت فائل، اکولہ، مہاراشٹر

فنون لطیفہ میں شاعری اپنا ایک امتیازی مقام رکھتی ہے۔ یہ دلی جذبات، خیالات واحساسات کا بہترین ذریعۂ اظہار ہے۔ اس کا استعمال شاعر بہ حسن وخوبی کرتا ہے کیونکہ شاعر فطری طور پر بہت زیادہ حساس ہوتا ہے۔ شاعری میں غزل سب سے زیادہ ممتاز مقام رکھتی ہے۔ کلاسیکل شعرا سے دور جدید کے شعرا تک تمام ہی نے غزل میں ہر دور کے لحاظ سے مختلف موضوعات پر شاعری کی ہیں۔ یہ سلسلہ دور حاضر میں بھی جاری ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ غزل کے مجموعوں کی اشاعت میں روزافزوں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

کلام 'سرمایۂ تنہائی' علاقہ برار کے منفرد لب ولہجہ کے شاعر انس نبیل کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ جو ایک حمد، ایک نعت اور 123 غزلوں پر مشتمل ہے۔ انس نبیل کی ولادت ضلع بلڈانہ (مہاراشٹر) کے تعلقہ کھام گاؤں میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم واعلیٰ تعلیم اپنے وطن میں ہی مکمل کی۔ گریجویشن کے بعد اردو اور انگریزی مضامین میں پوسٹ گریجویشن کیا۔ علاوہ ازیں اردو مضمون میں ہی نیٹ اور سیٹ امتحانات نمایاں نمبرات سے کوالیفائی کیے۔ اس کے علاوہ انھوں نے فارسی میں ڈپلومہ بھی کیا ہے فی الوقت اردو میں نعت گوئی پر تحقیقی کام انجام دے رہے ہیں۔

انس نبیل کا تعلق برار کے ایک علمی وادبی خانوادے سے ہے۔ جس کے سبب بچپن سے ہی اردو ادب سے دلچسپی رہی، نتیجتاً انھوں نے کم عمری میں ہی شاعری کا آغاز کردیا کہا۔ ابتدا میں کھام گاوں کے ماہر عروض محترم سبحان انجم صاحب سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ اکولہ میں منتقلی کے بعد علاقۂ برار کے استاد شاعر فصیح اللہ نقیب صاحب کی شاگردی اختیار کی۔ انس نبیل دنیائے اردو ادب کا وہ تابندہ ستارہ ہے جس نے اپنے منفرد لہجے، ندرت کلام اور تحقیقی صلاحیت کے سبب اپنا لوہا منوایا ہے۔

'سرمایۂ تنہائی'' کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انس نبیل کی غزلوں میں سادگی، تازگی اور شگفتگی کے ساتھ ساتھ سلاست وروانی بھی ہے۔ انھوں نے اپنے مشاہدات و تجربات کو بروئے کار لاتے ہوئے سلیقہ مندی کے ساتھ بڑے اچھے اشعار کہے ہیں۔ جس میں حالات وواقعات، حادثات، عصری مسائل، حسن وعشق، کرب والم، تنہائی کا درد، لذت وصل، غم فراق، خودداری اس طرح کے بیسیوں فنی محاسن موجود ہیں۔ جو مشام جاں کو اپنی خوشبوؤں سے معطر کرتے ہیں۔

انس نبیل کی غزلوں میں ایمائیت، رمزیت، اختصار، جامعیت، غنائیت جیسے غزل کے لوازمات کے ساتھ ساتھ تغزل بھی بدرجہ اتم موجود ہے جو قارئین وسامعین کو مسحور کردیتے ہیں۔ وہ اپنے اشعار میں رنگِ تغزل بھرنے کے لیے لفظوں کی نئی نئی ترکیبوں کا استعمال کرتے ہیں جو نوجوانوں کے دلوں کو موہ لیتی ہیں۔ ان کے اشعار میں تغزل کی فراوانی ملاحظہ فرمائیں۔

مزاج، مشغلے، جذبات، دل، بدن، لہجہ
ہر اعتبار سے ہوتی ہیں لڑکیاں نازک

برتی برف ہو کشمیری سیب پر جیسے
کچھ ایسے اشک رخِ نازنیں پہ چلتے ہیں

یہ ہوائیں اس کے رخساروں کو چھو کر آگئیں
اُن ہواؤں سے اٹھے گا ایک شعلہ دیکھنا

رونے سے لکیریں مرے چہرے پہ بنی ہیں
ہنسنے سے گڑھے آپ کے گالوں میں پڑے ہیں

مختصر یہ کہ شعری مجموعہ 'سرمایۂ تنہائی' کئی خوبیوں سے آراستہ ہے۔ کتاب نہایت خوب صورت، سرِ ورق عمدہ اور کمپوزنگ بے عیب ہے۔ اس کتاب کو قارئین سے خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوگی اور یہ مجموعہ اُن کے شعری سفر کا ایک سنگِ میل ثابت ہوگا۔

قلم نبیل کا ہموار کر کے چھوڑے گا
غزل کی دنیا کی دشوار تر زمینوں کو

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت ومعنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم وہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی ومعروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

آزادی کے 75 سال میں ہندوستان کی حصولیابیاں قابلِ فخر: پروفیسر شیخ عقیل احمد

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام پرچم کشائی کی تقریب

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے زیر اہتمام 75 ویں یوم آزادی کے موقعے پر پرچم کشائی کی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل کے ذریعے پرچم کشائی کی گئی۔ اس موقعے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ آج ہم اپنے وطن عزیز کی آزادی کے 75 سال کی تکمیل کا جشن منا رہے ہیں جو یقیناً تمام ہندوستانیوں کے لیے بے پناہ خوشی اور مسرت کی بات ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس عرصے میں ہمارے ملک نے غیر معمولی کامیابیاں حاصل کی ہیں اور ہر میدان میں ہندوستان نے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ اس آزادی کو برقرار رکھنا اور اس کی حصولیابیوں میں اضافہ کرتے رہنا ہم تمام شہریوں کی ذمے داری ہے۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ حکومت آزادی کے 75 سال مکمل ہونے پر 'آزادی کا امرت مہوتسو' منا رہی ہے جس کا سلسلہ اگست 2023 تک جاری رہے گا، یہ روایتی معنوں میں محض جشنِ آزادی نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد ہندوستان کی 75 سالہ کامیابیوں سے پوری دنیا کو روشناس کروانے اور ملک کو نئی بلندیوں تک پہنچانے کے لیے حکومت کی طرف سے کی جانے والی کاوشوں سے باخبر کرنے کے ساتھ نئی نسل کو اپنے ملک کی ہمہ گیر تعمیر و ترقی کے لیے حوصلہ مند و پرجوش بنانا بھی ہے۔ اس کے تحت ہندوستان اپنی کامیاب سفارت کاری کے ذریعے پوری دنیا کو اپنے قریب لا رہا ہے۔ مختلف ملکوں کے ساتھ اپنے علمی اور ثقافتی تعلقات کو مزید مضبوط کر رہا ہے، سائنسی نقطہ نظر کو فروغ دے رہا ہے، ماحولیات اور معیشت کے درمیان توازن برقرار رکھتے ہوئے پائیدار ترقی کے اہداف کو حاصل کرنے کی سمت میں کام کر رہا ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ آزادی کا امرت مہوتسو ہندوستان کی صدیوں پرانی اس ثقافتی وراثت کی نمائندگی کرتا ہے جس کی بنیاد عالمی اخوت، انسانیت نوازی اور بھائی چارے پر ہے۔ پروفیسر شیخ عقیل نے تحریک آزادی میں اردو زبان کے غیر معمولی کردار پر بھی روشنی ڈالی اور کہا کہ آزادی کی تحریک کے دوران اردو کے صحافیوں، شاعروں اور ادیبوں نے اپنی منظوم و منثور تخلیقات اور بیباکانہ صحافت کے ذریعے مجاہدین آزادی کے دلوں میں جوش و جذبہ پیدا کیا۔ انھوں نے کہا کہ آج بھی اردو زبان ملک میں اتحاد، یکجہتی، بھائی چارہ اور اخوت کا ماحول قائم کرنے میں اہم رول ادا کر رہی ہے۔ تقریب پرچم کشائی میں کونسل کا عملہ بھی موجود رہا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 15 اگست 2022

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے لٹریچر پینل کی میٹنگ

نئی دهلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں لٹریچر پینل کی میٹنگ منعقد ہوئی جس کی صدارت پروفیسر مظفر علی شہ میری نے کی۔ پروفیسر شیخ عقیل احمد نے میٹنگ کے شرکا کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ طویل وقفے کے بعد قومی اردو کونسل میں

آپ جیسے اہل علم وفضل کے اجتماع سے دلی مسرت ہورہی ہے۔ کورونا کی پابندیوں کے خاتمے کے بعد کونسل کی تمام سرگرمیاں حسب سابق آف لائن شروع ہوچکی ہیں، یہ میٹنگ بھی اسی سلسلے کا حصہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ لٹریچر پینل کونسل کا ایک اہم پینل ہے جس کے تحت وقیع علمی، ادبی وتنقیدی کتابیں شائع کی جاتی ہیں اور اس کی منظوری سے اب تک گراں قدر کتابیں شائع کی جاچکی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کونسل کے پیش نظر اردو زبان کی ہمہ جہت ترقی ہے اور اس کے لیے ہم آپ حضرات کی تجاویز اور مشوروں کا دل سے استقبال کرتے ہیں اور انھیں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جائے گی۔ اس میٹنگ میں پینل کی سابقہ میٹنگ میں پیش کردہ تجاویز کی تصدیق اور اس کے تحت چلنے والے مختلف پروجیکٹس پر غور وخوض کیا گیا، ساتھ ہی متعدد نئے اشاعتی منصوبے بھی زیر بحث آئے۔ اس دوران میٹنگ کے شرکا نے اپنی تجاویز پیش کیں، جن پر گفتگو کے ساتھ انھیں روبعمل لانے پر زور دیا گیا۔ اس میٹنگ میں پینل کے تحت جاری اشاعتی منصوبوں پر گفتگو کے علاوہ شرکا نے کہا کہ اردو زبان میں ہندوستان کی دوسری علاقائی زبانوں کے شاہکار ادب کے ترجمے، اسی طرح اردو کے نمایندہ ادبی شہ پاروں کو دوسری علاقائی زبانوں میں منتقل کرنے کے سلسلے میں ایک منظم منصوبہ بندی کی جائے اور مختلف زبانوں اور ان کے قارئین کو باہم مربوط کرنے کے لیے کونسل کے زیر اہتمام اس منصوبے پر عمل کیا جائے۔ ڈائریکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد اور میٹنگ کے چیئرمین پروفیسر مظفر علی شہ میری نے اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک مفید تجویز ہے اور اس سلسلے میں ضروری اقدام کیا جائے گا۔ اسی طرح اس میٹنگ میں اردو کے کلاسیکی ونصابی ناولوں کی کونسل کے زیر اہتمام اشاعت کی تجویز بھی منظور کی گئی، اس کے تحت طلبہ کی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کلاسیکی ونصابی ناولوں کو از سر نو شائع کیا جائے گا، تاکہ یہ کتابیں ان تک بہ آسانی پہنچائی جاسکیں۔

اس میٹنگ کے دیگر شرکا میں پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی، پروفیسر قاضی جمال حسین، ڈاکٹر نریش، پروفیسر قاضی حبیب احمد، پروفیسر شبنم حمید، ڈاکٹر قدسیہ قریشی اور ڈاکٹر نگولن کنڈ وتھ ولپل کے علاوہ کونسل سے ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر) اور محمد انصر (ریسرچ اسسٹنٹ) وغیرہ موجود رہے۔ پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 4 اگست 2022

صوفیائے ہند کے تذکرے پر مشتمل انسائیکلوپیڈیا کی تیاری کے سلسلے میں قومی اردو کونسل میں اہم میٹنگ

نئی دهلی: پچھلی صدیوں میں ہندوستانی معاشرے کو ہم آہنگی، اخوت اور بھائی چارے کی مثال بنانے میں صوفیائے کرام کا نہایت اہم رول رہا ہے اور ہندوستان جس تہذیبی تنوع اور ثقافتی ہمہ رنگی کے حوالے سے اپنی شناخت رکھتا ہے اس کے تحفظ اور فروغ میں انھوں نے غیر معمولی کردار ادا کیا ہے، اسی طرح اردو زبان وادب کے ابتدائی نقوش بھی صوفیائے ہند کے یہاں ملتے ہیں۔ ان کے اسی کردار کو موجودہ ماحول میں نمایاں کرنے اور سماجی ہم آہنگی و باہمی تفاہم پر مبنی ان کی تعلیمات کو عام کرنے کی غرض سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے مشاہیر صوفیائے ہند کا انسائیکلوپیڈیا شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے اور اسی سلسلے میں اس شعبے کے ماہرین اور سکالرز کی ایک میٹنگ آج کونسل کے صدر دفتر میں منعقد کی گئی۔ جس کی صدارت خانقاہ شاہ ارزانی، پٹنہ کے سجادہ نشیں پروفیسر سید شاہ حسین احمد نے کی۔ اس موقعے پر تمام مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کونسل کے ڈائریکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ صوفیائے کرام کا

ہندوستانی سماج میں ہم آہنگی اور بھائی چارہ قائم کرنے میں اہم رول رہا ہے اور انھوں نے اپنے دور میں اس ملک کو امن وامان اور اخوت وسلامتی کا گہوارہ بنانے کی غیر معمولی کوششیں کی ہیں، ان کی تمام تر تعلیمات بھی خالص اخلاقی وانسانی اقدار پر مبنی ہیں، انھوں نے ہمیشہ انسان دوستی کی تعلیم دی اور تمام مخلوقاتِ خداوندی سے محبت ان کا شیوہ تھا، یہی وجہ ہے کہ بلا کسی مذہبی تفریق کے ان کے گرد عوام اور عقیدت مندوں کا ہجوم ہوتا تھا اور آج بھی ان کی تعلیمات و پیغامات میں وہی تاثیر ہے، مگر ان کے تعلق سے یکجا مستند معلومات نہیں ملتی ہیں، اسی وجہ سے قومی اردو کونسل نے یہ طے کیا ہے کہ تمام مشاہیر صوفیائے ہند کا ایک انسائیکلوپیڈیا تیار کیا جائے جس میں ان کی تہذیبی، تبلیغی، ثقافتی وادبی خدمات کے ساتھ سماجی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کے تعلق سے کیے گئے ان کے کارناموں کو اجاگر کیا جائے، کیوں کہ موجودہ ماحول میں اس کی بہت زیادہ ضرورت ہے اور صوفیا کی تعلیمات کو اپنا کر ہم سماجی انتشار وخلفشار سے بحسن وخوبی نجات پاسکتے ہیں۔ میٹنگ میں شریک اہلِ علم ودانش نے اس منصوبے کے لیے پروفیسر شیخ عقیل احمد اور کونسل کی تحسین وستایش کی اور کام کی نوعیت، طریقۂ کار، منصوبہ بندی، مدتِ کار اور اشاعت وغیرہ کے مراحل پر سبھوں نے اپنی رائیں پیش کیں، جن پر غور وخوض اور تبادلۂ خیال کیا گیا۔ میٹنگ میں طے پایا کہ پہلے مرحلے میں مختلف اصحابِ علم وقلم کے ذریعے پورے ملک کے کم وبیش دو سو مشاہیر صوفیا کے تذکرے پر مشتمل پہلی جلد آئندہ چھ ماہ میں تیار کروائی جائے، جو نظر ثانی ودیگر تکنیکی مراحل کی تکمیل کے بعد سال بھر کے اندر شائع ہوجائے گی۔ اس کے بعد آگے کی جلدوں پر کام کروایا جائے اور علمی وتحقیقی استناد کے ساتھ مختلف عہد کے اہم صوفیا اور ان کی علمی، ادبی وثقافتی اور سماجی خدمات وتعلیمات کے احاطے کی کوشش کی جائے۔

پروفیسر سید شاہ حسین احمد کے شکریے کے ساتھ میٹنگ کا اختتام عمل میں آیا۔ اس میٹنگ میں پروفیسر حدیث انصاری (اودے پور)، پروفیسر فریدہ خانم (دہلی)، پروفیسر نشاط منظر (دہلی)، ڈاکٹر زین رامش (جھارکھنڈ)، ڈاکٹر مشکور عالم (آسنسول)، ڈاکٹر افتخار احمد (کولکاتا)، مولانا مبارک حسین مصباحی (اعظم گڑھ)، ڈاکٹر فیروز عالم (چھپرہ)، ڈاکٹر آبرو امان اندرابی (جموں وکشمیر) اور کونسل سے ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر) و آبگینہ عارف (ٹیکنکل اسسٹنٹ) وغیرہ موجود رہے۔ پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 10 اگست 2022

مشہور شاعر طالب رامپوری نے تحریر کیا قومی اردو کونسل کا ترانہ

نئی دھلی: اردو کے سینئر شاعر طالب رامپوری نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا ایک خوب صورت ترانہ تیار کیا ہے جس کی پذیرائی کی تقریب آج کونسل کے صدر دفتر میں منعقد کی گئی۔ اس موقعے پر ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ میری دلی خواہش تھی کہ دیگر علمی و ادبی اداروں کی طرح کونسل کا بھی اپنا ترانہ ہونا چاہیے جس سے مختصراً اس کا تعارف ہو اور اسے کونسل کے پروگراموں میں پیش کیا جاسکے، کئی شاعروں سے میں نے اپنی خواہش کا اظہار بھی کیا، مگر بات نہیں بن سکی، لیکن کچھ دنوں پہلے جب طالب صاحب سے میری ملاقات ہوئی اور میں نے ان سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو انھوں نے نہ صرف خوش دلی سے مثبت جواب دیا، بلکہ بڑی محبت سے ترانہ تیار کرکے لائے جو آج آپ لوگوں کے سامنے ہے۔ جلد ہی اس ترانے کو باقاعدہ بہترین آڈیو- ویڈیو کے ساتھ کمپوز کیا جائے گا اور یہ کام بھی طالب رامپوری صاحب ہی اپنے طور پر کروارہے ہیں جس کے لیے ہم ان کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں۔ اس موقعے پر نمونے کے طور پر معروف سنگیت کار استاد سخاوت علی خاں اور ان کی صاحب زادی کی آواز میں گائے ہوئے چند مصرعے شرکائے محفل کو سنائے گئے، جنھیں سبھوں نے پسند کیا۔ محترمہ آبگینہ عارف نے حاضرین کو مکمل ترانہ پڑھ کر سنایا۔ پروفیسر شیخ عقیل احمد نے اس ترانے کے حوالے سے بتایا کہ اسے تیار کرنے میں شاعر نے تمام فنی و شعری نزاکتوں کو ملحوظ رکھا ہے اور کونسل کی خدمات اور اسکیموں کا بھی اختصار کے ساتھ تعارف کروایا ہے، شاعروں اور ماہرین فن نے اس کی لفظیات و مشمولات کو سراہا ہے، چنانچہ ہم نے کونسل کے آفشیل ترانے کے طور پر اسے اپنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس موقعے پر کونسل کے تمام عملہ کے علاوہ روزنامہ دورجدید کے ایڈیٹر ایس ٹی رضا بھی موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 1 اگست 2022

'آزادی کا امرت مہوتسو' کے ضمن میں قومی اردو کونسل کے زیراہتمام آن لائن بین الاقوامی طرحی مشاعرے کا انعقاد

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیراہتمام آزادی کا امرت مہوتسو کے ضمن میں ایک آن لائن بین الاقوامی طرحی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ اس محفل مشاعرہ کے آغاز میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا اور تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے اس مشاعرے کی اہمیت و معنویت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ اس طرحی مشاعرے کے لیے اقبال کے مصرعے 'میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے/ میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے' کا انتخاب اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ مصرعے محض حب الوطنی کا نمونہ نہیں ہیں، بلکہ اس میں ہندوستان کی عظمت و رفعت کو بھی بڑی خوب صورتی اور اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جو لوگ اپنے ملک میں رہتے ہیں ان کے دلوں میں حب الوطنی کے جذبات تو موجزن رہتے ہی ہیں مگر جو لوگ اس ملک میں پیدا ہوئے لیکن تلاش معاش یا دیگر ضروریات کی وجہ سے اپنے ملک سے باہر رہتے ہیں ان کے دل اپنے وطن کی یاد سے زیادہ معمور رہتے ہیں اور وہ اپنے ملک کا ذکر سنتے ہی جذباتی ہوجاتے ہیں۔ دور رہ کر بھی اپنے وطن سے جذباتی قربت محسوس کرتے ہیں۔ خصوصاً جو تخلیق کار اور شاعر و ادیب ہوتے ہیں ان کے دلوں میں اپنے وطن سے محبت زیادہ گہری ہوتی ہے، ہماری آج کی محفلِ مشاعرہ میں ایسے ہی شاعروں کو مدعو کیا گیا ہے جنھوں نے اپنی غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کا پوری دنیا میں لوہا منوایا اور ملک کی عظمت کا نقش قائم کیا ہے۔ شیخ عقیل نے کہا کہ ہمارے عزت مآب وزیر اعظم نریندر مودی جی کا ماننا ہے کہ ہمارے ملک کے جو ادبا و شعرا دوسرے ممالک میں مقیم ہیں، دراصل وہ ہمارے ملک ہندوستان کے ثقافتی سفیر کی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ ہندوستان کی خوب صورت و ہمہ گیر تہذیب و ثقافت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ڈائرکٹر موصوف نے اس موقعے پر یہ اعلان بھی کیا کہ اس مشاعرے میں شریک شعرائے کرام کا کلام جلد ہی قومی اردو کونسل کتابی شکل میں شائع کرے گی۔

اس تاریخی مشاعرے کی صدارت مشہور شاعر ریحان خان (دبئی) نے کی اور تین گھنٹے سے زائد جاری رہنے والی اس محفل میں مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے تیس سے زائد شعرا نے شرکت کی اور حب الوطنی پر مشتمل اپنے گراں قدر کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ جن شعرا نے اس مشاعرے میں کلام پیش کیا ان میں افروز عالم (جدہ)، امن حیدر زیدی (دبئی)، حافظ امیر اعظمی (العین)، عزیز نبیل (دوحہ)، حنا عباس (دبئی)، افتخار راغب (دوحہ)، مادھو نور (شارجہ)، قاسم فراہی شاز (ابوظبی)، سرور نیپالی (شارجہ)، شاداب الفت (شارجہ)، شہباز شمسی (ابوظبی)، مقصود انور (دوحہ)، شمس الحق (شارجہ)، رفیق شاد اکولوی (دوحہ)، نصر نعیم (شارجہ)، مظفر حسین (دوحہ)، فیاض بخاری سید (دوحہ)، عامر قدوائی (کویت)، فیضی اصلاحی (بحرین)، ندیم ماہر (دوحہ)، فطین اشرف صدیقی (عمان)، وصی بستوی (دوحہ)، مہتاب قدر (سعودی عرب)، خورشید علیگ (بحرین)، اشفاق دیشمکھ (دوحہ)، فریدہ نثار انصاری (دوحہ)، ندیم جعفر جیلانی دانش (یوکے)، اطہر اعظمی صدیقی (دوحہ) شامل ہیں۔ جب کہ نظامت کے فرائض جناب مسعود حساس نے انجام دیے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 12 اگست 2022

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

دہلی میں علما و مشائخ

نئی دھلی: دہلی اردو اکادمی کے زیر اہتمام توسیعی خطبات سیریز بعنوان دہلی کی تاریخ و ثقافت کے تحت تیسرا توسیعی خطبہ ممتاز اسکالر پروفیسر شریف حسین قاسمی نے پیش کیا۔ دہلی کے علما و مشائخ پر خطبہ پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ دہلی میں تقریباً ہزار مدارس موجود تھے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علما بھی تھے اور کثرت سے صوفیاء کرام بھی موجود تھے جو اپنی خانقاہوں میں رشد و ہدایت دے رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ شہر دہلی میں 210 مقبرے صوفیاء کرام کے موجود تھے، جن کا مختلف سلسلوں سے تعلق تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ تاریخ و ثقافت سے ریٹائرڈ پروفیسر سنیتا زیدی نے اپنی صدارتی تقریر میں توسیعی خطبے کے تعلق سے سیر حاصل گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ خواتین صوفیا اور صوفیاء کرام کی ماؤں اور بہنوں پہ بھی گفتگو کی جانی چاہیے۔ ان کے علاوہ پروفیسر سید عنایت علی زیدی نے بھی تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے اہم گفتگو کی۔ مہمانوں میں اردو اکادمی دہلی کی گورننگ کونسل کے ممبران میں جاوید رحمانی، اسرار قریشی اور سابق ممبر فریدالحق وارثی نے شرکت کی۔ جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر نورین علی حق نے انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 جولائی 2022

غالب اکیڈمی میں ادبی نشست

نئی دھلی: غالب اکیڈمی نئی دہلی میں ماہانہ ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر جی آر کنول نے کی۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ سبھاش چندر بوس کو اردو سے محبت تھی، انھوں نے جے ہند کا نعرہ دیا۔ ان کی فوج انڈین نیشنل آرمی کی رابطے کی زبان اردو تھی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شاداب تبسم نے شہپر رسول کی نظمیہ شاعری پر ایک مقالہ پڑھا۔ چشمہ فاروقی نے آزادی کی کہانی دادی اماں کی زبانی کے عنوان سے ایک مضمون پڑھا۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے خواجہ حسن نظامی کی کتاب غالب کا روزنامچہ پر ایک مضمون پڑھتے ہوئے کہا کہ غالب کے خطوط کے حوالے سے یہ ایک غیر معمولی کتاب ہے جس میں 1857 سے 1860 تک غدر کے اہم واقعات کو غالب کے خطوط سے اخذ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ کولکاتا کے مہمان ایتاب دتا نے کہا کہ اردو بہت پیاری زبان ہے، اپنی شیرینی کی وجہ سے کشش رکھتی ہے۔ انھوں نے بنگالی میں ایک نظم پیش کی۔ اس موقعے پر موجودہ شعرا نے اپنے اشعار سے سامعین کو محظوظ کیا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 19 جولائی 2022

اتر پر دیش

ہمارے قومی رہنما اور اردو زبان و ادب

وارانسی: آزادی کے امرت مہوتسو میں ہمیں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ادب محض نعرے نہیں لگواتا بلکہ وہ انسان

کے اخلاقی اور روحانی اقدار کی تربیت کرتا ہے اور اسے داخلی سطح پر مثبت سمت عطا کرتا ہے۔ ہماری تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ کسی کتاب کا جواب کتاب ہی ہوسکتی ہے، اسے نذر آتش کرنا یا اس پر پابندی عائد کردینا کسی طرح مناسب نہیں۔ یہ سبق ہمیں سر سید احمد خان کی زندگی سے بھی ملتا ہے۔ شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی اور ساہتیہ اکادمی نئی دہلی کے اشتراک سے منعقدہ سمپوزیم بعنوان 'ہمارے قومی رہنما اور اردو زبان و ادب' میں پروفیسر شافع قدوائی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے متذکرہ خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ حسرت موہانی کی زندگی ہمیں حب الوطنی اور قوم پرستی کے مابین امتیازات کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر وجے بہادر سنگھ نے فرمائی۔ پروفیسر آفتاب احمد آفاقی (صدر شعبۂ اردو) نے اپنے استقبالیہ خطبے میں موضوع کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہم اپنے قومی ورثے سے طلبا کو واقف کرائیں اور اپنے وقت کے بہترین دانشوروں کو ان کے روبہ رو پیش کریں تاکہ وہ ان سے استفادہ کرسکیں۔ ساہتیہ اکادمی کے نمائندے ڈاکٹر انوپم تیواری نے اس پروگرام کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آزادی کے امرت مہوتسو کے پیش نظر یہ عنوان بہت اہم ہے۔ انھوں نے اکبر الہ آبادی اور برج نرائن چکبست کی نظموں کے حوالے بھی دیے۔ مہمان اعزازی پروفیسر فضل اللہ مکرم نے جنگ آزادی اور اردو ادب کے تعلق سے نظام حیدرآباد کی خدمات کا تعارف پیش کرتے ہوئے ان کے جذبۂ ایثار پر روشنی ڈالی۔ مشہور نقاد، صحافی اور شاعر شمیم طارق نے اس موضوع پر روشنی ڈالی کہ اردو شاعری اور نثر میں قومی رہنماؤں کی شان میں کس طرح قصیدے پڑھے گئے ہیں یا انھیں خراج تحسین پیش کیا گیا ہے، اس سلسلے میں انھوں علامہ اقبال، چکبست، اکبر، داغ، جوہر اور دیگر شعرا کے اشعار بطور حوالہ پیش کیے۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر مشرف علی نے انجام دی اور شکریہ کی رسم ڈاکٹر احسان حسن نے ادا کی۔

سمپوزیم کا تکنیکی اجلاس لنچ کے وقفے کے بعد شروع ہوا، جس کی صدارت پروفیسر یعقوب یاور نے کی، جس میں پروفیسر محمد علی جوہر، پروفیسر شہاب عنایت ملک، پروفیسر شاہینہ رضوی، پروفیسر ندیم احمد، پروفیسر عباس رضا نیر، پروفیسر محمد طاہر، ڈاکٹر احسان حسن اور جناب

جاوید انور نے مختلف قومی رہنماؤں کی اردو خدمات کے تعلق سے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر قاسم انصاری نے کی اور شکریے کی رسم ڈاکٹر عبدالسمیع نے ادا کی۔ سمپوزیم میں یونیورسٹی کے طلبا و ریسرچ اسکالرز کے علاوہ مختلف شعبوں کے اساتذہ پروفیسر رفعت جمال، پروفیسر شیو پرکاش شکل، پروفیسر آراین پاٹھک، ڈاکٹر دیپک، ڈاکٹر محمد اختر، پروفیسر حسن عباس، ڈاکٹر محمد عقیل، ڈاکٹر محمد مغیث، ڈاکٹر محمد ریحان، ڈاکٹر فیروز عالم، ڈاکٹر قمر عالم، ڈاکٹر افضل مصباحی وغیرہ نے شرکت کی۔

پریس ریلیز: عبدالسمیع، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، بی ایچ یو، وارانسی، 23 جولائی 2022

ملک کی آزادی میں اردو اخبارات کا کردار

لکھنؤ: ملک کی جنگ آزادی میں اردو اخبارات کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، جب ملک میں آزادی کا بگل پھونکا گیا تو اس کا اہم ذریعہ اردو اخبارات ہی تھے۔ اردو زبان کے اخبارات کے ذریعے انقلابیوں کا کلام اور پیغام ملک کے کونے کونے تک پہنچا۔ ان خیالات کا اظہار فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے چیئرمین تورج زیدی نے کیا۔ وہ 'آزادی کا امرت مہوتسو' کے تحت کمیٹی اور انسٹی ٹیوٹ آف ہیومن ریسورس، ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ سوسائٹی کے اشتراک سے منعقد یک روزہ سمینار و ایوارڈ تقریب سے خطاب کررہے تھے۔ سمینار کا موضوع 'ملک کی آزادی میں اردو اخبارات کا کردار' تھا۔ اس موقعے پر اخبارات اور مختلف میڈیا چینلز میں اردو ادب کے لیے کام کرنے والی 26 نامور شخصیات کو مومنٹو، شال اور سرٹیفکیٹ سے نوازا گیا۔ مولوی محمد باقر ایوارڈ سے نوازے جانے والے صحافیوں میں جابر جوراسی 'انقلاب' لکھنؤ کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر جیلانی خان علیگ، اکبر علی، وجاہت رضوی، ڈاکٹر طارق قمر، مرحومین وقار رضوی اور محمد علی کے نام شامل ہیں۔ 'مولانا حسرت موہانی ایوارڈ' سے عارف نگرامی، غفران نسیم، شکیل رضوی، علی طاہر رضوی، اسد رضوی، زبیر احمد، محمد مہدی عرفی، سرور حسین، صالحہ رضوی، اطہر کاظمی، احمر حسین، ظہیر ترابی، علی ساغر جعفری اور شاداب حسین کو نوازا گیا۔ اعظم حسین، محمد اطہر رضا، نجم الحسن، ندیم جعفر اور سجاد باقر کو اودھ کے پہلے فوٹوگرافر کے نام پر 'احمد علی خان ایوارڈ' سے سرفراز کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت صحافی احمد ابراہیم علوی نے کی۔ دیگر معزز مہمانوں میں اطہر نبی، پروفیسر صابرہ حبیب، امان عباس، روشن تقی اور باسط علی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر نزہت فاطمہ، ڈاکٹر یاسر جمال، تبسم خان، سید غلام عباس اور عبدالقدوس نے مقالے پیش کیے۔ نظامت ڈاکٹر مسیح الدین خان نے کی۔ مہمانوں کے ہاتھوں ایس این لعل کی تحریر کردہ کتاب 'تاریخ عزاداری اور اودھ' کا اجرا بھی عمل میں لایا گیا۔ اس کے علاوہ ہائی اسکول سے ریسرچ اسکالر تک 16 طلبا جنھوں نے اردو مضمون میں اچھے نمبرات حاصل کیے، انھیں بھی 'نشان اردو ایوارڈ' پیش کرتے ہوئے یادگاری سند اور سرٹیفکیٹ سے نوازا گیا۔ ان میں غلام عباس رضوی، صائمہ انصاری، عبدالقدوس، محمد رضی، محمد شہزاد، حیدر رضا، صوبیہ صدیقی، غزالہ تبسم، سمیہ خاتون، علیزہ فاطمہ، شازیہ خاتون، ناصرہ انصاری، شازیہ عثمانی، علینہ رضوی، منتشا پروین اور فائزہ بانو وغیرہ شامل ہیں۔ پروگرام کے آخر میں تنظیم کے سکریٹری ایس این لعل اور پروگرام کنوینر و ڈائرکٹر مظاہر رضا نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 جولائی 2022

میر تقی میر: کچھ یادیں، کچھ باتیں

لکھنؤ: میر اردو شاعری کے وہ عظیم غزل گو شاعر ہیں جن کو حیات جاوید حاصل ہے۔ میر اردو غزل کے مسلم

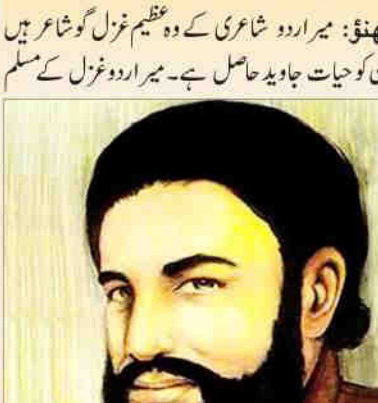

الثبوت استاد مانے گئے ہیں، میر کو اردو شاعری کا خدائے سخن کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کا اہم وصف قلبی واردات کا اظہار ہے۔ ان کی عظمت کا اعتراف بڑے بڑے شاعروں نے کیا ہے۔ ناسخ، ذوق، مومن اور مرزا غالب جیسے بلند پایہ شعرا میر کی عظمت کے قائل ہیں۔ مذکورہ خیالات کا اظہار مہمان خصوصی اطہر صغیر تورج زیدی چیئرمین فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی نے کرشنا گرام وکاس سیوا سنستھان لکھنؤ کے زیر اہتمام اور فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی اترپردیش کے مالی اشتراک سے رائل پیلس، بلوچ پورا، نخاس میں منعقد یک روزہ سمینار 'میر تقی میر کچھ یادیں کچھ باتیں' میں کیا۔ سمینار کی صدارت کرتے ہوئے کنور باسط علی نے کہا کہ میر کی شاعری ان کی زندگی کا عکس ہے۔ میر تقی میر نے آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں سوز و گداز، مایوسی و حرماں نصیبی، ناکامی و نامرادی، شب بیداری و اشک سوزی ہے۔ یہ ان کے ماحول اور حالات کی دین ہے۔ ان کی غزلوں میں تصوف کی جھلک بھی ہے۔ مہمان ذی وقار ضیاء اللہ صدیقی ندوی نے کہا کہ میر کی غزلوں میں زندگی کی تڑپ اور لگن ہے وہ بالکل مایوس ہوکر نہیں بیٹھ جاتے۔ وہ زندگی میں سرمستی اور کیف کا ایک گوشہ تلاش کرلیتے ہیں، ان کی غزلوں کے انداز بیان اور لہجہ نے صرف اپنے دور کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ اس کا اثر آج کے شعرا پر بھی بہت گہرا پڑا ہے۔ پروگرام کے کنوینر شیخ شاہ رخ حسن نے گل پوشی کرکے مہمانوں کا استقبال کیا اور افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ میر کی ساری زندگی حسرتوں کی ایک لمبی داستان ہے ان حسرتوں سے خود میر کو تکلیفوں کے سوا کچھ نہ ملا لیکن ان کے سبب اردو شاعری کو ایسا انمول خزانہ ہاتھ آیا جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔ مہمان اعزازی محمد نعیم اور شکراللہ نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ لفظوں کے ذریعے تصویر بنانا یعنی پیکر تراشی کلام میر کا وصف خاص ہے۔ یہ ایک ایسا شعری وسیلہ ہے۔ میر کے کلام میں شعری پیکر ہر طرف موتیوں کی طرح بکھرے نظر آتے ہیں۔ سمینار میں اپنے قیمتی مقالات میں ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی، ڈاکٹر نثار احمد، ڈاکٹر رفعت مہدی رضوی، تبسم فاروقی، رفیع احمد اور عبدلکریم ندوی وغیرہ نے کہا کہ الفاظ میر کے ہاتھوں میں پہنچ کر موم ہوجاتے ہیں اور وہ انھیں جس طرح چاہتے ہیں ڈھال لیتے ہیں۔ ان کے شعروں کا کمال ہے کہ وہ اس زمانے سے لے کر آج تک ہر دل پر اثر کرتے رہے ہیں اور ہمیشہ کرتے رہیں گے۔ ڈاکٹر مسیح الدین خان نے اپنے مخصوص انداز میں نظامت کرتے ہوئے کہا کہ میر کو بچپن ہی سے شعر و سخن کا بے حد شوق تھا۔ بچپن میں ہی شعر کہنے لگے تھے۔ میر کی زندگی بڑی بے چارگی اور پریشاں حالی میں گزری۔ دس سال کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ میر نے زندگی بھر غم اٹھائے اور پریشان حال رہے۔ پروگرام کے آخر میں کنوینر پروگرام اور سنستھان کے سکریٹری شیخ شاہ رخ حسن نے مہمانان اور مقالہ نگاران کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 6 جولائی 2022

پریم چند کا عہد اور سماج

وارانسی: پریم چند اردو اور ہندی کے نمائندہ فکشن نگار ہیں۔ دونوں زبانوں کے ادب میں ان کی خدمات مشترک

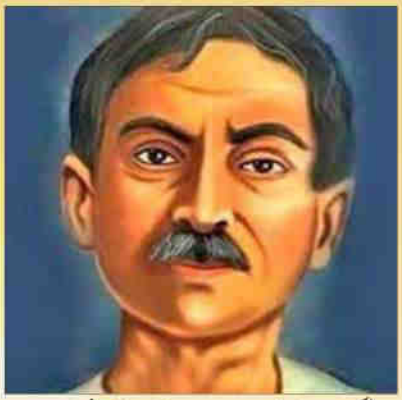

ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ اردو کے ہی کہانی کار ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں سے محروم ومظلوم طبقے میں نہ صرف بیداری پیدا کی بلکہ ذات پات اور امتیازی سلوک کے خاتمے میں کلیدی رول ادا کیا ہے، ان خیالات کا اظہار بنارس ہندو یونیورسٹی کے ریکٹر پروفیسر وی کے شکلا نے اپنے صدارتی خطبے میں کیا۔ منشی پریم چند شودھ ایوم ادھین کیندر لمہی وارانسی کے زیراہتمام منعقد سمینار میں یونیورسٹی کے فائننس آفیسر ڈاکٹر ابھے ٹھاکر نے بحیثیت مہمان اعزازی شرکت کی۔ انھوں نے کہا کہ پریم چند دنیا کے عظیم ادیبوں میں سے ایک ہیں۔ ان کا ادب آج بھی زندہ ہے اور سماج کو ایک نئی راہ دکھانے میں فعال کردار ادا کررہا ہے اس لیے ان کے سماجی نظریات کی اہمیت ہمیشہ باقی رہے گی۔ ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر وجے بہادر سنگھ نے استقبالیہ کلمات پیش کیے اور پریم چند کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اپیل کی کہ ان کے زیرنگرانی چلنے والے کیندر میں اردو ہندی کی تخلیقات اور پریم چند سے جڑی یادوں کو یکجا کیا جائے گا اس لیے محبان ہندی اردو اس سلسلے میں اپنا تعاون پیش کریں۔ پریم چند کی برسی کے موقعے پر منعقد اس سمینار میں کیندر نے دو اہم کتابوں کی اشاعت کی ہے جس کا اجرا عمل میں آیا۔ ایک کتاب پریم چند کے فن اور حالات زندگی پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے جب کہ دوسری کتاب بعنوان سوزوطن ہے جس میں پریم چند کے پہلے افسانوی مجموعہ سوزوطن کے متن کو ہندی اردو دونوں رسم خط میں ایک ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ ہندی حصہ کے مرتب پروفیسر وجے بہادر سنگھ ہیں جب کہ اردو حصہ کے مرتب ڈاکٹر محمد قاسم انصاری ہیں جنھوں نے سوزوطن کے مختلف نسخوں کو سامنے رکھتے ہوئے متن کی غلطیوں کو دور کرنے کی سعی کی ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر آر کے شکل، پروفیسر رادھے شیام دوبے، پروفیسر شری پرکاش شکل، پروفیسر آفتاب احمد آفاقی اور ڈاکٹر کرشن موہن نے بھی اپنے خیالات کا اظہار اور عہد حاضر میں ان کی معنویت کو اجاگر کیا۔ سمینار میں بڑی تعداد میں یونیورسٹی کے اساتذہ ریسرچ اسکالرز، سماجی کارکنان اور مقامی لوگوں نے پریم چند کو یاد کیا۔ پروگرام کی نظامت پریہ نے کی اور شکریہ کی رسم ہندی شعبہ کے استاد ڈاکٹر ستیہ پرکاش نے ادا کی۔ اس موقعے پر یونیورسٹی کا ترانہ اور اس کے بانی پنڈت مدن موہن مالویہ کے مجسمہ کی گل پوشی بھی کی گئی۔

روزنامہ ’ہمارا سماج‘ دہلی، 2 اگست 2022

اردو شاعری میں ہندوستانی ثقافت

رامپور: گورنمنٹ گرلز پوسٹ گریجوٹ کالج کے آڈیٹوریم میں ایک سمپوزیم بعنوان ’اردو شاعری میں ہندوستانی ثقافت‘ کا انعقاد عمل میں آیا۔ ساہتیہ اکادمی نئی دہلی اور شعبہ اردو

گورنمنٹ گرلز پی جی کالج رامپور کے باہمی اشتراک سے منعقدہ سمپوزیم کی صدارت کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اتل شرما نے کی۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ ادب کی دو بڑی خصوصیات قبولیت اور حساسیت ہیں۔ اردو شاعری میں یہ دونوں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر انوپم تیواری ایڈیٹر ساہتیہ اکادمی نے خیرمقدمی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ اردو شاعری نے ہندوستانی ثقافت کو پوری دنیا میں متعارف کرایا ہے۔ سمپوزیم میں اپنا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ممتاز ادیب ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے کہا کہ اردو شاعری میں شروع سے آج تک ہندوستانی ثقافت کو پیش کیا گیا ہے۔ انھوں نے امیر خسرو کے شعر پڑھے اور نشاندہی کی کہ ان کی شاعری میں کہاں کہاں ہندوستانی ثقافت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر جہانگیر احمد خاں نے اپنے مقالے میں کہا کہ اردو شاعری کی سبھی اصناف میں ہندوستانی ثقافت کی جھلک نظر آتی ہے۔ شری رام اور شری کرشن جی کو اردو شاعری میں جس عقیدت سے یاد کیا گیا ہے اس کی مثال ملنا کسی دوسری زبان میں مشکل ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے ڈاکٹر سنجے کمار نے اردو غزل میں ہندوستانی تلمیحات کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو غزل میں ہندوستانی ثقافت اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب نے اردو مثنوی اور ہندوستانی تہذیب کو موضوع بناتے ہوئے اپنے مقالے میں مثنویوں میں پائی جانے والی ہندوستانی تہذیب پر تفصیلی گفتگو کی۔ ڈاکٹر محمد آصف نے اردو شاعری میں مراد آباد کے شاعروں کے حوالے سے ہندوستانی ثقافت پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر اطہر مسعود خاں نے ’اردو شاعری اور ہندوستانی ثقافت‘ کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔

روزنامہ ’ہندوستان ایکسپریس‘ دہلی، 30 جولائی 2022

تلنگانہ

اردو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کا استقبال

حیدرآباد: ’’میں اردو کا خدمت گار ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جہاں بھی جاؤں وہاں مجھے اردو بولنے والے لوگ ملیں۔ پوری دنیا میں اردو کا فروغ قومی اردو کونسل کا مشن ہے اور اس سلسلے میں ہم لوگ پوری سنجیدگی اور نیک

نیتی سے کام کررہے ہیں۔‘‘ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی جانب سے منعقدہ استقبالیہ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو ملک میں رابطہ کی اہم زبان ہے اور وہ دن دور نہیں جب یہ انگریزی کے متبادل کے طور پر ابھرے گی۔ ویبینار نے پوری دنیا کی اردو آبادی کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے۔ ہم لوگ ملک کے ان خطوں میں بھی اردو کا پرچم بلند کرنے کے لیے کوشاں ہیں جہاں اردو بولنے والے بہت کم ہیں۔ قومی اردو کونسل کی جانب سے فروغ اردو کے سلسلے میں کتابوں کی اشاعت، سمینار اور ورکشاپ کے انعقاد، تحقیقی منصوبوں کی تکمیل اور دیگر بہت سی اسکیموں کے تحت فنڈ کی ادائیگی کی جارہی ہے۔ مجھے خوشی ہوگی اگر شعبۂ اردو کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز کونسل کی اسکیموں سے فائدہ اٹھائیں۔ انھوں نے طلبا و طالبات کو خوب مطالعہ کرنے اور اپنی صلاحیت کو بہتر بنانے کی ترغیب دی۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر شمس الہدیٰ دریابادی نے مہمان کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر شیخ عقیل احمد کا ہمارے شعبے سے گہرا تعلق رہا ہے اور وہ ماضی میں بھی پی ایچ ڈی کے ممتحن بن کر یہاں تشریف لاچکے ہیں۔ قومی اردو کونسل

کے ڈائرکٹر کے طور پر بھی انھوں نے ہمارے شعبے پر خاص توجہ دی ہے اور کونسل کے اشتراک اور مالی معاونت سے کئی بین الاقوامی اور قومی سمیناروں کا انعقاد کیا جاچکا ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ مستقبل میں بھی ان کا بھرپور تعاون جاری رہے گا۔ اس موقعے پر انھوں نے شعبے کی کارگزاریوں کی مختصر رپورٹ بھی پیش کی۔ جلسے میں سینئر استاد پروفیسر فاروق بخشی نے پروفیسر عقیل کے حوالے سے نجی یادوں کا ذکر کیا اور ان کی محنت، ایمانداری، حق گوئی اور سادگی کی ستائش کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ابوشہیم خان نے ڈاکٹر کٹر این سی پی یو ایل کی علمی وادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 29 جولائی 2022

مجمع البحرین داراشکوہ: مذہبی اور روحانی نظریہ صلح کل کی مشعل راہ

حیدرآباد: ہندوستان میں مغل شہزادہ داراشکوہ نے بین مذہبی مکالمہ کا آغاز کیا تھا۔ داراشکوہ، فارسی و سنسکرت

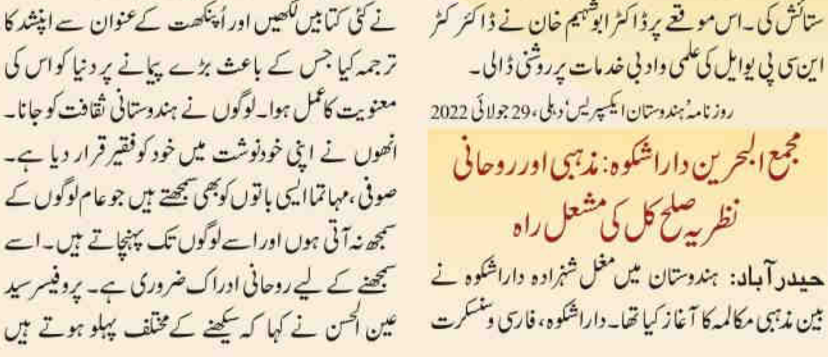

کے اسکالر تھے۔ انھوں نے سنسکرت سیکھنے کے لیے بنارس کا دورہ کیا اور وہاں ایک سال تک قیام کیا۔ اپنشد جسے داراشکوہ نے سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا اس کا یوروپی اسکالرس نے لاطینی اور فرانسیسی میں ترجمہ کرتے ہوئے اسے عام کیا۔ ان خیالات کا اظہار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، شعبۂ فارسی و سنٹرل ایشین اسٹڈیز اور این سی پی یو ایل کی جانب سے 'مجمع البحرین داراشکوہ مذہبی اور روحانی نظریۂ صلح کل کی مشعل راہ' کے موضوع پر دو روزہ بین الاقوامی کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں کیا۔ ممتازعلی (شری ایم)، چانسلر مانو نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ جب کہ پروفیسر سید عین الحسن، وائس چانسلر نے صدارت کی۔ مہدی شاہرخی، قونصل جنرل آف اسلامی جمہوریہ ایران، حیدرآباد، حاجی سید سلمان چشتی، گدی نشین، درگاہ اجمیر شریف اور سراج الدین قریشی، صدر انڈیا اسلامک

کلچرل سنٹر، نئی دہلی نے بحیثیت مہمانان اعزازی شرکت کی۔ پروفیسر طارق منصور نے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داراشکوہ پر ایک مرکز قائم ہے۔ اس کے تحت مختلف پروگرام منعقد کیے گئے، جس میں اندرون ملک اور ایران سے بھی مہمانوں نے شرکت کی۔ اس کے علاوہ داراشکوہ پر ایک ویب سائٹ بھی شروع کی گئی ہے۔ داراشکوہ کی دلی خواہش تھی کہ وہ لوگوں میں موجود غلط فہمیوں کا ازالہ کریں۔ چانسلر ممتاز علی نے کلیدی خطبہ میں کہا کہ داراشکوہ نے کئی کتابیں لکھیں اور اُپنکھت کے عنوان سے اپنشد کا ترجمہ کیا جس کے باعث بڑے پیمانے پر دنیا کو اس کی معنویت کا علم ہوا۔ لوگوں نے ہندوستانی ثقافت کو جانا۔ انھوں نے اپنی خودنوشت میں خود کو فقیر قرار دیا ہے۔ صوفی، مہاتما ایسی باتوں کو بھی سمجھتے ہیں جو عام لوگوں کے سمجھ نہ آتی ہوں اور اسے لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ اسے سمجھنے کے لیے روحانی ادراک ضروری ہے۔ پروفیسر سید عین الحسن نے کہا کہ سیکھنے کے مختلف پہلو ہوتے ہیں اور داراشکوہ نے ہمیں زبانوں کا احترام سکھایا ہے۔ ان کے اجداد کی زبان ترکی تھی، خود ان کی زبان فارسی تھی، عربی مذہبی زبان ہونے کے باعث انھوں نے سیکھ لی اور انھوں نے خصوصی طور پر سنسکرت بھی سیکھی۔ داراشکوہ کا پیام تھا سب سے محبت کرو، نفرت کسی سے نہیں۔ حاجی سید سلمان چشتی نے کہا کہ ہمیں نیوز چینل پر دکھائے جارہے مباحثوں کو نظرانداز کرنا چاہیے اور اساتذہ، سائنسداں اور ماہرین کو مباحثے منعقد کرتے ہوئے بہتر نتائج حاصل کرنے چاہئیں۔ مہدی شاہرخی اور سراج الدین قریشی نے بھی خطاب کیا۔ میر اصغر حسین، پروفیسر اشتیاق احمد، پروفیسر آذرمی دخت صفوی، پروفیسر نرگس جابری نصب، امرحسن بھی موجود تھے۔ مانو کی مرتبہ تصنیف داراشکوہ کے خطوط 'مکتوبات داراشکوہ و بنام داراشکوہ' مع اردو ترجمہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی داراشکوہ پر کتاب کا اجرا عمل میں آیا۔ ایک ڈاکیومنٹری بھی ریلیز کی گئی۔ پروفیسر عزیز بانو نے خیرمقدم کیا اور پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی نے کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔

ہندوستان کے لوگوں کی دعا ہوتی ہے کہ سب کا بھلا ہو۔ سب ایک ہیں۔ سب کو اللہ اور ایشور نے بنایا ہے۔ داراشکوہ نے اسے سمجھا اور لوگوں تک پہنچایا۔ دنیا میں ہر ملک اپنی ایک علیحدہ خصوصیت رکھتا ہے۔ ہندوستان واحد ملک ہے جو ناقابل تصور اور لامحدود تنوع کے باوجود اپنے خمیر میں شمولیت کا عنصر رکھتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر کرشنا گوپال، ممتاز اسکالر، داراشکوہ اسٹڈیز نے آج مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، شعبہ فارسی و سنٹرل ایشین اسٹڈیز اور این سی پی یو ایل کی جانب سے 'مجمع البحرین داراشکوہ: مذہبی اور روحانی نظریہ صلح کل کی مشعل راہ' کے موضوع پر دو روزہ بین الاقوامی کانفرنس کے اختتامی اجلاس میں کلیدی خطبہ دیتے ہوئے کیا۔ جناب ممتاز علی (شری ایم)، چانسلر مانو سرپرست تھے۔ جبکہ پروفیسر سید عین الحسن، وائس چانسلر نے صدارت کی۔

ڈاکٹر کرشنا گوپال نے کہا کہ ہمارا ارادہ تھا کہ داراشکوہ کا کام یکجا ہوجائے اور اس کا ترجمہ اردو میں ہوجائے۔ ہندوستانی روایت کا بڑا حصہ مکالمہ پر مبنی ہے۔ اس سے قبل کسی نے کیا ہو اس کی اطلاع نہیں ملتی۔ داراشکوہ نے ہندو مسلم دونوں میں مکالمہ کا آغاز کیا۔ اس نے دراصل مکالمہ کی روایت بحال کی۔ اس کے بعد اس نے بنارس، دہلی، آگرہ، لاہور، سری نگر میں لائبریریاں قائم کیں۔ جناب ممتاز علی، چانسلر، مانو نے کہا کہ اس طرح کی مزید کانفرنسیں ہونی چاہئیں جس میں مکالمہ ہو اور مختلف موضوعات پر بحث ہو۔ مجمع البحرین کانفرنس کے بعد امید ہے کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھیں گے اور اس بارے میں سوچیں گے کہ کس طرح امن وآشتی کا ماحول فروغ پائے۔ پروفیسر سید عین الحسن، وائس چانسلر نے صدارتی خطاب میں کہا کہ میری کئی شناختیں ہوسکتی ہیں جیسے میں الہ آباد، بنارس، دہلی میں رہا اور آج یہاں حیدرآباد میں مانو میں ہوں۔ لیکن میں جب کہیں باہر جاتا ہوں تو میری ایک ہی شناخت ہوتی ہے کہ میں ہندوستانی ہوں۔ یہی میری اصل شناخت ہے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد، ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے کہا کہ اگر اللہ کو پہچاننا چاہتے ہو تو پہلے خود کو پہچانو۔ انسان اللہ کا خلیفہ ہے۔ ہندوازم کے مطابق بھی آتمائیں پرماتما میں مل جاتی ہیں۔ داراشکوہ علم کا پیاسا تھا۔ اس نے جہاں سے علم ملا، اسے لے لیا اور پھر مجمع البحرین لکھی۔ اس کانفرنس کے مقالوں پر مبنی جب کتاب شائع

ہوگی تو اس سے لوگوں میں بیداری آئے گی۔ انہوں نے یہاں موجود وائس چانسلرس سے درخواست کی کہ وہ اپنی اپنی یونیورسٹیوں میں مذہبی تقابلی مطالعات کے شعبہ قائم کریں۔ پروفیسر فیضان مصطفی، وائس چانسلر، نلسار یونیورسٹی آف لا، حیدرآباد نے کہا کہ داراشکوہ نے ڈیٹیل بنائی کہ ریاست کا مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ کس طرح رشتہ ہوگا۔ یہی سیکولرزم ہے۔ مجمع البحرین میں داراشکوہ نے کہا تھا کہ یہ کتاب خود اس کے لیے ہے کیوں کہ وہ بادشاہ بننے والا تھا، اس کے اہل خانہ کے لیے ہے جو آگے چل کر گورنر وغیرہ بنیں گے اور ریاست کو چلائیں گے اور صوفیوں کے لیے۔ داراشکوہ نے جو لکھا اس سے قبل چچنامہ میں 712 میں ہندوؤں کو اہل کتاب قرار دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی مغلوں سے قبل مسلم حکمرانوں نے بھی مقامی ہندوؤں کو اہم مقام دیا تھا۔ مالگزاری میں عموی طور پر مسلم حکمرانوں کے پاس ہندو وزراء ہوا کرتے تھے۔ پروفیسر ٹی وی کٹی منی، وائس چانسلر، سنٹرل یونیورسٹی آف آندھرا پردیش نے کہا کہ ترجمہ ایک بہت بڑا ذریعہ روزگار کا۔ داراشکوہ بادشاہ تو نہیں بنا، لیکن وہ فن، فلسفہ، ادب و علم کا بادشاہ بنا۔ آج ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ دو مذہبوں کے درمیان کس طرح پل بنایا جاسکتا ہے، اس پر مباحثے ہوتے رہے ہیں لیکن اس پل کی بنیاد داراشکوہ نے ڈالی تھی۔ ڈاکٹر میر اصغر حسین، سابق ڈائرکٹر، یونیسکو نے کہا کہ داراشکوہ نے حکومت میں کامیابی تو حاصل نہیں کی لیکن اس کا مشن آج بھی معنی رکھتا ہے۔ مانو اس کے مشن کو آگے کتابوں کے ترجمہ کے ذریعہ بڑھا سکتی ہے۔

اس موقع پر این سی پی یو ایل کی شائع کی گئی کتاب 'دیوان داراشکوہ' کا اجرا عمل میں آیا۔ پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی، صدر شعبہ فارسی و سنٹرل ایشین اسٹڈیز نے خیر مقدم کیا، کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔ ابتدا میں داراشکوہ پر ایک ڈاکیومنٹری بھی دکھائی گئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 جولائی 2022 و پریس ریلیز: عابد عبدالواسع، پبلک ریلیشنز آفیسر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد، بتاریخ 27 جولائی 2022

مانو میں داراشکوہ پر ڈرامہ کی پیشکش

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ڈرامہ کلب نے شاہجہاں کے بڑے شہزادے داراشکوہ کی زندگی اور قربانیوں پر ایک ڈرامہ پیش کیا جو شعبۂ فارسی و سنٹرل ایشین اسٹڈیز کی بین الاقوامی کانفرنس 'مجمع البحرین

داراشکوہ: مذہبی اور روحانی نظریہ صلح کل کی مشعل راہ' کی ثقافتی شام کے طور پر منعقد کیا گیا تھا۔ اس ڈرامے میں بنیادی طور پر دارا اور سرمد کے امن کے پیغامات پر توجہ دی گئی اور دونوں کرداروں کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس ڈرامے میں اسٹیج پر 19 اور اسٹیج کے پیچھے 15 افراد پر مشتمل بڑی کاسٹ نے حصہ لیا۔ پروفیسر سید عین الحسن، وائس چانسلر نے کہا کہ اس انداز میں ڈرامے کی پیشکش خوش آئند ہے۔ اگر طلبہ محنت کرتے رہیں تو ان کے لیے صرف آسمان ہی حد ہوگی۔ جناب معراج احمد مُگھرل کوآرڈینیٹر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ ایم سی جے، اور ڈرامے کے ڈائرکٹر کے بموجب سید مظہرالدین نے داراشکوہ کا کردار ادا کیا جب کہ شاہجہاں کا کردار محمد شاہنواز عالم نے ادا کیا۔ مصباح ظفر نے اورنگ زیب اور فہیم نے شیخ سرمد کا کردار بخوبی نبھایا۔ دیگر طلبہ جنھوں نے اہم کردار ادا کیے ان میں شہباز خان، ابرار احمد، عبدالقادر جیلانی، بدر عالم، محمد نورعین، نفیس احمد، اشرف احمد، نور مجسم، شہزاران خان، ماجد احمد، ندیم عالم، عبدالقادر، ضمیر حسن اور افراحسین شامل تھے۔ مشیرہ نے پروگرام کی نظامت کی اور کاسٹیوم زینب غزالی اور حنا پروین نے ڈیزائن کیے، عافیہ پروین اور حسنہ پروین نے سیٹ تیار کیا۔ پروین ناز نے میک اپ کیا۔ حبیب احمد، عمران احمد اور یاسر نے پراپس فراہم کیے۔ لائٹس کو شہباز احمد اور جسارت نے کنٹرول کیا اور میوزک کو تقیم بختاور نے آپریٹ کیا۔ یہ مانو ڈرامہ کلب کا پہلا مکمل ان ہاؤس پروڈکشن تھا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' حیدرآباد، 29 جولائی 2022

مغربی بنگال

فارسی زبان کے فروغ میں سکھوں کی خدمات

کولکاتہ: اس استدلال کے ساتھ سکھوں کے مذہبی گروہوں نے اپنی مذہبی کتابوں میں تمام زبانوں کو اہمیت دی ہے اور ایسی زبانوں کو بھی شامل کیا ہے جنھیں آج تک ملک نے زبان کا درجہ بھی نہیں دیا ہے۔ پٹنہ صاحب گرودوارہ کے جتھہ دار سنگھ صاحب رنجیت گوہر جی نے کہا کہ گرو گوبند اور دیگر مذہبی گروؤں نے فارسی زبان کو جو اہمیت دی ہے وہ بے مثال ہے اور ہم اپنی اس وراثت کو آگے بڑھانے کی کوشش کررہے ہیں۔ ایران سوسائٹی کلکتہ نے فارسی زبان کے فروغ میں سکھوں کی خدمات کے عنوان سے دو روزہ سیمینار کا انعقاد کیا تھا۔ سیمینار کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے سنگھ صاحب رنجیت گوہر جی نے مذہبی بنیادوں پر زبان کی تقسیم پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ زبانیں رابطے کا وسیلہ ہوتی ہیں۔ نفرت کے لیے نہیں ہوتیں۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان ایک تکثیری معاشرہ ہے اور اس معاشرے کا تقاضا ہے کہ ہم ایک دوسرے کی زبان کی حفاظت کریں۔ اس موقع پر سپریم کورٹ کے سابق جج جسٹس اشوک گنگولی نے کہا کہ ہندوستانی معاشرہ اول دن سے ہی تکثیری معاشرہ رہا ہے اور یہاں ہر ایک زبان کو اہمیت دی جاتی رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مغلوں کے دور میں سرکاری کام کاج کی زبان فارسی تھی مگر ہندوستان نے اس کے خلاف اس لیے آواز بلند نہیں کی کہ ہم رواداری معاشرہ کے حصہ تھے۔ اپنی مادری زبان کی حفاظت کرنے کے ساتھ دوسری زبانوں کو بھی سیکھتے تھے۔ سکھوں کے دسویں گرو گرو گوبند سنگھ نے اورنگ زیب کو 1705 کی چمکور کی جنگ میں مغل بادشاہ پر اپنی اخلاقی فتح سے متعلق جو باتیں لکھی ہیں وہ فارسی میں تھیں۔ اس واقعہ کے 117 سال بعد راجہ رام موہن رائے نے فارسی میں ہی پہلا اخبار شائع کیا تھا۔ دو روزہ سیمینار میں ملک بھر سے آئے اسکالروں نے فارسی علوم میں سکھوں کی خدمات اور ہندوستانی تہذیب و معاشرت پر فارسی کے اثرات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ایران سوسائٹی کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے جنرل سکریٹری ایڈوکیٹ خواجہ جاوید یوسف نے بتایا کہ ایران سوسائٹی نے فارسی زبان وادب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ سوسائٹی نے کمپوزٹ ہندوستانی تہذیب وتمدن اور کلچر کے فروغ کے لیے بھی اہم خدمات انجام دی ہیں۔ اس موضوع پر سیمینار کے انعقاد کا مقصد بھی یہی ہے۔

روزنامہ 'میراوطن' دہلی، 2 اگست 2022

اعزاز و اکرام

مناظر عاشق ہرگانوی ایوارڈ

بھاگل پور: انجمن باغ و بہار، بربورہ، بھاگل پور کے

زیراہتمام گذشتہ شام شہزوراختر کی صدارت میں پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کے یوم پیدائش پر ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔اس موقعے پر انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد پرویز نے کہا کہ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی علمی وادبی حلقوں میں تعارف وتعریف کے محتاج نہیں۔ اکیسویں صدی کی اردو دنیائے ادب میں سب سے زیادہ لکھنے والے ادیب تھے۔ ان کے زرخیز قلم سے مختلف موضوعات پر 270 کتابیں شائع ہوچکی ہیں اور ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں 70 کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور لکھی جارہی ہیں۔کئی طالب علم ان کے فن وشخصیت پر پی ایچ ڈی کر چکے ہیں اور کئی کررہے ہیں۔انھوں نے اپنی نگرانی میں 24 طالب علموں کو پی ایچ ڈی کرایا۔انھوں نے اردو شاعری کی 28 اصناف پر طبع آزمائی کی اور سبھی اصناف پر ان کی کتابیں بھی ہیں۔آج ان کی یوم پیدائش پر 2022 کا مناظر عاشق ہرگانوی ایوارڈ دور جدید کے نامور ادیب اور سیکڑوں کتابوں کے مصنف، بال ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ اور رسالہ اسباق کے مدیر نذیر فتح پوری صاحب کو ان کی ادبی خدمات کے لیے دیا جاتا ہے۔نذیر فتح آن لائن تھے۔اس موقعے پر جوثر ایاغ نے کہا کہ جب تک وہ حیات میں رہے ان کا نام اور کام اردو دنیا میں سر چڑھ کر بولا، دنیا کے کسی بھی خطے میں اردو ادب کے قاری موجود ہیں وہ ان کو ضرور جانتے ہیں۔شہزوراختر نے کہا کہ مناظر عاشق ہرگانوی ایسے بلند پایہ ادیب ونقاد تھے کہ انھیں کسی بھی ادبی موضوع پر لکھنے کا فن حاصل تھا۔

پریس ریلیز:شمیم احمد شمیم،انجمن باغ وبہار،برہ پورہ، بھاگلپور،13جولائی 2022)

رسم اجرا

اردو کے 23 افسانہ نگار اور ان کا پہلا افسانہ

بھاگلپور: انجمن باغ و بہار، برہ پورہ، بھاگلپور کی جانب سے ڈاکٹر نیرحسن کی رہائش گاہ پر شہزوراختر کی صدارت میں ڈاکٹر محمد پرویز کی کتاب 'اردو کے 23 افسانہ نگار اور ان کا پہلا افسانہ' کا رسم اجرا ڈاکٹر محمد پرویز، جوثر ایاغ، محمد شاداب عالم، شہزوراختر، ڈاکٹر نیرحسن، مظہر مجاہدی، ڈاکٹر ارشد رضا، ڈاکٹر محمد صدیقی، محمد بلال الدین، کاظم اشرفی، محمد تاج الدین وغیرہ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ پروگرام کا آغاز کرتے ہوئے سید شبیر احمد جعفری نے کہا کہ اردو کے 23 افسانہ نگار اور ان کا پہلا افسانہ ایک تحقیقی کتاب ہے۔اس کتاب کا مطالعہ ہر اردو کے قاری کو کرنا چاہیے اور اردو دنیا کی تمام لائبریریوں کو اس کتاب کو خریدنا چاہیے کیونکہ اس کتاب میں ڈاکٹر محمد پرویز نے اردو کے 23 افسانہ نگار کی تاریخ پیدائش اور مختصر سوانح عمری کے ساتھ ان کا پہلا افسانہ شامل کیا ہے۔ اس موقعے پر انجمن کے نائب صدر جوثر ایاغ نے ڈاکٹر محمد پرویز کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب اپنی اہمیت و افادیت کے اعتبار سے ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ڈاکٹر محمد پرویز کی اس سے پہلے آٹھ کتابیں مختلف موضوعات پر منظر عام پر آکر مقبول عام ہوچکی ہیں۔

روزنامہ'ہمارا سماج' دہلی، 19 جولائی 2022

ڈاکٹر محمد پرویز 'اردو کے 23 افسانہ نگار اور ان کا پہلا افسانہ' کا اجرا

دیارفکر

لکھنؤ: غزلوں کے دیوان 'دیارفکر' کی رسم رونمائی مدرسہ حبیبیہ علی ہال (کھدرا) میں اہل محلّہ اور اطراف واکناف کے شعرا وادبا کی موجودگی میں ہوئی۔ نظامت رضوان فاروقی نے کی اور منصب صدارت پر ممتاز صحافی وادیب احمد ابراہیم علوی متمکن رہے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت واصف فاروقی اور صوفی سید اظہار علی رونق محفل رہے۔ منظوم اور منثور تاثرات پیش کرنے والوں میں حیدر علوی، مفتی خبیر (تمبوری)، محمد علی علوی، عرفان لکھنوی، قاری حسنین، نعیم منظر، نفیس سیتاپوری کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ'صحافت' دہلی، 19 جولائی 2022

میراث المراثی

امروهه: لٹریری سوسائٹی کے زیراہتمام معروف مصور اور شاعر وسیم امروہوی کی کتاب 'میراث المراثی' کا اجرا اور مصوری کی نمائش کا اجرا اردو دنیا کی عظیم ترین شخصیات کی موجودگی میں ہوٹل پرتھ میں عمل میں لایا گیا، جس کی صدارت پروفیسر سید محمد سیادت نقوی نے کی، جب کہ پروفیسر زماں آزردہ کشمیر یونیورسٹی مہمان خصوصی کے طور پر اس تقریب خصوصی میں موجود رہے۔ نوشت لٹریری سوسائٹی کے معروف شاعر عفیف سراج نے وسیم امروہوی کے تحریر کردہ مرثیہ کو اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں پیش کیا۔ کتاب کے حوالے سے بات کرتے ہوئے پروفیسر زماں آزردہ نے کہا کہ وسیم امروہوی نے بہت کم عمری میں مرثیہ نگاری میں بہت تیزی سے کام کیا ہے۔ جدید مرثیہ کے حوالے سے ان کی خدمات قابل قدر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس شہر نے ہمیشہ مرثیہ کے میدان میں اپنا سر بلند رکھا ہے اور اب اردو مرثیہ کو وسیم امروہوی سے بہت امیدیں وابستہ ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر شارب ردولوی نے آن لائن بیان کیا اور مرثیہ کی تاریخ پر روشنی ڈالی، جب کہ ڈاکٹر اصغر اعجاز قاسمی، پروفیسر حسنین اختر، پروفیسر سراج اجملی، پروفیسر مہتاب حیدر، ڈاکٹر نسیم الظفر، ڈاکٹر کلب رضا، پروفیسر ناشر نقوی نے بھی مرثیہ کی تاریخ اور کتاب کے حوالہ سے بیان پیش کیا۔

روزنامہ'صحافت' دہلی، 28 جولائی 2022

مغل حرم کے ادبی وسماجی کارنامے

پٹنه: پٹنہ کے خدابخش لائبریری کی ڈائرکٹر ڈاکٹر شائستہ بیدار کے ہاتھوں پی کے جیسوال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی سابق ڈائرکٹر وعربی فارسی کی اسکالر عطیہ بیگم کی تصنیف 'مغل حرم کے ادبی وسماجی کارنامے کی معنویت' کا اجرا ہوا۔ اس تصنیف میں مغل حرم کی اہم ترین خواتین شاعرات کی ایک تفصیلی فہرست، ان کی ادبی وسماجی خدمات کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ مصنفہ نے اس کتاب کے کلیدی باب میں مغل حرم کی آٹھ منتخب خواتین کے ادبی اور معاشرتی خدمات کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ اس میں شہنشاہ بابر کی اہلیہ ماہم بیگم، ان کی بیٹی گلبدن بیگم، بادشاہ جلال الدین کی اہلیہ سلیمہ سلطان، نورجہاں، ممتاز بیگم، جہاں آرا اور شہزادی زیب النسا کے نام شامل ہیں۔ خدابخش لائبریری کی ڈائرکٹر ڈاکٹر شائستہ بیدار نے کہا کہ عطیہ بیگم نے بہت خوبصورتی سے تحقیقی بصیرت کے ساتھ مذکورہ خواتین کی ادبی خدمت پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ برصغیر ہند و پاک کے فارسی ادب کی روایتوں میں سنگ میل کی حیثیت سے یاد رکھا جائے گا۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 12 جولائی 2022

سلطان آزاد اور ڈاکٹر فیضان جعفر علی کی کتابوں کا اجرا

پٹنه: دبستان عظیم آباد خانقاہوں میں پروان چڑھی۔ یہی وجہ ہے اس دبستان میں تصوف اور مذہب کا رنگ پایا جاتا ہے جب کہ دبستان دلی، لکھنؤ اور مرشد آباد کو شاہ یا

نواب کی پشت پناہی حاصل رہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر منظر اعجاز نے کیا۔ 17 جولائی بروز اتوار کو وہ گورنمنٹ اردو لائبریری کے کانفرنس ہال میں سلطان آزاد اور ڈاکٹر فیضان جعفر علی کی کتابوں کے رسم اجرا کی تقریب سے خطاب کر رہے تھے۔ منظر اعجاز نے کہا کہ سلطان آزاد خاموشی سے ادب کی خدمت کرتے رہے ہیں۔ ان کی تازہ ترین کتاب 'تحقیق و توضیح' اور ڈاکٹر فیضان جعفر علی کی مرتب کردہ نئی کتاب 'سلطان آزاد شخص و عکس' میں بہت ہی مفید معلومات موجود ہیں۔ ان کی نگارشات کسی ایک سمت کی طرف نہیں ہے بلکہ انھوں نے تذکرہ نگاری، تنقید اور دوسرے اصناف پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ پٹنہ یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر جاوید حیات نے کہا کہ تحقیق و توضیح ایک وسیع موضوع ہے اور اس پر سلطان آزاد کا وقیع کام ہمیشہ کے لیے یاد رکھا جائے گا۔ گورنمنٹ اردو لائبریری کے چیئرمین و محکمہ تعلیم کے ڈپٹی سکریٹری ارشد فیروز نے کہا کہ گورنمنٹ اردو لابریری اردو کے فروغ میں اپنا اہم رول ادا کرتی رہی ہے۔ لائبریری نے بہت کم دنوں میں کئی اچھے پروگرام منعقد کیے ہیں۔ خطاب کرنے والوں میں اکبر رضا جمشید، خورشید اکبر، شمیم قاسمی، عطا عابدی، سلطان آزاد، ڈاکٹر فیضان جعفر علی، اظہر الحق کے نام شامل ہیں۔ جشن اجرا کے بعد معروف شاعر ناشاد اورنگ آبادی کی صدارت میں ایک شعری محفل بھی آراستہ کی گئی۔ علمی مجلس بہار کے جنرل سکریٹری پرویز عالم نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' پٹنہ، 29 جولائی 2022

پرنٹ میڈیا اور برقی میڈیا

انجم عثمانی مرحوم کی کتاب 'پرنٹ میڈیا اور برقی میڈیا' کا اجراء

نئی دهلی: معروف صحافی اور افسانہ نگار انجم عثمانی مرحوم کی کتاب 'پرنٹ میڈیا اور برقی میڈیا' کی تقریب رسم اجرا غالب اکیڈمی میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ تقریب اجرا کی صدارت ڈاکٹر جی آر کنول نے کی، جب کہ نظامت غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے کی۔ اس موقعے پر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ انجم عثمانی سے میرے دیرینہ تعلقات تھے، میں نے ان کی تقریباً سبھی کتابیں پڑھی ہیں، صحافت پر ان کی ایک کتاب کئی جلدوں میں شائع ہوئی ہے، جس کو میں نے پڑھا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان کی کتاب طالب علموں کے لیے ہی نہیں بلکہ اساتذہ کے لی بھی بڑی کارآمد ہے۔ انھوں نے کہا کہ جس کتاب کی آج رسم اجرا ہوئی ہے، یقیناً اس سے طلبہ کو بڑا فائدہ ہوگا، یونیورسٹی میں صحافت کے نصاب میں بھی اس کو شامل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ انجم عثمانی بڑی خوبیوں کے مالک تھے، ان کی بڑی خواہش تھی کہ یہ کتاب شائع ہو مگر آج جب اس کتاب کا اجرا ہوا ہے وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں، ان کی یہ کتاب مکمل طور پر پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کا احاطہ کرتی ہے، صحافت پر ان کی پہلی کتاب 1994 میں شائع ہوئی تھی جس کا دوسرا ایڈیشن سال 2008 میں آیا، یہ کتاب جامعہ کے شعبۂ صحافت کے نصاب میں شامل ہے۔ اپنی صدارتی تقریر میں ڈاکٹر جی آر کنول نے کہا کہ انجم عثمانی کئی خوبیوں کے مالک تھے، وہ بے حد خوش گفتار انسان تھے، ان کے افسانوں میں طنز و مزاح اور سنجیدگی و متانت دونوں ملتے ہیں، ان کی اس کتاب کو مکمل نہیں کہا جاسکتا کیونکہ کوئی بھی کتاب کبھی مکمل نہیں ہوتی، خاص کر برقی میڈیا میں نئی نئی چیزیں سامنے آرہی ہیں جس پر آنے والے وقت میں لکھا جائے گا۔ تقریب کے آغاز میں سینئر صحافی سہیل انجم نے انجم عثمانی کی کتاب 'پرنٹ میڈیا اور برقی میڈیا' کا تفصیلی تعارف پیش کیا۔ کتاب کے بارے میں اظہار خیال کرنے والوں میں ڈاکٹر احمد علی برقی (منظوم)، افسانہ نگار ڈاکٹر نگار عظیم، افسانہ نگار رخشندہ روحی، مظہر محمود، سکندر عاقل، تحسین منور، معین شاداب، متین امروہوی اور ڈاکٹر سفینہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ تقریب میں انجم عثمانی کی اہلیہ، بیٹی، بہو اور داماد سمیت بڑی تعداد میں علمی و ادبی شخصیات نے شرکت کی۔ آخر میں ان کے فرزند سمیر عثمانی نے اظہار تشکر پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 جولائی 2022

برگ ریشم

گلبرگه: محترمہ رفعت آسیہ شاہین غزل کی شعریات اور اس کی مبادیات سے واقف ہیں۔ وہ ایک طبع زاد شاعرہ ہیں۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر حمید سہروردی نے کیا۔ وہ انجمن ترقی اردو ہند شاخ گلبرگہ کے زیر اہتمام وشاکھا پٹنم آندھرا پردیش کی معروف شاعرہ رفعت آسیہ شاہین کے اولین شعری مجموعے 'برگِ ریشم' کی رسم رونمائی انجام دینے کے بعد مخاطب تھے۔ پروفیسر حمید سہروردی نے کہا کہ رفعت شاہین کے بہت سے اشعار کان کو بھلے لگتے ہیں، ان کو پہلے اور دوسرے مصرعے میں حسن پیدا کرنے کا ہنر خوب آتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ رفعت شاہین کی شاعری میں عصری آگاہی اور عصر کی روح کا عنصر نمایاں ہے۔ جناب حامد اکمل نے کہا کہ رفعت آسیہ شاہین کو شعر گوئی میں ملکہ حاصل ہے، اچھے سے اچھے مضامین کو نظم کرنے کی صلاحیت شاعرہ میں موجود ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ شاعرہ کے مشاہدات، خیالات اور تصورات ان کی شعری کائنات میں روشن ہیں۔ جناب واجد اختر صدیقی نے کہا کہ رفعت آسیہ شاہین کا تعلق علمی نگری سگر تعلقہ شاہ پور سے ہے، جہاں اردو ادب کے فروغ کے لیے ماحول ہمیشہ زرخیز رہا ہے۔ ڈاکٹر میمونہ بیگم سرڈگی نے رفعت شاہین کی غزلوں کو صنائع و بدائع کے تناظر میں دیکھا اور خوب تر انداز سے رفعت شاہین کی غزلوں میں صنائع و بدائع کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کی شعری صلاحیتوں کا اعتراف کیا۔ محترمہ رفعت آسیہ شاہین نے اپنی جوابی تقریر میں کہا کہ شاعری میرے لیے ذوق و سکون کا تسکین ہے۔ انھوں نے کہا سگر شریف ان کا وطن ہے، لیکن وہ ایک عرصے سے اردو مرکز سے دور شہر وشاکھا پٹنم میں اپنے خاندان کے ساتھ مقیم ہیں۔ انھوں نے اربابِ انجمن ترقی اردو شاخ گلبرگہ کا ان کو گلبرگہ میں متعارف کروانے کے لیے شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر پیرزادہ

فہیم الدین نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ رفعت شاہین کے کلام کی سب سے اہم خوبی سادہ بیانی اور پُرکاری ہے۔ انھوں نے اس بات پر اظہار اطمینان کیا کہ ایک خاتون غیراردو ماحول میں بھی عمدہ شعر کہہ رہی ہیں۔ صدر انجمن نے شاعرہ کو مبارک باد پیش کرتے کہا کہ وہ اس سلسلے کو جاری رکھیں۔ جواں فکر شاعر جناب محمد جاوید اقبال صدیقی نے نعت کا نذرانہ پیش کیا۔ ڈاکٹر انیس صدیقی (معتمد) نے مہمانان اور حاضرین کا خیر مقدم کیا۔ محترمہ شاہدہ بیگم (رکنِ عاملہ انجمن) نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور اظہار تشکر کیا۔ محترمہ رفعت آسیہ شاہین کی خدمت میں گلہائے تہنیت مع تحفۂ خلوص پیش کیے گئے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر انیس صدیقی، گلبرگہ، 24 جولائی 2022

چند باتیں چند یادیں

پریاگ راج: ادبی تنظیم 'بزم یاراں' کے زیراہتمام 'ادب گھر' کریلی میں منعقدہ ایک باوقار تقریب میں بزرگ ترقی پسند

ڈاکٹر علی حیدر کی تصنیف 'چند باتیں چند یادیں' کا اجرا عمل میں آیا۔ تقریب کی صدارت معروف ادیب کاظم عابدی نے کی جب کہ کتاب کی رونمائی ہندی کے ادب اور بھارتی پریشد کے کنویز شیل دھر شاستری نے کی۔ پروفیسر سید مجاور حسین رضوی سابق صدر شعبہ اردو مرکزی یونیورسٹی حیدرآباد اور سابق ضلع جج عزیز الرحمٰن بطور مہمان خصوصی اور مسعود احمد زیدی و احسان اللہ انصاری مہمان اعزازی کے طور پر شریک ہوئے۔ کاظم عابدی نے خطبہ صدارت میں کہا کہ ڈاکٹر علی حیدر ایک معتبر اور کہنہ مشق نقاد ہیں، ترقی پسند نظریات کی بنا پر ان کی تحریریں نقش دوام کا درجہ رکھتی ہیں، زیرِ نظر تصنیف اس کی بہترین مثال ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں ادبی مضامین کے علاوہ ہماری مٹتی ہوئی تہذیب کا گویا مرثیہ بھی لکھا ہے۔ پروفیسر مجاور حسین رضوی نے کہا کہ ڈاکٹر علی حیدر سے میرے مراسم 66 سال قدیم ہیں۔ وہ نہ صرف میرے ہم سبق ہیں، وہ قدم قدم پر میری رہنمائی بھی کرتے رہے ہیں۔ ان کی فعالیت قابل رشک ہے۔ یہ کتاب اس کا بین ثبوت ہے۔ انھوں نے کہا کہ بزم یاراں کے صدر کاظم عابدی وسیع النظر شخصیت کے مالک ہیں اور باصلاحیت افراد کی قدرافزائی ان کا خاص امتیاز ہے۔ میں ان کے لیے ہمیشہ دعا گو رہتا ہوں۔ اس موقعے پر شیل دھر شاستری نے ایک اہم نکتہ کی بات کرتے ہوئے سبھی لوگوں سے درخواست کی کہ اپنا کلام دیوناگری رسم الخط میں لکھیں اور بھیجیں تاکہ ایک گلدستہ شائع کیا جاسکے۔ اس کے علاوہ ناول نگار احمد حسنین نے اپنے مقالے میں کہا کہ چند باتیں چند یادیں میں ڈاکٹر علی حیدر نے ایک جامع نظریہ پیش کیا ہے۔ ان کی یہ گراں قدر تصنیف پائیدار ثابت ہوگی۔ علاوہ ازیں ظفر عباس اور ڈاکٹر صغیر الہدی نے بھی مقالے پیش کیے۔ کتاب کی اجرائی تقریب کے علاوہ شعری نشست کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ شعری نشست میں شریف الہ آبادی، صلاح غازی پوری، مرزا اختر مہدی، فرمود الہ آبادی، رضیہ سلطانہ جلال پھولپوری، احمد الہ آبادی، اسلم نظامی، طارق جعفر، اسد غازی پوری اور سلال الہ آبادی و دیگر نے اپنے کلام پیش کیے۔ تقریب میں معروف تنقید نگار رخسار احمد فتح پور، ڈاکٹر ایس ایم عباس، مرزا حسین علی ایڈوکیٹ، انجینئر فراز احمد اور ریاض کاتب و دیگر بھی شریک ہوئے۔ اس موقعے پر ادبی تنظیم 'بزم یاراں' کی جانب سے حاضرین جلسہ میں تحائف تقسیم کیے گئے۔ نظامت کے فرائض ادب گھر کے بانی فرمود الہ آبادی نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ سلمان احمد خان نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 28 جولائی 2022

سفر در پیش

نئی دھلی: دبستان دلی کے زیراہتمام اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے اشتراک سے مشہور شاعر نصرت گوالیاری کے مجموعۂ کلام 'سفر در پیش' کی تقریب رسم اجرا کے ساتھ محفل غزل اور مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ تقریب رسم اجرا کی صدارت پدم شری پرفیسر اختر الواسع نے کی جب کہ مجموعۂ کلام پر پروفیسر شہپر رسول سابق صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ اور پروفیسر ابن کنول سابق صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے گفتگو کی۔ پروگرام کے آغاز میں مجموعۂ کلام کے اجرا کی رسم انجام دی گئی۔ ڈاکٹر اطہر فاروقی جنزل سکریٹری انجمن ترقی اردو نے سبھی مہمانوں کا استقبال کیا اور اس مجموعۂ کلام کی اشاعت پر نصرت گوالیاری کے بچوں اور اس کے مرتب مشہور شاعر منیر ہمدم کو مبارکباد پیش کیا۔ پروفیسر اختر الواسع نے اپنے صدارتی خطاب میں اس پروگرام کے انعقاد پر پروگرام کے منتظمین اور نصرت گوالیاری کے متعلقین کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ نصرت صاحب کے لیے یہ بڑا اچھا خراج عقیدت ہے۔ انھوں نے موصوف کی شاعری پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور اس کی خصوصیات پر گفتگو کی۔ اس پروگرام کے بعد محفل غزل کا انعقاد کیا گیا جس میں ذیشان ضمیر احمد خان نے نصرت گوالیاری کی کئی غزلوں کو سامعین کے سامنے پیش کیا۔ اس کے بعد مشاعرہ کا انعقاد مشہور شاعر وقار مانوی کی صدارت میں کیا گیا جس میں دہلی کے شعرا کے علاوہ ملک کے دوسرے خطوں کے مشہور شعرا اور شاعرات نے بھی شرکت کی اور اپنا کلام پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 جولائی 2022

وفیات

کرامت علی کرامت

اڈیشه: مشہور شاعر و نقاد، مترجم، ماہر ریاضیات پروفیسر کرامت علی کرامت کا 5 اگست 2022 بروز جمعہ انتقال ہوگیا۔ ان کی پیدائش 23 ستمبر 1936 کو اڈیشہ میں ہوئی۔

ان کے والد رحمت علی رحمت اردو کے شاعر، انشاپرداز اور ماہر علم ریاضی تھے۔ جن کی ضخیم نثری تصنیف 'رفیق العقل' غیر مطبوعہ ہے۔ انھوں نے ڈپٹی نذیر احمد کے ناول 'توبۃ النصوح' کا اڑیہ میں ترجمہ کیا تھا جو شائع نہ ہوسکا۔ جواہر القواعد بھی ان کی ایک نایاب کتاب ہے۔ کرامت علی کرامت نے راونشا کالج کٹک سے 1958 میں ایم ایس سی کیا اور سمبل پور یونیورسٹی سے ڈاکٹر مہندر ناتھ مصرا کی نگرانی میں Probablity Theory پر پی ایچ ڈی کی۔ 13 جولائی 1959 کو راونشا کالج کٹک میں ریاضیات کے لیکچرر کی حیثیت سے انھیں ملازمت مل گئی۔ اس کے بعد مختلف کالجوں میں ان کا تبادلہ ہوتا رہا۔ کرامت علی کرامت کی علمی وادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے 1965 میں امجد نجمی کے ساتھ مل کر 'شاخسار' کے نام سے ایک رسالہ بھی شائع کیا تھا۔ ان

کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'اضافی تنقید' ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ ان کی اہم تصنیفات میں آبِ خضر (شعرائے اڑیشہ کا تذکرہ)، ماہر اقبالیات: شیخ حبیب اللہ، اڑیا زبان و ادب: ایک مطالعہ، میرے منتخب پیش لفظ، شاخسار کے اداریے اور تبصرے، نئے تنقیدی مسائل و امکانات، گلکدۂ صبح و شام، شاخِ صنوبر، لفظوں کا آسمان (سیتا کانت مہاپاتر کی اڑیا نظموں کا ترجمہ) اور لفظوں کا آکاش (سیتا کانت مہاپاتر کی اڑیا نظموں کا ترجمہ) کے Slected poems of Karamat Ali Karamat قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے اڑیا کے بہت سے مضامین کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ارتھ میٹک اور الجبرا کی کتابوں کے ترجمے انھوں نے اپنے والد کے ساتھ مل کر کیے جو نصاب میں شامل ہیں۔ انھوں نے بزم سخن کٹک کے سکریٹری کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور نجمی اکیڈمی کے صدر بھی رہے۔ ہندوستان کے مقتدر مجلّات میں ان کے تنقیدی مضامین شائع ہوتے رہے۔ انھوں نے اڑیا زبان و ادب کو اردو سے متعارف کرانے کا قابلِ ستائش کام کیا ہے۔

فیس بک اور اردو ادب کا کوہِ نور: کرامت علی کرامت، مصنفین ڈاکٹر عزیز الرحمٰن اور عبدالمتین جامی سے مستفاد

بھوپندر سنگھ

نئی دھلی: موسم، ستے پہ ستہ، آہستہ آہستہ، دوریاں اور حقیقت جیسی فلموں کے لیے کئی یادگار گانے گانے والے معروف غزل گلوکار بھوپندر سنگھ کی 82 برس کی عمر میں موت ہوگئی۔ وہ ممبئی کے کریٹی کیئر اسپتال میں زیر علاج تھے۔ ان کی اہلیہ میتھالی سنگھ نے بھوپندر سنگھ کی موت کی تصدیق کی ہے۔ انھیں 10 دن پہلے اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ انھیں کووڈ بھی ہوا، جس کے بعد ان کی صحت مسلسل گر رہی تھی اور بڑی آنت میں کینسر کا اندیشہ تھا۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 جولائی 2022

ارشد بھارتی

نئی دھلی: پرانی دہلی کے فراش خانہ علاقے میں رہنے والے فوٹو جرنلسٹ ارشد بھارتی کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ 52 سالہ ارشد بھارتی فری لانسر فوٹو جرنلسٹ تھے اور معروف جرنلسٹ اقبال بھارتی کے فرزند تھے۔ مرحوم گذشتہ ایک سال سے کینسر سے متاثر تھے۔ انھیں طبیعت خراب ہونے پر لوک نائک اسپتال لے جایا گیا تھا جہاں ڈاکٹروں نے ابتدائی علاج کے بعد انھیں گھر لے جانے کا مشورہ دیا۔ گھر لانے کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ نماز جنازہ درگاہ فیض الٰہی میں ادا کی گئی اور دہلی گیٹ قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم نیک سیرت، ملنسار اور خوش مزاج انسان تھے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹی اور دو بیٹے بتائے جاتے ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 26 جولائی 2022

شمشاد انجم خان

نئی دھلی: معروف صحافی شمشاد انجم خان کا 31 جولائی کو انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کی خبر سے ان کے دوستوں اور اہل خانہ کو گہرا صدمہ پہنچا۔ اطلاع کے مطابق دل کا دورہ پڑنے پر ہولی فیملی ہسپتال لے جانے کے بعد ان کا انتقال ہوا۔ ان کی عمر 49 سال تھی۔ وہ ذاکر نگر میں رہتے تھے۔ ان کے متعلقین نے بتایا کہ ان میں دل کی بیماری کی ماضی کی کوئی تاریخ نہیں تھی۔ اس لیے ان کی اچانک موت نے سبھی کو صدمے سے دوچار کردیا ہے۔ جامعہ کے متعدد سابق طلبہ بھی ان کی موت کی خبر سن کر ہولی فیملی ہسپتال پہنچے۔ شمشاد خان بہار کے گیا ضلع کے کوٹھی کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے زی نیوز کے پروڈکشن کے شعبہ میں اعلیٰ عہدے پر کام کیا اور پھر دہلی میں سہارا نیوز چینل میں چلے گئے۔ انھوں نے جامعہ سے سوشیالوجی میں ماسٹرز کیا۔ وہ یونیورسٹی میں اپنی طالب علمی کی زندگی کے دوران بہت متحرک رہے اور جامعہ طلبہ یونین کے رکن بھی رہے۔ انھیں یکم اگست کو شام پانچ بجے بٹلہ ہاؤس قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کے پسماندگان میں بیوی، دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 اگست 2022

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا/ چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر .... بتاریخ .... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing 7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

تشریح البدن (جلد اوّل)

ادارہ

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 421

قیمت 200 روپے

تاریخ ابن خلدون (جلد سوم)

مصنف: عبدالرحمن ابن خلدون

مترجم: حکیم احمد حسین عثمانی الہ آبادی مرتب محمد صہیب

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 436، قیمت: 215 روپے

کلیاتِ جوش (جلد چہارم)

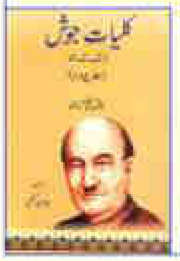

مرتب: جاوید نسیمی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 704

قیمت: 325 روپے

ہندوستان میں اردو کی دستوری اور قانونی حیثیت

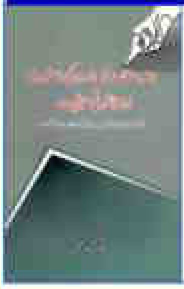

ترتیب: شیخ عقیل احمد

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 145

قیمت: 100 روپے

ولی دکنی

مصنف: عبدالحق

پہلی اشاعت: : 2022

صفحات: 148

قیمت: 90 روپے

تدریس جغرافیہ

مصنف: محمد ضیاء الدین علوی

تیسری طباعت: 2022

صفحات: 173

قیمت: 105 روپے

پھول بن

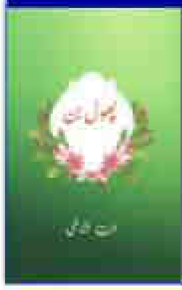

شاعر: ابن نشاطی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 190

قیمت: 115 روپے

نیاز فتح پوری کی تحریریں (ایک مختصر انتخاب)

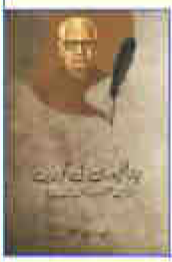

مرتب: ف س اعجاز

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 166

قیمت: 100 روپے

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, सितम्बर-२०२२,वर्ष:२४, अंक:६
URDU DUNIYA Monthly, September-2022, Vol.24, Issue:09
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/08/2022
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6